تلاشِ غالب

پروفیسر نثار احمد فاروقی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

اسد اللہ خان

تلاشِ غالب

تلاشِ غالب

یعنی مرزا غالب کے تیرہ غیر مطبوعہ خطوط
نو دریافت کلام اور فکر و فن پر
تحقیقی مضامین کا مجموعہ

LIBRARY
IDARE ADABIYAT-E-URDU

مرتبہ

پروفیسر نثار احمد فاروقی

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب، نئی دہلی

جملہ حقوق محفوظ

© نثار احمد فاروقی

طباعتِ اوّل	مئی ۱۹۶۹ء
طباعتِ ثانی	مئی ۱۹۹۹ء
قیمت	۲۰۰ روپے
طباعت	عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی
بہ اہتمام	شاہد ماہلی
کتابت	عبدالرشید صدیقی

غالب انسٹی ٹیوٹ

ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۲

فہرست

پیش لفظ	سید مظفر حسین برنی	۹
سرِ سخن	نثار احمد فاروقی	۱۳
دیباچہ طبع ثانی	نثار احمد فاروقی	۱۹
۱۔ نوادرِ غالب (۱)		۲۱
۲۔ نوادرِ غالب (۲)		۵۱
۳۔ نوادرِ غالب (۳)		۶۷
۴۔ نوادرِ غالب (۴)		۷۰
۵۔ دیوانِ غالب ۔ نسخۂ امروہہ		۹۴
۶۔ دیوانِ غالب ۔ نسخۂ امروہہ کے بارے میں		۱۵۶
۷۔ دیوانِ غالب بہ خطِ غالب ۔ روداد اشاعت		۱۶۵
۸۔ کچھ غالب کے بارے میں		۲۲۱
۹۔ کلامِ غالب کا ایک اہم شارح ۔ درگا پرشاد نادرؔ دہلوی		۲۲۹
۱۰۔ غالب اور ریاض الافکار		۲۶۴
۱۱۔ حادثۂ اسیری اور غالب		۲۶۸
۱۲۔ تلامذۂ غالب پر ایک نظر		۲۸۰
۱۳۔ اردوے معلیٰ : غالب نمبر		۳۰۱

۱۴- غالب صدی - ایک جائزہ ۳۲۶
۱۵- غالب تاریخ کے دوراہے پر ۳۴۰
۱۶- غالب کا نظریۂ وجود ۳۵۰
۱۷- افکارِ غالب کا ایک شارح - خلیفہ عبدالحکیم ۳۶۸
۱۸- مطالعۂ غالب کے نئے امکانات ۳۸۱

یہ کتاب

علم دوست، معارف پرور، ادب نواز

سیّد مظفّر حسین برنی دام اقبالہٗ

(سابق گورنر ریاست ہریانہ)

کے اسمِ گرامی سے منسوب و معنون کی جاتی ہے

از چشم زخمِ دہر گزندت مباد ازانکہ
در دلبری بغایتِ خوبی رسیدہ ای
پایم نمی رسد بزمین دیگر از نشاط
تا سوے من بلطف و عنایت تو دیدہ ای

(حافظِ شیراز)

نثار احمد فاروقی

پیش لفظ

مرزا غالب اردو زبان کا ہی نہیں، اگر ہندوستان کی سب علاقائی زبانوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان میں بھی یقیناً سب سے بڑا شاعر نظر آئے گا۔ اُس کی عظمت شاعرانہ احساس کی لطافت اور فلسفیانہ افکار کے اظہار کی ندرت میں ہے، اس پر مستزاد غالب کی رنگارنگ ہمہ جہت اور بوقلمونی شخصیت ہے۔ وہ کہتا ہے :

خوے آدم دارم آدم زادہ ام

واقعی وہ اپنی ساری خوبیوں، خامیوں، کمزوریوں اور شہ زوریوں کے ساتھ ایک مکمل اور نارمل انسان ہے، انسان کا جس طرح ملکوتی صفات حاصل کرنا دشوار ہے، اسی طرح مکمل اور نارمل انسان ہونا بھی مشکل ہے۔ بقول غالب ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

دل پذیر شخصیت کے علاوہ اس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ تاریخ کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ جہاں ایک تہذیب آخری ہچکیاں لے رہی ہے تو دوسری تہذیب کا آفتاب اُفق سے سر اُبھار رہا ہے۔ اس تاریخی پس منظر نے غالب کی عصری حسیت کو اور بھی سان پر چڑھا دیا تھا جس کے آثار اس کی نظم و نثر میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ اُس عہد کے شاعروں اور ادیبوں میں اکثریت اُن کی ہے

جن کی نگاہیں صرف ماضی کے کینوس پر جمی ہوئی ہیں، حال کا احساس ماتم خوانی کی حد تک ہے اور مستقبل کا کوئی واضح نقشہ اُن کی نظر میں نہیں۔ غالبؔ ایک ایسا فراین فن کار ہے جو ماضی کو تقویمِ پارینہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور حال کو خود بھگت رہا ہے، مگر اُس کی دور بین نگاہیں مستقبل کا نقشہ ابھرتا ہوا بھی دیکھ رہی ہیں۔

غالبؔ کی شخصیت اور شاعری پر بہت کام ہو چکا ہے۔ جس کی داغ بیل مولانا الطاف حسین حالیؔ نے ڈالی تھی، اس صدی میں خاص طور پر غالبؔ کی عصری معنویت نمایاں ہوئی ہے۔ انفرادی کاموں کے علاوہ برِصغیر میں چند ادارے بھی وجود میں آئے ہیں ان میں سب سے نمایاں اور بڑا ادارہ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ہے جس کی بنیاد گذاری سے محترمہ اندرا گاندھی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور فخرالدین علی احمد مرحوم کے اسمائے گرامی بھی جڑے ہوئے ہیں ۔۔ یہ ادارہ غالبیات کے مختلف موضوعات پر کئی اہم کتابیں شائع کر چکا ہے اور آیندہ کے لیے متعدد ایسے منصوبے اس کے سامنے ہیں جن کی تکمیل سے غالبؔ کی شخصیت اور فن کے مخفی ترین پہلو بھی اُجاگر ہو سکیں گے۔

غالبیات کے موضوع پر تحقیقی کام کرنے والوں کی صف میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، مولوی مہیش پرشاد اور مسعود حسن رضوی کے بعد جس نسل نے قابلِ قدر کام کیا ہے اس میں پروفیسر نثار احمد فاروقی کا نام ممتاز بھی ہے اور معتبر بھی۔ انھوں نے غالبؔ سے متعلق متعدد نئے ماخذ دریافت کیے ہیں۔ دیوانِ غالب کی اوّلین روایت (نسخۂ امروہہ) کے روشناس کرانے اور طبع کرانے میں بھی ان کا کام بہت قابلِ قدر رہا ہے۔ ڈاکٹر فاروقی کے تحقیقی مضامین کا یہ مجموعہ "تلاشِ غالب" پہلی بار ۱۹۶۹ء میں لاہور اور دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اب کچھ اہم مضامین کے اضافوں کے ساتھ اس کتاب کا نیا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے، جو غالب

انسٹی ٹیوٹ کے سلسلۂ مطبوعات میں ایک اہم اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔

مجھے امید ہے کہ غالبیات کے مطالعے سے دل چسپی رکھنے والوں میں اس کتاب کی قدر بھی ہوگی اور اس سے استفادہ بھی کیا جائے گا۔

نئی دہلی
۹ جنوری ۱۹۹۹ء

سید مظفر حسین برنی
چیرمین
اشاعتی سب کمیٹی

سرِ سخن

(دیباچہ طبع اوّل)

ہمارے نقّادوں اور محققوں کا غالبؔ پر کچھ نہ کچھ لکھنا ایسا ہی ضروری ہوگیا ہے جیسے مناسکِ حج میں میدانِ عرفات کا قیام، کہ اس کے بغیر حج ہی نہیں ہوتا۔ یہی اس کتاب کی شانِ نزول ہے۔

میں نے پچھلے پندرہ برس میں فیشن یا فرمایش کے زیرِ اثر، غالبؔ پر دو درجن مضامین لکھے ہوں گے۔ ان میں ریڈیو کی تقریریں تو خیر ''بادِ ہوائی'' باتیں تھیں، باقی مضامین میں تقریباً دس ایسے ضرور تھے جنھیں کتابی صورت میں پیش کر دینا غیر مناسب معلوم نہ ہوا۔ اس لیے کہ ان میں کچھ نہ کچھ ''نیا مسالا'' موجود تھا۔

چناں چہ اس مجموعے کا پہلا مضمون ''نوادرِ غالب'' ہے جس کے تین حصّے ہیں: پہلے حصّے میں غالبؔ کے گیارہ خطوط فارسی کے اور ایک رقعہ اردو کا ہے۔ یہ اور کسی کتاب میں نہیں ملتے۔ ان کا ماخذ ایک قلمی بیاض ہے، جو راقم الحروف کے ذخیرۂ ذاتی میں ہے۔ دوسرے حصّے میں غالبؔ کا ایک اور فارسی خط سرسیّد احمد خاں کے نام ہے، یہ بھی خطوطِ غالبؔ کے ہر مجموعے سے غیر حاضر ہے۔ اسے میں نے آگرے کے ایک کتب خانے سے برآمد کیا تھا۔ تیسرے حصّے میں غالبؔ کا کچھ غیر معروف کلام ایک قدیم مطبوعہ رسالے سے دریافت کر کے پیش کیا

ہے۔ یہ رسالہ "عیدی نامہ" اب میں نے رضا لائبریری (رام پور) میں محفوظ کرا دیا ہے۔

غالبؔ کے ہم عصر تذکرہ نگاروں میں وزیر علی عبرتی عظیم آبادی بھی ہے۔ یہ متعدد کتابوں کا مصنف ہے، جن میں "تذکرہ ریاض الافکار" بہت اہم ہے۔ اس میں فارسی نثر نگاروں کے حالات اور عبارت کے نمونے فراہم کیے گئے ہیں۔ یہ تذکرہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، اس میں غالبؔ سے متعلق جو کچھ ملتا ہے اس سے ایک ہم عصر بیان ہونے کے علاوہ دو فائدے اور حاصل ہوتے ہیں: یعنی غالبؔ کے ایک فارسی خط کی عبارت میں کلیاتِ نثر میں شمول کے وقت کیا ردّ و بدل ہوا ہے، اس کا علم ہو جاتا ہے؛ دوسری بات یہ معلوم ہو جاتی ہے کہ کلکتہ میں جن لوگوں سے ان کا ہنگامہ ہوا تھا ان میں مرزا امان علی خاں بھی شامل تھے۔

"کچھ غالب کے بارے میں" بعض متفرق معلومات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک ایسی غزل بھی ملے گی جو دیوانِ غالب مطبوعہ نول کشور کے حاشیے پر کسی نے نقل کر دی ہے اور اسے غالبؔ سے منسوب کیا ہے؛ اگرچہ مجھے اس کے قبول کرنے میں تامّل ہے، لیکن جب تک ان اشعار کا کوئی دوسرا دعویدار پیدا نہ ہو انھیں غالبؔ ہی کی ملکیت سمجھا جائے گا، خواہ قرائن کتنے ہی ضعیف کیوں نہ ہوں۔ اسی مضمون میں لکھنؤ کی دو مشہور طوائفوں زہرہ اور مشتری کے اعتراضات کے سلسلے میں نور محمد خاں عطارد کا ایک خط ملے گا، جو "اشرف الاخبار" دہلی میں چھپا تھا اور وہاں سے درگا پرشاد نادر نے تذکرہ "چمن انداز" میں نقل کیا ہے۔ مجھے اس عہد میں اس نام اور تخلّص کا کوئی شاعر کہیں نہیں ملا۔ خط کی عبارت غمازی کر رہی ہے کہ خود غالبؔ نے لکھوایا ہے، اور زہرہ و مشتری پر چوٹ کرنے کے لیے، مکتوب نگار کا فرضی تخلّص "عطارد" قرار دے لیا ہے۔ اگر اس نام کا وجود خارجی ثابت نہیں ہوتا تو اس خط کو بھی غالب ہی کی تحریر سمجھنا چاہیے۔

غالب نے جیل کی ہوا بھی کھائی تھی، مگر اس حادثے کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ انھیں جان بوجھ کر بھی نظر انداز کیا گیا، اس لیے کہ غالب ایک اخلاقی جرم میں ماخوذ ہوئے تھے۔ آج بھی جوئے کی علت میں گرفتار اور سزایاب ہونا کوئی فخر کی بات نہیں ہے، اُس دور میں تو ایسی شرم ناک تھی کہ سننے والے کانوں میں بل ڈالتے ہوں گے۔ مگر ہمیں اس حادثے کی تفصیلات بھی درکار رہیں تاکہ غالب کی سوانح عمری کا یہ گوشہ تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے تشنہ اور نامکمل نہ رہے، اور سب سے اہم بات یہ کہ اس حادثے کا ان کے ذہن پر جو اثر پڑا تھا وہ معلوم ہو جائے تو بہت سے اشعار کا پس منظر اور ذہنی فضا سمجھ میں آجاتی ہے، اور اس طرح اشعار کے معانی کی نئی تہیں بھی کھلتی ہیں۔ میں نے اس مضمون میں صرف ایک غزل کا زمانۂ تصنیف قطعیت کے ساتھ متعین کیا ہے کہ جیل سے رہا ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد لکھی گئی تھی۔ اب اس پس منظر میں آپ اسی غزل کو پھر پڑھیے، جسے بارہا پڑھا اور سُنا ہوگا، اور دیکھیے کہ اس خط کی روشنی میں وہ کتنی بلیغ اور تہ دار نظر آتی ہے۔ یہاں کلامِ غالب کی تاریخی ترتیب کو سامنے رکھ کر اور بھی ایسے اشعار پیش کر دیے گئے ہیں جو حادثۂ اسیری کے بعد لکھے گئے تھے، اس طرح ان غزلوں کی ذہنی فضا کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

اس مجموعے میں دو کتابوں پر تبصرے بھی شامل ہیں: تلامذۂ غالب کا تبصرہ آج سے دس سال قبل لکھا گیا تھا۔ بعض امور میں جزوی طور پر میری رائے تبدیل ہو گئی ہے اور اس عرصے میں کچھ نیا مواد بھی سامنے آیا ہے۔ لیکن میں نے اس تبصرے کو علیٰ حالہ رہنے دیا، نظرِ ثانی کرنے میں طوالت کا اندیشہ تھا۔

دوسرا تبصرہ اردوے معلیٰ (دہلی) کے "غالب نمبر" پر ہے۔ اس میں اتنی خوردہ گیری کو قصداً جائز رکھا گیا ہے۔ اس میں میرا مقصد صرف یہ ہے کہ علم و تحقیق کو سیاسی ریشہ دوانیوں اور غیر علمی ہتھکنڈوں سے بچایا جائے، اور جو لوگ اپنے منصب یا جوڑ توڑ کی بنیاد پر علم و تحقیق کے میدان میں بھی جھنڈے گاڑنا چاہتے ہیں ان

کی آزمایش اور باز پُرس وقتاً فوقتاً ہوتی رہے۔

درگا پرشاد نادر دہلوی کو تذکرہ "خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" اور "چمن انداز" کے مولف کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ لیکن شاید ہی کسی کو یہ علم ہو کہ اس نے کلامِ غالب کی ایک جزوی شرح بھی لکھی تھی اور اس لحاظ سے وہ غالب کا ہم عصر شارح ہے۔ یہاں وہ اشعار مع شرح پیش کیے جا رہے ہیں جو ہمیں اس کی ایک تصنیف کے ناقص نسخے میں ملے ہیں ان سے یہ اندازہ ہو گا کہ غالب کے معاصرین اس کے کلام کو کس نظر سے دیکھتے تھے اور اس کی شرح و تفسیر کرتے ہوئے کتنی گہرائی میں اتر سکتے تھے۔

اس مجموعے کا سب سے زیادہ قیمتی بلکہ کہنا چاہیے حاصلِ کتاب مضمون "دیوانِ غالب: نسخۂ امروہہ" کا تعارف ہے۔ یہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے سب سے پہلے آنا چاہیے تھا مگر ترتیب میں آخری یوں ہو گیا ہے کہ دیوانِ غالب کا یہ نسخہ اپریل کے دوسرے ہفتے میں دریافت ہوا ہے اور ٹھیک ۱۵ دن کے اندر اندر میں نے یہ مضمون لکھ کر کتاب کی طباعت کے دوران اس مجموعے میں شامل کیا ہے۔ دیوانِ غالب کا نسخۂ امروہہ تمام تر غالب کے قلم سے لکھا ہوا ہے اور صفر ۱۲۳۵ھ سے پہلے مرتب ہوا ہے؛ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ مضمون پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ یہ نسخۂ حمیدیہ کا بنیادی مسوّدہ ہے اس میں متعدد غزلیں غیر مطبوعہ ہیں جو اس مضمون میں شامل کی جا رہی ہیں۔ یہ وہ کلام ہے جو نسخۂ بھوپال کی ترتیب کے وقت (۱۲۳۷ھ) غالب نے قلم زد کر دیا تھا۔ اس نسخے کی یہ اہمیت بھی ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کے بہت سے اشعار جو سہوِ کاتب کے باعث مہمل معلوم ہوتے تھے اور ان کی تصحیح و تصدیق کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہ تھا، اب ان کا متن درست ہو جائے گا اور مہمل گوئی کا الزام کم سے کم ان اشعار کی حد تک غالب کے سر سے اتر جائے گا۔

میرے لیے سب سے زیادہ خوشی اور فخر کا مقام یہ ہے کہ دیوانِ غالب

کا یہ نسخہ ۵ اپریل ۱۹۶۹ء کو دریافت ہوا ہے، جب کہ زیرِ نظر کتاب تقریباً کل چھپ چکی تھی، میں نے اس نسخے کا تعارف اتنی قلیل مدت میں سب سے پہلے اسی کتاب کے ذریعے پیش کیا ہے، غالب کے جو متفرق غیر مطبوعہ اشعار نسخۂ امروہہ میں ہیں ان کا تو احاطہ نہیں کیا جا سکا ہے، لیکن اس کی وہ غزلیں جو نسخۂ حمیدیہ سے خارج کردی گئی تھیں، یہاں پیش کی جا رہی ہیں۔ آیندہ غالبیات کے سرمائے میں اور کلامِ غالب کے تاریخی مطالعے میں یہ نسخہ اس سے زیادہ اہمیت حاصل کرے گا جو نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کو حاصل ہے اور اس کی اشاعت کے بعد غالب کے بالکل ابتدائی کلام کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔

خدا کرے غالب شناسوں میں یہ کتاب مقبول ہو اور میری محنت سوارتھ ہو جائے۔

نثار احمد فاروقی

مئی ۱۹۶۹ء
دہلی کالج، اجمیری گیٹ، دہلی ۶

دیباچہ اشاعتِ ثانی

تلاشِ غالب کا پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۶۹ء میں لاہور اور دہلی دونوں جگہ سے شائع ہوا تھا۔ لاہور اڈیشن کی پروف ریڈنگ قطعاً نہیں ہوئی اس لیے اُس میں بہت غلطیاں رہ گئی تھیں جنھیں دیکھ کر شرم آتی ہے۔ ہندوستانی ایڈیشن بڑی حد تک طباعت وکتابت کی غلطیوں سے پاک تھا اسے علمی مجلس دہلی نے شائع کیا تھا۔ اب وہ ایڈیشن مدّت سے ناپید تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ تلاشِ غالب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا جب غالبؔ کی وفات کو پوری ایک صدی ہو چکی تھی، اور اُس کی یہ دوسری اشاعت ۱۹۹۹ء میں ہو رہی ہے جب مرزا غالبؔ کی ولادت کا دو سالہ جشن منایا جا چکا ہے۔

اس اشاعتِ ثانی میں کئی مضامین نئے شامل کیے گئے ہیں۔ پہلے ایڈیشن میں دس مضامین شامل تھے اب ان کی تعداد ۱۸ (اٹھارہ) ہے۔ غالبیات کے موضوع پر میرے کچھ مضامین اور تھے جو متفرق رسالوں میں شائع ہوئے یا مذاکروں کے لیے لکھے گئے مگر وہ اس میں شامل نہ ہو سکے اس لیے کہ اُن کی نقل میرے پاس محفوظ نہ تھی۔

اگر اس کتاب کی اشاعتِ ثالث کی نوبت آئی تو اُس وقت انھیں بھی تلاش کر کے شامل کیا جا سکے گا۔

اس کتاب کی اشاعتِ ثانی کے لیے میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کا عموماً اور

انسٹی ٹیوٹ کے ٹرسٹی اور شعبۂ نشر و اشاعت کے چیرمین عالی جناب سید مظفر حسین برنی دام اقبالہ کا خصوصاً تہِ دل سے ممنون ہوں۔ برنی صاحب ایک ایسے علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں معارف پروری اور علم دوستی کی طویل اور مضبوط روایت رہی ہے۔ وہ خود بھی ایک اچھے ادیب، مصنف اور تنقید و تحقیق کا اعلیٰ مذاق رکھنے والے عالم ہیں میرے لیے یہ فخر اور سعادت کا مقام ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی قدر افزائی فرمائی، اس کے لیے پیش لفظ تحریر فرمایا اور اسے اشاعتی سب کمیٹی نے طباعت کے لیے منظوری دی۔

جناب شاہد ماہلی اردو کے معروف شاعر، ادیب، صحافی اور نقاد ہیں، یہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے لیے نیک فال ہے کہ وہ حال ہی میں اس ادارے کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے ہیں۔ انھیں تصنیف و تالیف کے ساتھ ہی نشر و اشاعت کا بھی وسیع تجربہ ہے۔ اس کتاب میں اگر طباعت کی کوئی خوبی ہے تو یہ تمام تر شاہد ماہلی صاحب کی خصوصی توجہ کا نتیجہ ہے میں ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

۹ جنوری ۱۹۹۹ء — نثار احمد فاروقی

پوسٹ بکس نمبر ۹۷۲۳
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اعزازی کتاب
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
M/o Human Resource Development
Department of Education,
Govt. of India.
West Block-8, R.K. Puram, New Delhi-110066

نوادرِ غالب (۱)

(۱۲ غیر مطبوعہ خطوط)

(الف) مقدمہ

یہ میرزا غالب کی خوش نصیبی نہیں تو کیا ہے کہ اُن پر اتنا تحقیقی کام ہو چکا ہے لیکن ابھی تک کوئی نہ کوئی پہلو گفتگو کے لیے مل ہی جاتا ہے —— میں آج میرزا غالب کے ایک درجن غیر مطبوعہ خطوط "نقوش"[1] کے توسط سے غالب پسندوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ ان میں ایک خط اردو کا ہے (بنام تفتہ) اور گیارہ خطوط فارسی میں لکھے گئے ہیں، جن میں سے آٹھ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی (متوفی ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ) کے نام ہیں، باقی تین خطوط کے مکتوب الیہم منشی نبی بخش حقیر[2] (متوفی ۱۸۶۰ء)، میرزا ہرگوپال تفتہ (متوفی ۱۸۷۹ء) اور مولوی فضل اللہ ہیں۔ یہ خطوط ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوئے ہیں نہ آج سے پہلے کسی کے علم میں آئے ہیں۔ ان کا ماخذ ایک قلمی بیاض ہے جس کا عنوان، جامع

---

۱ نقوش (لاہور) سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء)

۲ منشی نبی بخش حقیر کے نام ایک فارسی خط اور بھی ہے جسے اپنے مضمون "حادثۂ اسیری اور غالب" (نقوش، شمارہ ۹۴، اگست ۱۹۶۲ء) میں پیش کر چکا ہوں۔ یہ اگرچہ پنج آہنگ (کلیات نثر غالب ۱۰۳) میں شامل ہے مگر مجھے جو روایت دستیاب ہوئی ہے اُس میں بعض اہم اختلافات ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے غالب کی ایک غزل (ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا) کی شانِ نزول اور تاریخِ تصنیف معلوم ہو جاتی ہے۔

کا نام، سالِ تالیف یا سنہ کتابت کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ یہ اگرچہ صاف نستعلیق خط میں لکھی ہوئی ہے لیکن اس میں املا کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ اس کے خط کی روش اور ظاہری حلیے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھی گئی ہے۔ گو اِس بات کی کوئی داخلی یا خارجی شہادت موجود نہیں ہے۔ اِسے بیاض کہنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ یہ دراصل کسی خوش ذوق نے ۴۹ فارسی انشا پردازوں کے خطوط و رقعات کا انتخاب کیا ہے۔ اس میں جن لوگوں کے مکتوبات شامل ہیں اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

مرزا معز موسوی فطرت، ملا ظہوری، عرفی، قاسم کاہی، محمد قلی سلیم، مرزا صائب، مرزا جلال اسیر، طالب کلیم، مرزا داراب بیگ جویا، طالب آملی، فیضی، حکیم ثنائی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، عبدالقادر بیدل، میرزا اسداللہ خاں غالب، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولوی فضل حق خیرآبادی اور نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ۔

یہ نسخہ ½۷ × ½۱۱ سائز کے ۱۷ سطری مسطر پر لکھا ہوا ہے، ہر سطر میں تقریباً ۱۷-۱۸ الفاظ ہیں، متن کی روشنائی سیاہ اور عنوانات کی شنگرفی ہے۔

اس مجموعے میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، مولانا فضل حق خیرآبادی[1]، نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے خطوط بھی بعض اعتبار سے بہت اہم ہیں، اور اُن میں سے اکثر غیر مطبوعہ ہیں، وہ پھر کبھی نذر کروں گا۔ ان شاء اللہ۔

میں نے غالب کے خطوط نقل کرتے میں اصل املا کی پابندی نہیں کی ہے، یعنی وہی کہ یائے معروف و مجہول کا فرق نہیں ہے، یا الفاظ کو ملا کر لکھا گیا ہے، یا مرکز اور نقطوں کے معاملے میں کفایت شعاری سے کام لیا گیا ہے وغیرہ، کیوں کہ اگر یہ خطوط غالب کے قلم سے لکھے ہوئے ہوتے تو البتہ اصل کے املا کی نشان دہی ضروری ہو جاتی۔ یہ مجموعہ اگرچہ نستعلیق میں صاف اور روشن لکھا ہوا ہے تاہم خطوط فارسی کے بعض الفاظ نہیں پڑھے جا سکے یا اُن میں التباس پیدا ہوا، میں نے اکثر جگہ قیاسی تصحیح کر دی ہے اور جہاں التباس کا

---

[1] مولانا فضل حق خیرآبادی کا ایک ہی خط ہے "عرضی در بارۂ امتناعِ ٹیکس وغیرہ" میں اسے سہ ماہی نوائے ادب (بمبئی) جلد ۱۳ شمارہ ۳ جولائی ۱۹۶۲ء میں چھپوا چکا ہوں۔

اندیشہ تھا وہاں اصل کا املا حاشیے پر نقل کر دیا ہے۔

اس مضمون کی ترتیب یوں رکھی گئی ہے: (الف) مقدمہ (ب) متن (ج) لفظیات (د) اردو ترجمہ (ہ) توضیحات (و) مراجع۔

ترجمہ کرنے میں اپنی سی احتیاط سے کام لیا گیا ہے وہ نہ ٹھیٹھ لفظی ہے نہ ترا مرادی۔ بعض جملے قطعاً پلّے نہیں پڑے وہاں اٹکل سے بھی کام چلایا ہے۔ ترجمے سے مقصد صرف یہ ہے کہ ان خطوط کی افادیت کا دائرہ وسیع کیا جائے۔

ترتیب میں نے وہی رکھی ہے جو بیاض منقول عنہ میں ہے صرف اتنا کیا ہے کہ اُردو کا خط جو سب سے آخر میں تھا اُسے میں نے یہاں شروع ہی میں درج کر دیا ہے اور جس خط پر تاریخِ کتابت درج نہیں ہے اُس کا زمانہ متعین کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

توضیحات کے سلسلے میں محبِّ مکرم ڈاکٹر مختارالدین احمد (علی گڑھ) سے بعض مفید مشورے ملے تھے اُن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

(ب) متن

(۱) بنام ہرگوپال تفتہ:

میرے شفیق لالہ ہرگوپال تفتہ میرا قصور معاف کریں اور مجھ کو اپنا نیازمند تصور فرماویں۔ آپ کا پارسل اور آپ کا خطِ سابق و عنایت نامۂ حال پہنچا۔ جواب نہ لکھنے کی دو وجہ، ایک تو یہ کہ میں بیمار، چار مہینے سے تپ لرزہ میں گرفتار، دم لینے کی طاقت نہیں، خط لکھنا کیسا۔ بارے اب فرصت ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ کول تو معلوم مگر مکان آپ کا نہیں معلوم، خط لکھوں تو کس پتے سے لکھوں؟ ہاں آپ نے سرنامہ پر چاہِ گرمابہ لکھا، میں یہ نہیں لکھ سکتا، یہ حمام کے کنویں کی مٹی خراب کر کر اُس کو چاہِ گرمابہ لکھا ہے۔ اسماء و اعلام کا ترجمہ فارسی میں کرنا، یہ خلافِ دستورِ تحریر ہے۔ بھلا اس شہر میں ایک محلہ بلّی ماروں کا[1] ہے، اب ہم اوس کو "گربہ کُشان" کیوں کر لکھیں۔ یا املی[2] کے محلے کو "محلہ تمرِ ہندی" کس طرح لکھیں۔ بہر حال ناچار تمہاری خاطر احمق بننا قبول کیا اور وہی لفظ مہمل لکھ کر خط بھیج دیا ہے۔

---

[1] اصل: کوئی کی۔ [2] اصل: انبلے کے۔

جواب یہ ہے کہ بھائی میرا دل اب شعر و سخن و امارت و ریاست و دین و دنیا و مرگ و زیست وکفر و اسلام سے سرد ہو گیا ہے۔ مگر تمھاری خاطر ـــ خوب یاد رہے کہ جتنی دیر میں تم ایک نئی غزل لکھ سکتے ہو، مجھ سے اُتنے عرصے میں آپ کی ایک غزل کو اصلاح نہیں دی جاتی۔ جلدی نہ کرو اور میرے طور پر رہنے دو۔ ان شاءاللہ تعالیٰ اِس قدر جو کہ از قسم غزلیات ہیں وہ سب دیکھ کر بھیج دوں گا۔ نصف دیوانِ سابق دیکھ چکا ہوں، نصف باقی ہے۔ مگر اب خدا کے واسطے جب تک یہ آپ کا کلام نہ پہنچے اور کلام نہ بھیجیے کہ میں گھبرایا جاتا ہوں۔

(اسد اللہ خاں) [جون ۱۸۵۴ء]

(۲) بنام شیفتہ :

جناب عالی!

در تموزِ دی روز کہ خون در رگ سوخت، و مغز در استخوان گداخت، بلائے استسقاء آن چناں عام بود کہ سمندر تا خود را از آتش در آب نینداختہ باشد آرام نیافتہ[۱] باشد۔ ہرگاہ کہ خوی من است جرعہ جرعہ آب آشامیدے، شما را ہر دم یاد آوردمے۔ اگر دل از تشنگی یک رہ سوخت، از بہرِ شما صد رہ سوخت۔

کسے در عاشقی ہم پیشہ را چون من نمی خواہد
خورم گر آبِ شیرینے بہ یادم کوہکن آید

بارے بگویند کہ روز چون سپری گشت و شب چگونہ گذشت۔ خان صاحب چہ تجویز کردہ اند، و دی روز و امروز کدام دوا آشامیدہ اند۔ دیگر آن اگر امروز زندہ مانم، فردا بامداد کہاران فرستند تا مرا ببرند۔ والسلام۔ از اسد اللہ۔

(۳) بنام مصطفیٰ خاں شیفتہ :

خداوندِ نعمت را گرد سرگردم، و سپاس رُوان پروری بجا می آرم۔ عطیہ آوردِ بعدِ پُرسش[۲] دیگر ارزانی داشت، ہمانا از صحت[۳] و بہجتِ مزاجِ ہمایون بشارت دادہ باشد کہ در اشارت

---

[۱] اصل : یافتہ۔ [۲] اصل : پرستش۔ [۳] اصل : صحبت۔

چنین گفتہ آمد۔ فردا کہ آدینہ روز است بہارگاہِ سپہراشتباہ[1] سلطان می روم۔ امید کہ چوں برگردم بہ آستان بوسِ مخدوم رسیدہ[2] باشم، بحضرتِ سید سلام می رسانم۔ والسّلام از اسد اللہ۔

(۴) بنام مصطفیٰ خاں شیفتہ :

قبلۂ من ! چوں مخدوم صوم و نوم باہم آمیختہ، لاجرم من کہ بایکے ازین ہر دو مقاومت نتوانم کرد، باہر دو چون طرف گردم، ہمانا در معذرتِ کاہل قدمی سخن می رود تا فرا رسند کہ اگر بملازمت نہ رسیدہ ام، چرا نرسیدم و چہ اندیشیدم۔ ہان بندہ پرور۔ امروز پنجمین روز است، کتاب مسودہ باز دہند و برمن سپاس نہند، کاش این نیز بدانم کہ چوں بنظر مولانا گذشت، کدام[3] عبارتِ دلاویز منظورِ نظرِ عطوفت گشت۔ اُمید کہ از حالِ مزاجِ مبارک، کیفیتِ روزہ، خاصہ درین تموزِ رُوان سوز، آگہی بخشند۔ حقّ حفظِ صحت ادا و روزہ قضا کردہ باشند۔ فقط از اسد اللہ (غالباً اگست ۱۸۵۰)

(۵) بنام نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ :

بندگی می فرستم، دوامِ دولت و اقبالِ خواجہ از یزدان می خواہم، مگر بشنیدہ باشم کہ روداد جہان ستانیِ امیر تمر تا جور بہ نگارش کران[4] پذیرفتہ است، بدرگاہ می بَرم و خود رنج می کشم، خواجہ برمن خردہ گرفت کہ فلانے ماہ بہ تفریح[5] سبزہ و آبِ روان می رود (کذا)۔ ہَیہات چوں منے ! سرِ سیر و تماشا کجا۔ یارب کہ رفتم ؟ آخر آن شد کہ چوں احترام الدولہ بہادر بشہر تشریف وُرُود بخشید، پیشِ وے رفتم و آن نگارش (کہ) کما بیش چہار جزو کاغذ بودہ بوے سپردم۔ پنہان مباد کہ من از اندوہ ستوہم و از زیستن بیزار۔ این کار را بدم مردی و دل افسردگی می کنم، عنانِ توسنِ خامہ پنداری بدستِ من نیست، خود بہر شیوہ کہ خواہد گام می زند و رہ می رود[6] و حالِ مزاج مبارک آنچہ گمان داشتم بہ یقین انجامید، یزداں توفیق پرہیز و بذریعۂ پرہیز تندرستی عطا فرماید۔ قرۃ العین محمد علی خاں دعا خوانند۔ والسّلام (غالباً آخر اگست ۱۸۵۰ء)۔

---

[1] اصل : سپہرشہنشاہ۔ [2] اصل : باشد۔ [3] اصل : بکدام۔ [4] اصل : گراں۔
[5] اصل : تبصرح۔ [6] اصل : روند

(٦) بنام محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ :

امّیدگاہِ اہلِ معنی سلامت۔ ریختہ از نتائجِ تازگیِ[1] فکر است و غزلہای پارسی (کہ) بنائے آن ہم پیش ریختہ شدہ بود امشب بپایان رسید۔ خدارا درین ہر دو غزل آن باید نگریست[2] کہ باکہ حرف می زند و چہ می گوید۔ حالیا حلیۂ این ابیات را خواستارم و سپاس راپز رفتار، و آفرین جوی نیستم۔ ہمان نویدِ خرسندی و تندرستی و شادکامی می خواہم و بس۔

(۷) بنام محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ :

روزِ چہارشنبہ یعنی دی روز عرضہ داشتہ ام کہ روزِ آدینہ بارم می دہند و بعطائے خلعت و خطاب و توقیعِ نوکری، برمن سپاس می نہند۔ احترام الدّولہ بہادر، بمقتضائے فحوائے این فرد :

فرداست وعدہ جنّت (و) امروز شد نصیب
آرے خلافِ وعدہ کریمان چنین کنند

ہم امروز کہ روزِ سعدِ اکبر است مرا بہ بزمِ خسروی خواندہ و کامیابِ خطاب (و) خلعت و فرمانم گردانند۔ دی شحنۂ شہر، "بدمعاش" و "میر بساطم" نوشت، و از من ہیچ نکاست۔ امروز بادشاہِ دہلی نجم الدّولہ و دبیر الملک خواند، و برمن ہیچ نیفزود[3]۔ کار بافرداست، تا دران روزم چہ نویسند و بکدام نامم خوانند؛ چہ ارزم بود۔ یارب بیایند زود بیایند تا فرمان شاہ (و) نگارش ہائے این روسیاہ نگرند[4] و السّلام اُلوف الاحترام نگاشتہ یوم الخمیس ۲۳ شعبان و چہارم جولائی ۱۸۵۰ء۔

نہان مماناد۔ کہ تاریخ نوکری من در سرکارِ شاہ بعہدۂ "تاریخ نویسیِ اسلافِ این خاندان" بمشاہرۂ پنجاہ روپیہ، یکم ہمین ماہ است، یعنی وصولِ زرتن خواہ در سالے دوبار[5] است۔ فقط

---

۱ اصل: نازکی۔ ۲ اصل: نگذشت۔ ۳ اصل: بفزود۔ ۴ اصل: بگیرند۔
۵ اصل: کہ۔

LIBRARY
IDARE-ADBIYAT-E-URDU

ACC. No. ۳۳۵۷۵
Date ۲۰۰۰ / ۸ / ۳ / ۱۱

(۸) بنام مصطفیٰ خاں شیفتہ :

للہِ الحمد و المنّۃ کہ خواجہ بسر منزلِ نعمت[1] باز رسیدہ، و نورِ دیدہ خویشتن را دید، امید کہ چون تموز بپایان رسیدہ، و ہوا خنک گردیدہ است، اعتدالے در مزاج پدید آمدہ باشد، و ہر قدر بکاہد نشاط افزاید۔ دو سہ روز است کہ نگارشِ روداد امیر تیمور گورگان کران پذیرفت حالیا خود را بو عدۂ دو ہفتہ آرامش سرد بخشیدہ ام پس ازان کہ دم گرفتہ خواہد شد بسر گزارشِ حالِ بابر بادشاہ رفتہ خواہد شد۔ باللہ فکرِ این نثر از فکرِ نظم لختے جانگداز تر است۔ روز عید قدمبوسیِ مولانا دست بہم داد نوازش فرمودند و نثر را ستودند ـــــ شاہ گردون بارگاہ بہ مزارِ فائض الانوار قطب الاقطاب روے آوردہ، و احترام الدولہ نزد[2] بادشاہ است۔ اگر اتفاق اُفتاد من نیز می روم، و دو سہ روز درین جا روے شفقتے و رنگ ہوا می نگرم۔ چکنم تا آنچہ نبشتہ ام بشما برسد، و دیگر ہر چہ می نوشتہ باشم ورق ورق بنظرِ انور می گذشتہ باشد۔ ورقے چند کہ نواب فخر الدّین خاں نبشتند (کہ) نزد ایشان ہستند تا آنچہ فراہم می آید می نوشتند و آن اوراق صورتِ کتاب یافت۔

(غالباً ستمبر ۱۸۵۰ء)

(۹) بنام مصطفیٰ خاں شیفتہ :

یارب این نامہ کہ از والیِ لااُبالی و مولاے فارغ از موالی بمن رسید از نگرانی چہ کاست و در آگہی چہ افزود ہگر دانستم کہ برام پور کے رفتند و چہ روز انجمن آرا بودند، و کے باز آمدند، و بدہلی کے خواہند آمد، این ہا ہمہ برکنار، آہ از من کہ ندانستہ باشم کہ چہ حال دارند، و مرض (کہ) پیش ازین داشتند، و حالیا نصیبِ اعدای دولت باد، چہ صورت دارد۔ این رنج کہ مرا نیز روزگارے دراز در آزار داشتہ، لختی گران[3] بہاست، فضل و کرم است، و خواجہ عشرت دوست یزدان نگہبان باد، و جان (و) تن توانا، عیش و عشرت مہیّا، با آن کہ سخن ازان شرحاً نگذشت[4] (کذا)، و ثنا بدعا منتہی گشت؛ ہنوز جنبش نفس دست برلب می زند، و مراہم بدان ہنجار بہ نوا می آورد؛ ہان اے داور، چون گویم، کہ بیدادگر ہمین است

---

[1] اصل : نعمت و ناز۔ [2] اصل : نیز۔ [3] اصل : گرا ینہا۔ [4] اصل : سرخانہ گذشت۔

کہ نگوییم — دادگر، این چہ اداست کہ با حصال عبارت نامہ (کذا) جُزیک دو بذلہ، بتوجہ مشابہ، (کذا) احباب، بزبانِ قلم سخن ہا می رود، گوئی ما و شما مُوجد این شیوہ و مخترعِ این ادائیم۔ من بدان درخورم کہ مرا بیک لطیفہ و چند لفظ از سروا کنند۔ ندانستند کہ جگر تشنۂ دیدارم، نپنداشتند کہ جویاے اخبارم[۱] نیدیشیدند[۲] کہ (خیر) خواہِ جان و تنِ شماستم۔ نسنجیدند کہ تا غالب سرگذشتِ سفرِ رامپور نخواہد شنود، نتواند آسُود۔ نفہمیدند کہ وعدۂ دیدارے می خواہد، نخواستند کہ از حالِ غلام علی خاں سر سخن رانند۔ باللہ شگفتی فرو ماندم و نشگفت (کذا) کہ استعجاب مرا عجبی ندارند۔ بارے بندگی و بیچارگی۔ از ہمہ قطع نظر کردم۔ ہائے شاعرِ ریختہ گوے کہ ندانم کیست چہ خوش می گوید:

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

صلح می کنم بدین کہ از حالِ مزاجِ مقدس اوّلاً و از ورودِ دہلی ثانیاً آگہی بخشند۔ زیادہ بندگی۔ بیچارگی۔ نبشتہ صبح چہارشنبہ ۸ مئی ۱۸۵۰ء

(۱۰) بنام منشی نبی بخش اکبر آبادی:

شفیقِ مکرم و مطاعِ معظّم، از درویشِ گوشہ نشین، اسد اللہ حزین، پس ازان کہ سلام خوانند، ورودِ رافت نامہ را کہ فرستادہ، خاطر نشانِ خویش گردانند۔ فردا دلِ ستم زدہ را با خیال آویزشے بود، و نارسیدنِ نامہ ازان سوی لختے مشوّش داشت۔ امروز ہمین دم کہ نیم روز است، بریدِ ڈاک آمد و نامہ آورد۔ خواندن ہمان بود و بپاسخ نگاری نشستن ہماں۔ چوں کارپردازانِ ڈاک دکان پگاہ می کشایند، و پس از گزشتنِ نیمہ روز نمی ستانند، ہر آئینہ این ورق کہ امروز نگاشتہ ام فردا چاشت بہ ڈاک خواہم فرستاد۔ بارے آن کہ حالِ من پرسیدہ اند، و غزل از من طلب کردہ اند، باور دارند کہ دل بجاے بود، زبان زمزمہ سرائے بود، اکنوں کہ دل، آں چناں افسرد کہ گوئی مُردچہ بجوش آید، تا لب در خروش نمی نگرند کہ ہم ازین حکّام کہ مرا بر سر و چشم می نشانند چہ رفت و معاشِ من صورت معادِ کفار گرفت۔

---

[۱] اصل: اختیارم۔ [۲] اصل: نیستد سدمد۔

بسخن چہ گرویم و تا چند بادہ پیمائیم، دو سہ روز است کہ بے رونقیِ کار خود را در نظر می سنجیدم، بیتے کہ تخلص نیز داشت، بے خواست بر زبان گزشت، تازہ اگر ہست ہمین است وبس:

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

از آلامِ جسمانی اگرچہ فراوان است، تالم (و) اندوہِ روحانی ست کہ دل وجگر را بہم می زند۔ اُفوّضُ اُمری اِلی اللّٰہ اِنّ اللّٰہ بصیرٌ بالعِباد۔ جلیل القدر تفتہ سلمہ اللّٰہ تعالیٰ ندانم کجا ست، غزلیاتِ آن شمعِ بزمِ سخن وری بشما می فرستم، می تواں رسانید و می تواں گفت کہ رباعیات بعد ازیں خواہد رسید۔ عبدالقاہر اسد اللّٰہ نگاشتہ شدہ ۱۶ ستمبر ۱۸۴۸ء

(۱۱) بنام لالہ ہرگوپال تفتہ:

مہربانا رافت نشانا۔ فہرست متاعِ کارخانۂ خیالی، یعنی کلّیات آں عدیم المثال رسید، واز رسیدنش رُوان آسائی آمد، از دیر باز بسوے شما نگران بودم، وچوں مسکن ومقامِ شما در نظر نداشتم، نامہ نتوانستم فرستاد۔ شما را چہ بران داشت کہ نامہ نفرستادید واز حالِ خودم آگہی ندادید۔ بارے ازیں التفات نامہ بداں وارسیدم کہ شما را عافیت حاصل ومرا در دلِ شما جاے ہست۔ کلّیات را می نگرم و بر خود لازم گرفتہ ام کہ سراسر نگرم، و در حکّ و اصلاح خود را معاف ندارم، امّا ایں کار زود بسرانجام نہ پزیرد، لاجرم اگر درنگ روے دہد ملول نشوند۔ حالیا دو جلد دیوانِ فارسی بہ سبیل پارسل بعد اداے تمغاے ڈاک می فرستم، ونامہ بنام نامی مشفقی منشی نبی بخش سر رشتہ دار عدالت فوجداری کول ہم ہست۔ نشگفت کہ شما را با منشی صاحب آشنائی باشد، واگر ہم نباشد، بدین تقریب آشنا می تواں شد، می تواں رفت، ونامہ کہ باسم سامی ایشان است با یک جلد دیوان می تواں بُرد، و نامہ وکتاب رساند۔ می توانستم بدین بزرگوار کتاب جداگانہ فرستادن، امّا خوشتر آن دیدم کہ بشما فرستم، عمرے است کہ آوازۂ نجستگی خوی و فرخی نہادِ مکرمی منشی ظہور علی صاحب دام بقاؤہٗ می شنوم، واز ارادت مندانِ آن صاحب دل دیدہ ورم، چشم دارم کہ برمن سپاس نہند واز من سلام نیاز

وشوق بدان حضرت عرضہ دہند ـــــ دیگر، آں سپہر سخن راماہِ دوہفتہ، یعنی لالہ ہرگوپال تفتہ، از شما آں خواہم اگر زود زود نبود، گاہ گاہ بفرستادنِ نامہ شادم دارید، من خود وعدہ می کنم کہ بعد یک ماہ اجزائے دیوان شمارا، بطریق پارسل بشما خواہم فرستاد، ازان پس رسم وراہِ نامہ نگاری میانہ ہم برہم نخواہد خورد۔ از اسداللہ نامہ سیاہ نگاشتہ بست (و) ہشتم جمادی الاوّل ۱۲۶۳ھ مطابق دوازدہم مئی ۱۸۴۷ء۔

(۱۲) بنام مولوی فضل اللہ:

حضرتِ سلامت۔ این داوری کہ در پیش است، چوں سرو بن بود نش بجائے خویش است، ایں مایہ درنگ برنمی تابد۔ لختے میر قاسم علی صاحب را دیر ساختہ آید، ونبذے خود ازراہِ التفات پرداختہ آید، من وایمانِ من، کہ برمن اندوہ ایں درنگ گران است، ودل خود پیش ازاں کہ ایں بار بروے نہد، ناتوانست۔ والسّلام خیر ختام اسداللہ۔

مضمون لفافۂ ایں رقعہ:

چوں نامہ بَر جادہ شناس منزلِ مقصود نیست، امید کہ یکے از خواجہ تاشانِ غالب یعنی عزیزے از ملازمانِ حضرت مولوی صاحب قبلہ جناب مولوی محمد صدرالدّین خان بہادر، ایں نامہ را بہ مخدومی مکرّمی، مظہرِ اسمِ خویشتن، لیکن نہ از بہرِ من، جناب مولوی فضل اللہ صاحب، زادَ لُطفُہٗ، می رساند ومنّت برفرستندہ نہد۔

(ج) لفظیات

(خط نمبر ۲) سپری گشتن : ختم ہونا، گزرنا۔

سمندر : ایک فرضی کیڑا، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آگ میں رہتا ہے اور وہی اُس کی غذا ہے یہ سم (آگ) اور اندروں کا مرکب ہے، مخفف ہو کر سمندر ہو گیا ہے۔

(خط نمبر ۳) رُواں پروری : جاں پروری، مُراد نوازش۔

برگردیدن : پلٹنا، واپس ہونا۔

(خط نمبر ۴) طرف گشتن : مقابل ہونا، برداشت کرنا۔

فرا رسیدن : پہنچنا، پالینا (بات کی تہ کو)۔

کاہل قدمی : کوتاہ قدمی۔

(خط نمبر ۵) کران پذیرفتن : انجام پانا، مکمل ہونا۔

خوردہ گرفتن : نکتہ چینی کرنا۔

ستوہ : اجیرن، بیزار۔

دم سردی : بے دلی۔

(خط نمبر ۶) خواستار : خواہندہ، چاہنے والا۔

(خط نمبر ۷) روز سعدِ اکبر : مبارک ستارے کا دن۔ علم نجوم کی رو سے زہرہ کو سعدِ اصغر اور مشتری کو سعد اکبر کہا جاتا ہے۔ یہاں مراد پنجشنبہ جو مشتری کا دن ہے

میر بساط : سردار، سرغنہ (یہاں بد معاشوں کا سرخیل مراد ہے) بساط سے جوے کی پھڑ بھی مراد ہو سکتی ہے۔

(خط نمبر ۸) آرامش : آرام (بکسرِ چہارم)

(خط نمبر ۹) نگرانی : انتظار، پریشانی۔

شگفت : بکسرِ اوّل و دوم۔ حیرت تعجب۔

(خط نمبر ۱۰) آویزش : اُلجھنا۔

معاش : زندگی۔

معاد : مرنے کے بعد کا معاملہ، آخرت۔

تألّم : ایذا۔

عبد القاہر : قہر کرنے والے کا بندہ۔ یہاں غالب نے اپنے لیے یہ نام طنزاً استعمال کیا ہے اور قہر کے وہ معنی سمجھے ہیں جو اُردو میں رائج ہیں عربی میں قاہر کا مفہوم "پورا غلبہ رکھنے والا" ہے۔

(خط نمبر ۱۱) رُوان آسائی : روح کی طمانینت، خوشی۔

معاف داشتن : کوتاہی کرنا۔

تمغائے ڈاک : غالباً ڈاک محصول کے ٹکٹ مراد ہیں۔

(خط نمبر ۱۲) داوری : محاکمہ، قضیہ۔

سروبن : ایک تناور درخت کا نام، مجازاً معاملے کی اہمیت اور بڑائی کا اظہار، (یا انجام و آغاز)۔

برتافتن : جھیلنا (مجازاً مراد ہے)۔

نوٹ : ان الفاظ کا مطلب متعیّن کرنے میں ایف اسٹائن گاس کی "پرشین انگلش ڈکشنری" گیلانی کی فرہنگ گیلانی اور حئیم کی لغات سے استمداد کی گئی ہے۔

(د) اُردُو ترجمہ

(۲) بنام شیفتہ :

جناب عالی، کل کی گرمی میں، جس سے رگوں میں خون جل رہا تھا اور ہڈیوں میں مغز پگھلا جاتا تھا، اس کی شدت اتنی عام تھی کہ سمندر نے جب تک اپنے تئیں آگ سے نکال کر پانی میں نہ ڈال دیا ہوگا چین نہ پایا ہوگا۔ چوں کہ میری عادت ہے کہ ایک ایک گھونٹ پانی پیتا رہتا ہوں، آپ کو ہر وقت یاد کرتا رہا، پیاس سے اگر دل ایک بار تڑپا تو آپ کی یاد سے سو بار تلملایا : (شعر)

عاشقی میں کوئی بھی میری طرح اپنے ہم پیشہ کو پسند نہیں کرتا
میں اگر آبِ شیریں بھی پیتا ہوں تو مجھے کوہ کن یاد آجاتا ہے

بارے یہ بتائیے کہ دن کیسے گزرا اور رات کیوں کر کٹی۔ خاں صاحب نے کیا تجویز کیا ہے؟ آپ نے کل اور آج کون سی دوا پی ہے؟ دوسرے یہ کہ اگر میں زندہ رہا تو کل کہاروں کو بھیج دیجیے تاکہ مجھے لے جائیں۔ والسّلام

ازاسداللہ

(۳) بنام شیفتہ :

خداوند نعمت کے قربان جاؤں، جاں پروری کا شکریہ ادا کرتا ہوں، عطیہ لانے والے نے پوچھنے پر کچھ اور بھی دیا، یعنی آپ کی صحت اور مزاج مبارک کی عافیت کا مژدہ سنایا، جسے میں نے بطورِ استعارہ یوں ادا کیا ہے۔ کل جمعہ ہے، بادشاہ کے دربار میں جاؤں گا، امید ہے کہ واپسی میں آپ کی آستاں بوسی کروں گا۔ حضرتِ سیّد کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیں۔ والسلام۔ از اسداللہ۔

(۴) بنام شیفتہ :

قبلۂ من! چونکہ آپ نے روزے اور نیند کو ملا یا ہے، اور میں ان دونوں میں سے ایک کی بھی مقاومت نہیں رکھتا چہ جائیکہ دونوں کا حریف بنوں، اسی لیے معذرت پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ سمجھ جائیں کہ اگر میں حاضرِ خدمت نہ ہوا تو کیوں نہ ہوا۔ مجھے کس بات کا اندیشہ تھا، ہاں بندہ پرور، آج پانچواں دن ہے کتاب مسودہ واپس کر دیں اور مجھے ممنون فرمائیں۔ کاش مجھے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ جب یہ مولانا کی نظر سے گزری تو اُنھوں نے کس عبارتِ دلآویز کو پسند فرمایا۔ اُمید ہے کہ مزاج مبارک کی کیفیت، خصوصاً اس شدّت کی گرمی میں، روزے کا حال تحریر فرمائیں گے۔ شاید آپ نے حفظِ صحت کا حق ادا اور روزہ قضا کیا ہوگا۔ فقط از اسداللہ

(۵) بنام شیفتہ :

بندگی بھیجتا ہوں اور خواجہ کی دولت و اقبال کا دوام خدا سے چاہتا ہوں۔ میں نے شاید آپ کو لکھا ہو کہ امیر تیمور کی جہاں ستانی کی روداد تحریر کی جا چکی ہے میں اُسے خود دربار میں لے جا رہا ہوں۔ آپ نے مجھ پر خوردہ گیری کی ہے کہ فلاں مہینے میں تو سبزہ اور آبِ رواں کی سیر کے لیے گیا تھا۔ افسوس، میرے ایسے انسان کو سیر و تماشا کا دماغ کہاں ہے؟ یا اللہ میں بھلا کب گیا تھا ــــ ہاں یہ ہوا کہ جب احترام الدولہ بہادر شہر میں تشریف لائے تو میں اُن کے پاس گیا اور وہ مسودہ جو کم و بیش چار جزو تھے، اُن کے حوالے کر آیا۔ آپ کو معلوم رہے کہ میں غم سے اجیرن اور زندگی سے بیزار ہوں۔ یہ کام

بہت ہی بے دلی اور افسردگی کے ساتھ کر رہا ہوں۔ گویا توسنِ قلم کی باگیں میرے قبضے میں نہیں ہیں وہ خود جدھر اور جیسے چاہتا ہے چلتا رہتا ہے۔ مزاج مبارک کا حال، جیسا مجھے گمان تھا وہی ہوا، خدا پرہیز کی توفیق اور پرہیز کے ذریعے تندرستی عطا فرمائے۔ نورچشم محمد علی خاں کو دعا۔ والسلام۔

(۶) بنام شیفتہ :

امید گاہِ اہلِ معنی سلامت۔ ریختہ تازگیِ فکر کے نتائج میں سے ہے اور فارسی کی غزلیں جن کی ابتدا ریختہ سے پہلے ہوئی تھی، آج رات کو تمام ہوئیں، خدارا ان دونوں غزلوں میں یہ نہ بھولیے کہ کس سے گفتگو ہے اور کیا کہا ہے؟ اب ان اشعار کی زینت اصلاح سے چاہتا ہوں اور اُس کے لیے منّت قبول کروں گا، محض داد کا طلب گار نہیں ہوں۔ آپ کی خوشی، تندرستی اور شادکامی کا مژدہ سننا چاہتا ہوں اور بس۔

(۷) بنام شیفتہ :

بدھ کے دن، یعنی کل میں نے عرض کیا تھا کہ جمعہ کے دن مجھے دربار میں باریابی ملے گی اور خلعت و خطاب عطا کر کے اور نوکری کا فرمان صادر کر کے مجھے احسان مند کیا جائے گا۔ لیکن احترام الدولہ بہادر نے اس شعر کے مصداق :

جنّت کا وعدہ تو کل کا تھا، مگر آج ہی نصیب ہو گئی

جی ہاں کریم لوگ ایسی ہی وعدہ خلافی کیا کرتے ہیں!

چنانچہ آج ہی، کہ یہ بھی روزِ سعد اکبر ہے، مجھے شہنشاہ کے دربار میں بلایا اور خلعت و خطاب و فرمان سے سرفراز کیا۔ کل کوتوالِ شہر نے مجھے "بدمعاش" اور "سرغنہ" لکھا تھا، تو میرا کچھ نہ گھٹا تھا، آج بادشاہ نے نجم الدولہ اور دبیر الملک کا خطاب دیا ہے تو کچھ بڑھ نہیں گیا۔ اب فردائے قیامت میں دیکھنا ہے کہ مجھے کیا لکھا جاتا ہے، کس نام سے پکارا جاتا ہے، اور وہاں میری کیا ارزش ہوتی ہے۔ خدا کے لیے آئیے اور جلدی آئیے تاکہ آپ شاہی فرمان اور اس روسیاہ کی تحریر دیکھ لیں۔ والسّلام اُلوف الاحترام۔

جمعرات ۲۳ شعبان ۴ جولائی ۱۸۵۰ء (باز نوشت) پوشیدہ نہ رہے کہ سرکارِ شاہ

میں میرا تقرّر اسی مہینے کی پہلی تاریخ سے اس خاندان کے اسلاف کی تاریخ لکھنے پر ہوا ہے۔ پچاس روپے تنخواہ ہوگی۔ اور زرِ تنخواہ کی وصولی سال میں دو بار ہوگی۔ فقط۔

(۸) بنام شیفتہ :

خدا کا شکر اور احسان ہے کہ آپ واپس تشریف لے آئے اور اپنے نورِ چشم کو دیکھ لیا۔ چوں کہ اب گرمی ختم ہو چلی ہے اور ہوا بھی کچھ ٹھنڈی ہو گئی ہے، امید ہے کہ آپ کے مزاج میں اب اعتدال ہو گیا ہو گا اور جتنی گرمی گھٹتی جائے گی آپ کی صحت عَود کرتی آئے گی۔ دو تین دن ہوئے کہ امیر تیمور گورگان کی روداد لکھ کر نمٹا ہوں اب دو ہفتے آرام کروں گا، پھر ذرا دم لے کر بابر بادشاہ کا حال لکھا جائے گا۔ بخدا اس نثر میں نظم سے کچھ زیادہ ہی جانگداز کاوش کرنا پڑتی ہے۔ عید کے دن مولانا کی قدم بوسی نصیب ہوئی، اُنھوں نے نوازش فرمائی اور نثر کی تعریف کی۔ شاہ گردوں بارگاہ (ظفر) حضرت قطب الاقطاب کے مزار کی طرف (مہرولی) تشریف لے گئے ہیں اور احترام الدولہ بادشاہ کے ساتھ ہیں۔ اگر موقع ملا تو میں بھی جاؤں گا اور دو تین دن رہ کر وہاں کا موسم اور ہوا کا رنگ دیکھوں گا۔ کیا تدبیر کروں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ آپ تک پہنچ جائے اور آگے جو کچھ لکھتا رہوں وہ ایک ایک ورق کر کے آپ کی نظر سے گزرتا رہے۔ چند ورق جو نواب فخر الدین خاں نے لکھے تھے وہ اُنھیں کے پاس ہیں اور جو کچھ ملتا رہتا ہے لکھتے رہتے ہیں تا آں کہ اُن اوراق نے کتاب کی صورت اختیار کر لی۔

(۹) بنام شیفتہ :

یا اللہ۔ یہ خط جو لا اُبالی، اور غلاموں سے بے نیاز آقا کی طرف سے میرے پاس پہنچا ہے، اس نے آخر میرے تردّد میں سے کیا گھٹایا اور آگہی میں کیا اضافہ کیا؟ بس یہ جانا کہ رام پور کب گئے اور چند روز وہاں انجمن آرا رہ کر کب واپس آئے، اور دہلی کب آئیں گے۔ یہ سب باتیں ایک طرف۔ حیف ہے مجھ پر جسے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اب مزاج کا کیا حال ہے، جو مرض پہلے تھا، اور خدا کرے اب دشمنوں کے حصّے میں آیا ہو، اُس کی کیا

کیفیت ہے؟ (اس رنج[1] نے مجھے بھی بہت دنوں تک آزار پہنچایا ہے اس لیے زیادہ تردّد ہے کیوں کہ خدا کا فضل و کرم ہے اور آپ عشرت دوست واقع ہوئے ہیں، اللہ ہی نگہبانی کرنے والا ہے، جان و تن توانا اور عیش و عشرت مہیّا ہیں۔ بہر حال یہ بات کنایوں میں لکھی گئی اور تعریف دعا پر منتہی ہوئی۔ (یہاں سے عبارت مغشوش ہے اور مطلب صاف نہیں نکلتا)..... ہاں اے خدا کیسے کہوں کہ بیدادگر یہی ہے جس کا میں نام نہیں لیتا..... (عبارت مغشوش)...... ہم تم اس شیوہ کے موجد اور اس ادا کے مُختّرع ہیں۔ کیا میں اسی لائق ہوں کہ مجھے ایک لطیفہ اور چند باتوں (پر ٹرخا دیا جائے)۔ آپ نے یہ نہ جانا کہ میں دیدار کا شدید پیاسا ہوں، یہ نہ سمجھا کہ آپ کی مفصّل کیفیت معلوم کرنے کا جویا ہوں، یہ بھی دھیان نہ آیا کہ آپ کی جان و تن کا خیریت خواہ ہوں۔ یہ نہ سوچا کہ غالب سفرِ رامپور کی سرگذشت سُن کر آسودہ نہ ہو گا۔ یہ نہ جانا کہ وہ دیدار کا وعدہ چاہتا ہے اور یہ بھی آپ نے نہ چاہا کہ غلام علی خاں کا کچھ حال لکھیں۔ بخدا میں حیرت میں ڈوب گیا......)

بہر حال بندگی بے چارگی۔ میں نے سب باتوں سے قطع نظر کی۔ ہائے ایک شاعر ریختہ گو، معلوم نہیں کون ہے، کیا ہی اچھی بات کہہ گیا ہے:

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
رُوٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

اس پر صلح کرتا ہوں کہ مجھے پہلے تو مزاجِ مقدس کے حال سے پھر اپنے دہلی آنے کے ارادے سے آگاہی بخشیں۔ زیادہ بندگی بے چارگی ــــ لکھا ہوا، بُدھ کی صبح، ۸ مئی ۱۸۵۰ء۔

(۱۰) بنام منشی نبی بخش حقیرؔ:

شفیقِ مکرم و مُطاعِ معظّم، درویشِ گوشہ نشیں اسداللہِ حزیں سے بعد سلام معلوم

---

[1] یہاں سے آگے قوسین کی عبارت صاف نہیں ہے، مطلب مشکل سے سمجھ میں آتا ہے، میں نے محض اٹکل سے ترجمہ کیا ہے ممکن ہے اس میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو، اصلی فارسی عبارت پوری احتیاط کے ساتھ جوں کی توں نقل کر دی گئی ہے اور اختلافات حاشیے میں بتا دیے ہیں۔

فرمائیں اور پھر اپنے بھیجے ہوئے عنایت نامے کے پہنچنے کا اطمینان فرمائیں۔ کل دل ستم زدہ کو خیال سے کچھ آویزش تھی اور آپ کا خط نہ آنے سے قدرے تشویش تھی۔ آج اسی وقت کہ دوپہر ہے، ڈاک کا ہرکارہ آیا اور آپ کا خط لایا، پڑھتے ہی جواب لکھنے بیٹھ گیا چونکہ کارپردازانِ ڈاک صبح کو دوکان کھولتے ہیں اور دوپہر کے بعد خطوط وصول نہیں کرتے، اب لامحالہ یہ ورق، جو آج لکھا ہے، کل صبح کی ڈاک سے بھیجوں گا۔ بارے یہ کہ آپ نے میرا حال پوچھا ہے اور مجھ سے غزل طلب کی ہے یقین کیجیے کہ دل ٹھکانے ہوتا ہے تو زبان بھی زمزمہ سنج ہوتی ہے، اب تو دل اتنا بجھ گیا ہے گویا مر گیا، تو جوش کہاں سے آئے جو لبوں کو جنبش ہو۔ آپ نہیں دیکھتے کہ انھیں حکام سے، جو مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے مجھ پر کیا بیتی اور میری زندگی کافروں کی عاقبت جیسی ہوگئی۔ شاعری کی طرف دل کیا مائل ہو اور کب تک بادپیمائی کروں۔ دو تین روز ہوئے اپنے حال کی بے رونقی کا خیال کر رہا تھا، ایک شعر جس میں تخلص بھی ہے بے ارادہ زبان پر جاری ہوگیا، بس تازہ ہے تو یہی ہے: (شعر)

بیاں میں نہیں آسکتا کہ غالبِ ناکام پر کیا
گذر گئی، بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس بندے کا خدا نہ تھا

آلامِ جسمانی بھی اگرچہ بہت ہیں لیکن اندوہِ روحانی اُن سے کہیں بڑھ گئے جو دل و جگر دونوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ (ع۔ ر۔ بی: میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں یقیناً خدا بندوں کے معاملات کو دیکھنے والا ہے) جلیل القدر تفتہ سلمہ کا حال نہیں معلوم کہاں ہیں۔ اس شمعِ بزمِ سخن وری کی غزلیں تمھیں بھیج رہا ہوں اُن تک پہنچا دیجیے اور یہ کہہ دیجیے کہ رباعیات اس کے بعد پہنچیں گی۔

عبدالقاہر اسداللہ۔ لکھا ہوا۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۴۸ء

(۱۱) بنام ہرگوپال تفتہ:

مہربانا، رافت نشانا، متاعِ کارخانۂ خیال کی فہرست یعنی آں عدیم المثال (تفتہ) کا کلیات پہنچا۔ اور اس کے پہنچنے سے روح کو طمانیت ہوئی۔ بہت دنوں سے تمھارا منتظر تھا لیکن چوں کہ تمھارے مسکن و مقام کا پتا معلوم نہ تھا، خط نہ لکھ سکا۔ مگر تمھیں آخر کون

مانع تھا جو تم نے خط نہ لکھا اور اپنے احوال سے مجھے مطلع نہ کیا۔ بارے اس التفات نامے سے مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ تم خیریت سے ہو اور میرے لیے تمھارے دل میں جگہ ہے۔ کلیات دیکھ رہا ہوں اور میں نے اپنے اوپر یہ لازم کر لیا ہے کہ شروع سے آخر تک اسے دیکھوں اور حک و اصلاح میں قطعاً کوتاہی نہ کروں، لیکن یہ کام جلدی نہ ہو سکے گا، اگر دیر ہو جائے تو ملول نہ ہونا۔ اب یہ کہ دیوان فارسی کی دو جلدیں ڈاک کا محصول ادا کرنے کے بعد بھیج رہا ہوں اور ایک خط بھی مشفقی منشی نبی بخش سرشتہ دار عدالت فوجداری کول (علی گڑھ) کے نام ہے۔ عجب نہیں کہ تمھاری منشی صاحب سے شناسائی ہو اور نہ بھی ہو تو اس تقریب سے ہو سکتی ہے۔ اُن کے پاس جاؤ اور جو خط اُن کے نام کا ہے وہ اور ایک جلد دیوان اپنے ساتھ لے جاؤ اور یہ نامہ اور وہ کتاب انھیں دے دو۔ میں ان بزرگوار کو علیحدہ ڈاک سے بھی کتاب بھیج سکتا تھا لیکن یہی اچھا معلوم ہوا کہ تمھارے پاس بھیج دوں۔ بہت دنوں سے خجستگی خوے و فرخی نہاد مکرمی منشی ظہور علی صاحب دام بقاؤہ کا آوازہ سن رہا ہوں اور اس صاحبِ دل دیدہ ور کے ارادت مندوں میں سے ہوں، امید ہے کہ تم میرا سلام نیاز و شوق اُن کی خدمت پہنچا کر مجھے ممنون کرو گے۔ اور سپہر سخن کے ماہِ دو ہفتہ یعنی لالہ ہر گوپال تفتہ تم سے یہ بھی چاہتا ہوں کہ اگر جلد جلد نہ ہو سکے تو کبھی کبھی خط لکھ کر مجھے شاد کرتے رہا کرو۔ میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ ایک ماہ بعد تمھارے دیوان کے اجزا تمھیں پارسل کے ذریعے بھیج دوں گا اور رسم و راہ نامہ نگاری اس درمیان میں نہیں ٹوٹے گی۔ از اسد اللہ نامہ سیاہ، نگاشتہ ۲۸ جمادی الاولی ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۸۴۷ء۔

(۱۲) بنام مولوی فضل اللہ:

حضرت سلامت، یہ محاکمہ جو در پیش ہے، بہت اہم ہے اور اتنی تاخیر کی تاب نہیں لا سکتا، کچھ میر قاسم علی صاحب کو دلیر بنانا چاہیے اور کچھ خود آپ کو توجہ فرمانی چاہیے۔ میں ایمان سے کہتا ہوں کہ مجھے یہ تاخیر بہت شاق گزر رہی ہے اور دل اُس کے بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ والسلام خیر ختام اسد اللہ۔

اس کے لفافے کا پتا :

چونکہ نامہ بر منزلِ مقصود کو نہیں پہچانتا اُمیّد ہے غالبؔ کے خواجہ تاشوں میں سے کوئی، یعنی حضرت مولوی صاحب قبلہ، مولوی صدر الدین خاں کی خدمت کے حاضر باشوں میں سے کوئی عزیز، اس خط کو مخدومی و مکرمی مولوی فضل اللہ، جو اسم بامسمیٰ ہیں مگر میرے لیے نہیں، کی خدمت میں پہنچا کر، بھیجنے والے پر احسان کرے گا۔

(۵) توضیحات

(خط نمبر ۱) :

ہر گوپال تفتہ کے نام غالبؔ کا یہ خط جون ۱۸۵۴ء کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ غالبؔ نے چار مہینے سے تپ لرزہ میں گرفتار رہنے کا ذکر کیا ہے۔ تفتہ کو ۲ مارچ ۱۸۵۴ء کے مکتوب میں غالبؔ نے لکھا تھا :

"منشی صاحب تمھارا خط اس دن، یعنی کل بدھ کے دن پہنچا، کہ میں چار دن سے لرزے میں مبتلا ہوں اور مزا یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے کھانا نہیں کھایا؛ آج پنجشنبہ پانچواں دن ہے کہ نہ کھانا دن کو میسر ہے اور نہ رات کو شراب..... اشعار سابق و حال میرے پاس امانت ہیں، بعد اچھے ہونے کے اُن کو دیکھوں گا اور تم کو بھیج دوں گا۔ اتنی سطریں مجھ سے بہزار جبرِ ثقیل لکھی گئی ہیں۔" (رک : خطوط غالب [جلد اوّل] مرتبہ مہیش پرشاد، الٰہ آباد، ۱۹۴۱ء، صفحہ ۲۶)۔

مندرجہ بالا تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ ۲۶ فروری ۱۸۵۴ء کو لرزے میں مبتلا ہوئے تھے اور ہمارے پیش کردہ خط سے ظاہر ہوا کہ بیماری کا یہ سلسلہ چار مہینے تک جاری رہا، اسی شہادت کی روشنی میں ہم نے (خط نمبر ۱) کا زمانہ کتابت جون ۱۸۵۴ء متعین

کیا ہے۔ خطوطِ غالب مرتّبہ مہیش پرشاد میں تفتہ کے نام خط نمبر ۲۵ (مکتوبہ ۲ مارچ ۱۸۵۴ء) اور خط نمبر ۲۶ (مکتوبہ جولائی ۱۸۵۴ء) ہے، گویا اس عرصے میں تفتہ و غالب کے درمیان بہت کم خط و کتابت رہی۔ یہ خط مجموعۂ مکاتیب میں شمول کے وقت باعتبارِ زمانہ ۲ مارچ ۱۸۵۴ء کے خط کے بعد آئے گا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ نے اپنے دیوانِ فارسی کا مسودہ نظرِ ثانی و اصلاح کے لیے غالب کے پاس بھیجا تھا تفتہ بہت پُرگو شاعر تھے، کثرت سے اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجتے تھے۔ غالب کبھی اُن کی زود گوئی سے تنگ تھے اور بلطائف الحیل ٹالتے رہتے تھے، بلکہ گھبرا جاتے تھے۔

"کول تو معلوم مگر مکان آپ کا نہیں معلوم"۔ کول، علی گڑھ کا قدیم نام ہے۔ مکان نہ معلوم ہونے سے قیاس ہوتا ہے کہ تفتہ اُسی زمانے میں علی گڑھ گئے ہوں گے یا انھوں نے اپنا مکان تبدیل کیا ہوگا۔ اس خط سے ضمناً یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ تفتہ ۱۸۵۴ء میں علی گڑھ کے کسی محلّے میں سکونت پزیر تھے۔ (تفتہ کے حالات کے لیے رجوع کیجیے مالک رام: "تلامذۂ غالب" صفحات ۶۳ تا ۶۶)۔

(خط نمبر ۲): — نمبر ۲ سے ۱۰ تک فارسی کے آٹھ رقعات نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی کے نام ہیں۔ غالب انھیں اکثر فارسی ہی میں لکھتے تھے۔ چنان چہ ایک جگہ خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں:

> "آپ کو معلوم رہے کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفیٰ خاں حسرتی کو کبھی اردو خط نہیں لکھا ..... نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے: کہار آیا، خط لایا، آم پہنچے کچھ بانٹے، کچھ کھائے۔ بچوں کو دعا، بچوں کو (کی؟) بندگی ....." (خطوطِ غالب، مرتّبہ مہر، ۳۴۷)۔

لیکن یہ صحیح نہیں کہ کبھی اردو خط نہیں لکھا، خود عودِ ہندی میں نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام ایک اردو خط شامل ہے۔ (ر.ک: خطوطِ غالب، مرتّبہ مہر ۵۷۹)۔

زیرِ بحث خط میں گرمی کی شدّت اور شیفتہ کی بیماری کا ذکر ہے۔ شیفتہ سوداوی

مزاج کی وجہ سے اکثر احتراقِ دم وغیرہ کی بیماری میں مبتلا رہتے تھے۔ (رک: خط نمبر ۹)۔
خاں صاحب سے یقیناً شیفتہ کے معالج مراد ہیں اور وہ حکیم امام الدین خاں، حکیم احسن اللہ خاں یا حکیم محمود خاں میں سے کوئی ہو سکتے ہیں۔ قرینہ یہ کہتا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں کی طرف اشارہ ہے۔

(خط نمبر ۳): — اس خط میں کسی تحفے کی رسید دی گئی ہے۔ شیفتہ اکثر ہدایا بھیجتے رہتے تھے۔ آم چونکہ غالب کو مرغوب تھے اور شیفتہ اکثر بھیجا کرتے تھے، نیز یہ خط موسم گرما میں لکھا گیا ہے اس لیے قرینِ قیاس یہی ہے کہ آموں کا تحفہ آیا ہوگا۔ یہ خط جمعرات کے دن لکھا گیا ہے اور اگلے دن دربار میں حاضری دینے کا ذکر ہے۔ غالب ہر جمعرات کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں باریاب ہوا کرتے تھے۔ حضرت سیّد سے کون بزرگوار مراد ہیں، وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔

(خط نمبر ۴): — یہ رقعہ ماہِ رمضان کا لکھا ہوا ہے اور اس میں جس مسودۂ کتاب کا ذکر ہے وہ قریب بہ یقین ہے کہ مہر نیمروز کے اوراق ہوں گے۔ مولانا سے دو ہی شخصیات مراد ہو سکتی ہیں! مولانا فضل حق خیر آبادی یا مفتی صدر الدین خاں آزردہ۔ میرا قیاس ہے کہ یہ رقعہ اواخر جولائی یا اوائل اگست ۱۸۵۰ء کا لکھا ہوا ہے۔

(خط نمبر ۵): — اس خط میں غالب نے امیر تیمور تک کی روداد اتمام پزیر ہونے کی اطلاع دی ہے۔ غالب جولائی ۱۸۵۰ء میں تاریخ نویسیِ اسلاف کی خدمت پر مامور ہوئے تھے (رک: خط نمبر ۷)۔ ابتداءً یہ طے ہوا تھا کہ امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک کے حالات لکھے جائیں گے۔ جب غالب نے ہمایوں تک کے حالات لکھ لیے (مارچ ۱۸۵۱ء) اور تاریخی کتابوں کی چھان بین کی کھکھیڑ اُن سے برداشت نہ ہو سکی تو اُنھوں نے یہ شرط لگائی کہ مواد حکیم احسن اللہ خاں فراہم کر دیں اور میں بطور خود اسے فارسی نثر میں منتقل کرتا جاؤں۔ اس مرحلے پر بہادر شاہ نے یہ حکم دیا کہ ابتدائے آفرینشِ عالم سے تاریخ کا آغاز ہونا چاہیے۔ غالب نے اب مجوزہ تاریخ "پرتوستان" کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلا حصّہ ابتدائے عالم سے ہمایوں بادشاہ تک اور دوسرا عہدِ اکبری سے دورِ ظفر تک

جلد اوّل کا نام "مہرِ نیمروز" اور دوم کا "ماہِ نیم ماہ" رکھا گیا۔ غالب نے اگرچہ مارچ ۱۸۵۱ء میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال لکھ لیا تھا (رک : نادراتِ غالب ۸) لیکن بعد میں اُنھیں ابتدائے عالم سے تیمور تک کے حالات لکھ کر اضافہ کرنا پڑا۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی حالات فراہم کرنے میں ڈھیل دیتے رہے۔ مارچ ۱۸۵۲ء تک کام تعویق ہی میں پڑا رہا (تفصیلات کے لیے رجوع : ذکرِ غالب [طبع سوم] صفحات ۱۴۷ تا ۱۵۲ نیز مقدمہ نادراتِ غالب، صفحات ۵۰ تا ۶۲)۔ مہرِ نیمروز کے بارے میں مولوی رجب علی کو ایک خط میں (مارچ ۱۸۵۲ء) غالب نے لکھا ہے :

"آں سواد جزوے چند بیش نیست ..... از کشورکشایان تا نصیر الدین سلطان ہمایوں سخن راندہ ایم۔ باقی داستان فرداست"۔

اس سے ظاہر ہے کہ وہ مارچ ۱۸۵۲ء میں عہدِ ہمایوں تک لکھ چکے تھے۔ مہرِ نیمروز پہلی بار ۱۸۵۴ء میں فخر المطابع دہلی سے شائع ہوئی (ذکرِ غالب ۱۵۱)۔

مرزا کے خطوط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے جنوری ۱۸۵۱ء میں تیمور سے بابر تک کے حالات لکھ لیے تھے اور بارگاہِ سلطانی میں پیش کرنے کے لیے مسودہ بھی صاف کرانے لگے تھے۔ ۲۔ جنوری ۱۸۵۱ء کے ایک خط موسومہ منشی نبی بخش حقیر میں لکھتے ہیں :

"ہاں صاحب۔ اب بابر بادشاہ کا حال تمام لکھ چکا ہوں ..... اب چھ مہینے پورے ہو چکے، جولائی سے دسمبر ۱۸۵۰ء تک۔ اب میں دیکھوں یہ ششماہہ مجھے کیونکر ملتا ہے، بعد اس کے ملنے کے اگر آیندہ ماہ بماہ کر دیں گے تو میں لکھوں گا ورنہ اس خدمت کو میرا سلام ہے؛ ابھی بابر کا حال حضور میں نہیں بھیجا۔ کل مسودہ تمام ہوا، صاف ہو رہا ہے۔ اب صاف کو کر دے دوں گا اور ماہ بماہ کی استدعا کروں گا۔ چھ ماہی آخر ہونے کو تھی اس واسطے متوجّہ ہو کر میں نے اس کو تمام کیا۔ اس سبب سے فرصت تم کو لکھنے کی نہ ہوئی۔ (نادراتِ غالب ۸)

چوں کہ غالب نے بابر کا حال یکم جنوری ۱۸۵۱ء تک لکھ لیا تھا اور مارچ ۱۸۵۱ء میں ہمایوں کی روداد بھی لکھ چکے تھے (رک : نادراتِ غالب ۱۱)۔ اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ ہمارا پیش کردہ خط نمبر ۵ جنوری ۱۸۵۱ء سے بہر حال پہلے لکھا گیا ہے چوں کہ اس میں بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کے "تفریحِ سبزہ و آبِ رواں" پر جانے کا اشارہ ملتا ہے اس لیے یہ برسات کا موسم ہونا چاہیے۔ بدیں اسباب میں اس خط کو اواخر اگست ۱۸۵۰ء کا نوشتہ سمجھتا ہوں۔

اِس میں محمد علی خاں کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ یہ شیفتہ کے فرزندِ اکبر نواب محمد علی خاں رشکیؔ ہیں جو ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ حالیؔ انھیں کے اتالیق مقرر ہوئے تھے۔ رشکی اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور غالب سے مشورہ کرتے تھے۔ انھوں نے مئی ۱۸۹۹ء میں انتقال کیا۔ درگاہ حضرت نظام الدینؒ میں دفن ہوئے۔ یہ مشہور شعر رشکی ہی کا ہے:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں

(تفصیلی حالات کے لیے رک : تلامذۂ غالب ۱۱۷)

(خط نمبر ۶) :— اس رقعے سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنی دو تازہ غزلیں شیفتہ کو بھیجی تھیں۔

(خط نمبر ۷) :— یہ خط بہت اہم ہے۔ یہ اُسی روز لکھا گیا ہے جس دن غالب کو دربارِ ظفر سے خلعت و خطاب ملا ہے اور اُن کی ملازمت کا فرمان جاری ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلعت و خطاب کے لیے ۵ جولائی ۱۸۵۰ء یوم جمعہ طے ہوا تھا، لیکن انھیں ایک دن پہلے ہی ۲۳ شعبان مطابق ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو پنجشنبہ کے دن باریابی مل گئی۔ اِس رقعے سے اس غلطی کی تصحیح بھی ہو جاتی ہے جو غالب کے سہوِ قلم سے کلیات نثر فارسی (صفحہ ۲۷۱) میں رہ گئی ہے۔ وہاں غالب نے ۴ جولائی کی جگہ ۴ جون لکھ دیا ہے حالاں کہ ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ کو جمعرات کا دن اور جولائی کی چوتھی تاریخ تھی۔ لیکن اس رقعے میں بھی ایک فروگزاشت یہ ہے کہ اپنا خطاب غالب نے پورا نہیں لکھا۔ انھیں "نجم الدولہ

دبیر الملک" کے ساتھ نظام جنگ کا خطاب بھی عطا ہوا تھا (رک : ذکر غالب ۸۶-۹۰) اس خلعت و خطاب اور قلعہ کی ملازمت سے غالب کو جو خوشی ہوئی تھی وہ اس خط سے ظاہر ہے۔ اُنھیں یہ احساس تھا کہ حادثہ اسیری نے جو داغ "بدمعاشی" و "میر بساطی" کا ان کے دامن پر لگایا تھا وہ کسی حد تک اِس خلعت سے ڈھک جائے گا۔

اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب اگرچہ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو سلکِ ملازمت میں آئے تھے مگر اُن کا تقرر یکم جولائی ۱۸۵۰ء ہی سے تسلیم کیا گیا تھا اور سال میں دو بار تنخواہ ملنا طے ہوا تھا، لیکن اس سے غالب کا کام کہاں چل سکتا تھا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ تنخواہ ۶-۶ مہینے میں ملتی ہے اور وہ بھی متصدیوں کی ہزار خوشامد کے بعد ــــ اور معاش کا دار و مدار قرض پر ہے، تو جنوری ۱۸۵۱ء میں، گویا ایک ہی قسط وصول کرنے کے بعد اُنھوں نے وہ مشہور درخواست منظوم لکھی :

میری تن خواہ کیجیے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

غالباً اُن کی یہ درخواست منظور ہو گئی تھی۔

(خط نمبر ۸) :ــــ یہ خط بھی شیفتہ کے نام ہے۔ اِس میں اُن کے کسی سفر سے واپس آنے کا ذکر ہے۔ اِس میں امیر تیمور کی روداد مکمّل ہو جانے کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ یہ غالب نے جولائی ۱۸۵۰ء ہی میں مکمل کر لی تھی۔

عید کے دن قدم بوسیِ مولانا سے غالباً مفتی صدرالدین خاں آزردہ سے ملاقات ہونا مراد ہے۔ اگر یہ خط ۱۸۵۰ء کا مانا جائے تو اس سال ۳۰ جولائی کو عید ہوئی تھی۔ اِس لحاظ سے یہ تحریر اگست ۱۸۵۰ء کے نصف اوّل کی ہونی چاہیے۔ اِس خط کے یہ فقرے : "چوں تموز بپایان رسیدہ است و ہوا خنک گردید" بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ خط اگست ۱۸۵۰ء کا ہو سکتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر موسم برسات میں قطب جایا کرتے تھے اس خط میں اس کا حوالہ بھی ہے۔ فخر الدین خاں غالب کے مسوّدات صاف کیا کرتے تھے اکثر خطوط میں اُن کا تذکرہ ملتا ہے۔

(خط نمبر ۹) :۔ یہ خط بھی اُسی زمانے کا ہے جب شیفتہ سفرِ رامپور سے واپس آئے ہیں (غالباً اگست ۱۸۵۰ء) اس میں شیفتہ کی عشرت دوستی کی طرف بڑے لطیف انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ غالباً احتراق الدم کے مریض تھے اور شراب و شاہد کی دوستی نے اس مرض کو اور بھی اُستوار کر دیا تھا۔ غالب کہتے ہیں کہ میں بھی اِس آزار میں مدتوں مبتلا رہا ہوں اور آپ کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا ہے کیوں کہ خدا کے فضل سے عیش و عشرت کے سارے ہی سامان مہیا ہیں اور جان و تن، توانا ہیں۔ خدا ہی حافظ ہے۔ "اے داور چوں گویم کہ بیداد گر ہمیں است کہ نگویم"۔ اس میں شیفتہ کے رُنجو سے تعلقات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اپنے زمانے کی ایک طرح دار عورت تھی۔ (رک : تلامذہ غالب ۱۷۸، حاشیہ) اور شیفتہ سے اُس کے تعلقات کا حال اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔ یہ شاعرہ بھی تھی اور نزاکت تخلص کرتی تھی۔

اس میں غلام علی خاں کا بھی حوالہ ہے۔ اُن کے بارے میں اس وقت کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ اردو کا جو شعر نقل کیا ہے یہ قائم چاندپوری کا ہے (قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن)۔ یہ شعر غالب نے خواجہ غلام غوث بے خبر کو بھی ایک خط (مکتوبہ ۷ مارچ ۱۸۶۴ء) لکھا تھا:

"جنابِ عالی، ایک شعر اُستاد کا مدت سے تحویلِ حافظہ چلا آتا ہے:

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

میں نے از راہِ تصرف اِس شعر کی صورت بدل ڈالی :

ان دل فریبیوں سے نہ کیوں اُس پہ پیار آئے
روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا ....."

(خطوطِ غالب مرتبہ مہر، ۳۲۹)

(خط نمبر ۱۰) :۔ منشی نبی بخش حقیر (۱۸۶۰ء) کے نام یہ خط ۱۶ ستمبر ۱۸۴۸ء کا لکھا ہوا ہے اور اُس خط پر تقدمِ زمانی رکھتا ہے جو کلیات نثر غالب فارسی میں شامل

ہے (پنج آہنگ ۱۰۳) اور اسے میں اپنے مضمون "حادثۂ اسیری اور غالب" (نقوش ۹۴ جولائی ۱۹۶۲ء) میں درج کر چکا ہوں۔ اس میں غالب نے اپنا فارسی شعر:

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت

می تواں گفت کہ این بندہ خداوند نداشت

لکھا ہے اور اسے "تازہ ترین" بتایا ہے۔ اس خط کے اعتبار سے یہ شعر ۱۲ ستمبر ۱۸۴۸ء کا لکھا ہوا ہے لیکن یہی شعر منشی نبی بخش کے موسومہ خط (مورخہ ۲۲ فروری ۱۸۴۸ء) کے آغاز میں نقل ہوا ہے (کلیاتِ نثرِ غالب فارسی ۱۰۳)۔ اب یہ معمّا حل طلب رہا کہ جو شعر غالب نے ستمبر ۱۸۴۸ء میں لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ دو تین دن قبل فی البدیہہ ہوا تھا، وہ اُنھوں نے فروری ۱۸۴۸ء کے خط میں کیسے لکھ دیا؟ ہم نے جس بیاض سے یہ خطوط اخذ کیے ہیں اُن میں پہلے خط (مشمولہ پنج آہنگ) کے آغاز میں یہ شعر نہیں ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کلیاتِ نثر میں شمول کے وقت غالب نے اِس کا اضافہ کر دیا ہوگا جیسا کہ اُنھوں نے بعض الفاظ تبدیل کیے تھے اور آخر سے ریختہ کی غزل نکال دی تھی۔

یہ اختلافات محوّلہ بالا مضمون میں ظاہر کر چکا ہوں۔ یہ خط حادثۂ اسیری کے بعد لکھا گیا ہے اور اُس زمانے میں غالب کے دل و دماغ پر حزن و ملال کے جو اثرات مستولی تھے وہ اس خط میں بھی اسی طرح محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس فارسی شعر میں بھی اسی حزن و یاس کا غلبہ ہے۔ اِسی مفہوم کو اُردو میں اُنھوں نے یوں ادا کیا ہے:

زندگی اپنی جب اِس رنگ سے گزری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ۲۳۴)

اس شعر کے سلسلے میں ملاحظہ ہو: "امتیاز علی عرشی کا مضمون "دیوانِ غالب کا ایک اور نسخہ" مطبوعہ نقوش لاہور ۸۱، ۸۲۔ جون ۱۹۶۰ء)۔

نبی بخش حقیر کے حالات کے لیے رجوع: تلامذۂ غالب ۹۴ و بعد۔ نادراتِ غالب ۱۷ و بعد

(خط نمبر ۱۱):۔ آفاق دہلوی نے لکھا ہے کہ: "تفتہ نے اپنا پہلا دیوان ۱۸۴۸ء کے آغاز میں مکمل کر لیا تھا۔ اس کے دیباچے کے لیے اُنھوں نے غالب کو لکھا، غالب نے اپنی روش کے مطابق اُس کا دیباچہ لکھ دیا، تفتہ کو یہ دیباچہ پسند نہ آیا اور شکایت کی کہ آپ نے میری ہجوِ ملیح لکھی ہے۔ غالب اس سے بہت آزردہ ہوئے" (نادراتِ غالب ۲۲)۔

اِس فارسی خط سے جو ہر گوپال تفتہ کے نام ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۴۷ء کے وسط میں تفتہ نے اپنا "کلیاتِ فارسی" غالب کو نظرِ ثانی کے لیے بھیجا تھا۔ یہ خط اِس لیے اور بھی اہم ہے کہ شاید اسی کے ذریعے تفتہ اور منشی نبی بخش حقیر کا تعارف ہوا تھا۔ ان دونوں حضرات کے تعلقات پر بحث کرتے ہوئے آفاق دہلوی نے لکھا تھا:

"ان دونوں کے باہمی مراسم کی ابتدا کا حال معلوم نہ ہو سکا اور نہ یہ اتنا اہم ہے۔ نبی بخش بھی آگرے کے رہنے والے تھے، تفتہ کا بھی اکبر آباد سے کچھ تعلق تھا، ممکن ہے ان حضرات کے آبائی تعلقات ہوں اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ ان دونوں صاحبوں کی باہمی ملاقات کی تقریب کوئی ادبی صحبت یا ذوقِ سخن کی مطابقت ہو۔"

(نادراتِ غالب ۳۲)

غالب کے اِس خط سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ اُنھیں غالب ہی نے باہم متعارف کرایا تھا۔

اِس خط میں غالب نے دیوانِ فارسی کے دو نسخے بھیجنے کا ذکر کیا ہے اِس سے صریحاً دیوانِ فارسی کا وہ ایڈیشن مراد ہے جو ۱۸۴۵ء میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں کی ترتیب و تصحیح کے ساتھ مطبع دار السلام دہلی سے شائع ہوا تھا۔

منشی ظہور علی، علی گڑھ کے صدر الصُّدور تھے، تفتہ کے اُن سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ اُن کے ایک فرزند محمد سلیمان کا انتقال ہو گیا تھا اُس کی "یادگار" کے لیے ظہور علی نے تفتہ سے مثنوی سنبلستان (بطرزِ بوستان سعدی) لکھوائی تھی۔ سنبلستان میں جا بجا ظہور علی کا ذکر ملتا ہے:

زمانیکہ گشتش دہ وہفت سال
زگردوں بسے داشتم خستہ حال

گزر اتفاقاً بکول افتاد
شوی شاد گر بشنوی رویداد

کہ مردے نکو سیرت وحق تلاش
صفائے درونش، بروں از قیاس

اگر پرسیم نامش از خوشدلی
خود اول ظہور است وآخر علی

ظہور علی بہت دنوں سے تفتہ کی ملاقات کے مشتاق تھے، جب اُنھیں معلوم ہوا کہ وہ کول (علی گڑھ) میں آئے ہوئے ہیں تو اُنھوں نے اپنے فرزند وارث علی کو بھیجا، تفتہ ان کے ساتھ ملاقات کے لیے گئے۔ وہاں حال وقال کی محفل برپا دیکھی، تفتہ کو دیکھ کر مولوی ظہور علی کھڑے ہو گئے اور اُنھیں گلے سے لگالیا۔ پھر اصرار کیا کہ تم میرے پاس ہی قیام کرو۔ تفتہ راضی ہو گئے اور اُن کے لیے ایک مکان خالی کر دیا گیا۔ منشی ظہور علی کی درویشی اور خدا پرستی کی تفتہ نے بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اُن کی توجہ سے میرے لڑکے امراؤ سنگھ کو محکمۂ دیوانی میں ایک اچھی ملازمت بھی مل گئی۔

کتاب سنبلستان جو ۱۲۷۷ھ میں تصنیف ہوئی، دراصل مولوی ظہور علی کی فرمائش ہی پر لکھی گئی تھی اور اس کے دو مطلب تفتہ نے لکھے ہیں:

نہ بے مطلب ایں جہد کردم بجاں
دو مطلب مرا نیز بود اندراں

یکے آں کہ غیر از غزل مثنوی
نگفتم ہنوز از طریقِ نوی

دگر ایں کہ ماند ز راہِ وداد
سخن از محمد سلیمان یاد

یہ ۱۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ پانچویں باب میں شاعروں کی حکایات اور بارہویں میں خود تفتہ کے حالات ہیں۔ اس میں متعدد حکایات منشی ظہور علی سے متعلق ہیں یا ان سے روایت کی گئی ہیں۔

(خط نمبر ۱۲) :۔ مولوی فضل اللہ کے حالات تفصیل سے معلوم نہیں ہوتے۔ ان کے نام شیفتہ کا بھی ایک خط ملتا ہے (دیوان و رقعات حسرتی ۵۱-۵۲ طبع ۱۸۸۷ء) نظر بظاہر یہ منشی فضل اللہ برادر منشی امین اللہ (عرف اَمّو جان) دیوانِ الور ہیں۔ جن کے نام غالب کا ایک خط کلیاتِ نثر فارسی (پنج آہنگ) میں اور ایک "باغِ دو در" میں بھی ملتا ہے (ص ۱۲۷)۔ ان کا ذکر مرقعِ الور مؤلفہ محمد مخدوم تھانوی (ص ۱۵۱ وبہ بعد طبع ۱۸۸۹ء) میں بھی ہے :

> "منشی اَمّو جان نے عہدہ بخشی گری اپنے بھائی انعام اللہ خاں کو دیا تھا اور فضل اللہ خاں برادرِ خُرد خود کو کاروبار متعلقہ دیوانی میں شریک کیا تھا۔ یہ شخص فضل اللہ خاں بڑا فسادی تھا اور شرّ کا ابتدا سے عادی تھا....."

میر قاسم علی آگرے اور ہاتھرس میں عہدہ منصفی پر مامور رہے بعد ازاں صدر الصدور ہوئے۔ اُن کا ذکر غالب کے اور خطوط میں بھی ملتا ہے (مثلاً نادراتِ غالب ۲۱، ۸۸)

جامع رقعات نے اِس رقعے کا پتا بھی ساتھ ہی درج کر دیا ہے، جو یقیناً دل چسپ ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط مفتی صدر الدین آزردہ کے توسط سے بھیجا گیا تھا۔

(و) مراجع

کتب : مہیش پرشاد : خطوطِ غالب جلد اول ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد ۱۹۴۱ء۔

غلام رسول مہر : خطوطِ غالب کتاب منزل لاہور (طبع دوم) سنہ ندارد۔

غالب : کلیاتِ نثرِ غالب نولکشور لکھنؤ ۱۸۶۷ء۔

محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ : دیوان و رقعات حسرتی مطبع نیو امپیریل لاہور ۱۸۸۷ء۔
تفتہ : سنبلستان مطبع نولکشور ناقص الآخر سنہ ندارد۔
محمد مخدوم تھانوی : مرقع الور مطبع آگرہ اخبار آگرہ ۱۳۰۷ھ۔
مالک رام : تلامذۂ غالب مرکز تصنیف و تالیف نکودر ۱۹۵۷ء۔
مالک رام : ذکر غالب (طبع سوم) مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۵۵ء۔
امتیاز علی عرشی : دیوان غالب (نسخہ عرشی) انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۵۸ء۔
آفاق حسین آفاق : نادرات غالب مشہور پریس کراچی ۱۹۴۹ء۔
قائم چاند پوری : دیوان اردو (قلمی) مخزونہ انڈیا آفس لندن (ہندوستانی مخطوطات)۔
رسائل : سہ ماہی نوائے ادب، بمبئی جلد ۱۳، شمارہ ۳۔ جولائی ۱۹۶۲ء۔
رسالہ نقوش لاہور۔ شمارہ ۹۴، جولائی ۱۹۶۲ء۔
رسالہ نقوش لاہور۔ شمارہ ۸۱، ۸۲۔ جون ۱۹۶۰ء۔
سہ ماہی معاصر (پٹنہ) حصہ اول ۱۹۶۳ء۔

نوادرِ غالب (۲)

(ایک غیر مطبوعہ خط اور ایک قطعہ)

غالب کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ہنوز دل کاوش کا تقاضا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب تک تلاش کرنے والوں کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ اسی سال کے شروع میں غالب کے بارہ غیر مطبوعہ خطوط میں نے دریافت کرکے "نقوش" کے سال نامہ (۱۹۶۳ء) میں چھپوائے تھے۔ آج یہاں اُن کے ایک فارسی خط اور ایک قطعہ تاریخ کا متن پیش کرتا ہوں۔

غالب اور سرسیّد :

یہ خط سرسیداحمد خاں (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸ء) کے نام لکھا گیا ہے۔ اُس زمانے میں وہ "سر" تو نہیں ہوئے تھے، لیکن آخری تاجدارِ مغلیہ کے دربار سے اُنھیں "جوادالدولہ سید احمد خاں بہادر عارف جنگ" کا خطاب مرحمت ہو چکا تھا۔ سرکارِ انگریزی کی ملازمت میں منسلک ہونے کے بعد وہ مینؔ پوری میں بہ حیثیت منصف مقرر ہوئے۔ وہاں سے ۱۰ر جنوری ۱۸۴۲ء کو اُن کا تبادلہ فتح پور سیکری کے لیے ہوا[1]۔ جہاں وہ چار برس تک منصف رہے۔ ۱۸ر فروری ۱۸۴۷ء کو فتح پور سیکری سے دہلی تبدیل ہو گئے۔

---

[1] حالی؛ حیاتِ جاوید۔ جلد اوّل/ ۱۱۱ (طبع اکادمی پنجاب، لاہور)۔

اِس خط کے عنوان میں سر سیّد کے "مُنصف فتح پور" ہونے کا ذکر ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ خط ۱۸۴۲ء کے بعد لکھا گیا ہے اور اس میں سر سیّد کے برادرِ بزرگ سیّد محمد (مالک سیّد الاخبار دہلی) کا بھی حوالہ ہے جن کا انتقال ۱۸۴۶ء میں ہوا[1]۔ اس طرح زمانہ کتابت ۱۸۴۲ء - ۱۸۴۶ء کے مابین قرار پاتا ہے۔

اس خط کی شانِ نزول بظاہر یہ ہے کہ سر سیّد احمد خاں نے غالب کو غلام امام شہید[2] کے دو نعتیہ اشعار بھیج کر انھیں تضمین کرنے کی فرمایش کی تھی۔ اس پر غالب نے معذوری ظاہر کی ہے۔ اِس کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ وہ فرمایشی چیزیں لکھنے سے طبعاً گھبراتے تھے۔ دوسرے یہ کہ غلام امام شہید اور اُن کی شاعری کے بارے میں غالب کی رائے کبھی اچھی نہیں رہی۔ اُنھوں نے شہید کے اشعار کی تضمین کو اپنے لیے "دُونِ مرتبت" سمجھا ہوگا۔ تیسرا سبب یہ بھی ہے کہ سر سیّد سے غالب کے تعلّقات کبھی زیادہ مخلصانہ نہیں رہے۔ اسی خط کے لب و لہجہ سے اُس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب اُنھوں نے سر سیّد کی پہلی تصنیف "آثار الصّنادید" کے لیے تقریظ لکھی (۱۸۴۷ء) تو اُس میں نری لفاظی تھی۔ مصنّف کتاب کی مدح میں بہت کم تھا۔ بعد ازاں سر سیّد نے آئینِ اکبری کی تصحیح کر کے اُسے چھپوایا (۱۸۵۶ء/۱۲۶۲ھ) تو غالب سے اُس پر بھی کچھ لکھنے کی فرمایش کی۔ غالب نے ۳۸ شعروں کی ایک مثنوی لکھ ڈالی۔ جو کلیاتِ نظمِ فارسی میں موجود ہے۔ اُسے سر سیّد نے کتاب میں شامل نہیں کیا، بلکہ غالب کے پاس واپس کر دیا اور لکھا کہ ایسی تقریظ مجھے درکار نہیں۔ کیوں کہ اِس میں غالب نے ابو الفضل اور آئینِ اکبری کے بارے میں اچھی رائے ظاہر نہیں کی تھی، اور سر سیّد کو مشورہ دیا تھا کہ اِن گڑے مُردوں کو اکھاڑنے کی بجائے اہلِ فرنگ کی نئی ایجادیں اور سائنس کی برکتیں ملاحظہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آئینِ جہاں بانی اسے کہتے ہیں اور آئینِ اکبری تقویمِ پارینہ ہو چکا

---

[1] حالی: حیاتِ جاوید۔ جلد اوّل/۱۱۳۔ (طبع اکادمی پنجاب، لاہور)۔

[2] الٰہ آباد کے باشندے تھے۔ ۷۵ سال کی عمر میں ۲ اکتوبر ۱۸۷۹ء کو وہیں انتقال کیا۔ شہید کے کوئی اولاد نہیں تھی (نادر روزنامچہ/۳۱)۔

ہے۔ چند اشعار اُس مثنوی[1] کے ملاحظہ ہوں:

وینکہ در تصحیحِ آئیں رائے اوست
ننگ و عارِ ہمّتِ والائے اوست

بر چنین کارے کہ اصلش ایں بود
آں ستایدکش ریا آئیں بود

من کہ آئینِ ریا را دشمنم
در وفا اندازہ دانِ خود منم

گر بدین کارش نگویم آفرین
جائے آں دارد کہ جویم آفرین

با بد آئینان نمانم در سخن
کس نداند آنچہ دانم در سخن

گر ز آئیں می رود یا ما سخن
چشم بکشا اندرین دیرِ کہن

صاحبانِ انگلستاں را نگر
شیوہ و اندازِ ایناں را نگر

تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند
آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت
سعی بر پیشینیان پیشی گرفت

حقِ این قومست آئیں داشتن
کس نیارد مُلک بہ زیں داشتن

---

[1] کلیاتِ نظمِ غالب/ ۱۰۹ (طبع نولکشور ۱۹۲۴ء)۔

داد و دانش را بہم پیوستہ اند
ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند

آتشے کش سنگ بیروں آورند
این ہنرمنداں زخس چوں آورند

تا چہ افسوں خواندہ اند اینان بر آب
دوُد کشتی را ہمی راند در آب

گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد
گہ دخاں گردوں بہ ہاموں می برد

غلطک گردوں بگرداند دخاں
نرہ گاو اسپ را ماند دماں

از دخان زورق برفتار آمدہ
باد و موج این ہر دو بیکار آمدہ

ہیں نمی بینی کہ ایں دانا گروہ
در دو دم آرند حرف از صد کروہ

می زنند آتش بباد اندر ہمی
می درخشد باد چوں اخگر ہمی

رو بہ لندن کاندران رخشندہ باغ
شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ

پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار
گشتہ آئینِ دگر تقویمِ پار

مُردہ پروردن مُبارک کار نیست
خود بگو کان نیز جُز گفتار نیست

معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کے بعد رنجش پیدا ہو گئی تا آنکہ جب جنوری ۱۸۶۶ء

میں غالب رام پور گئے تو واپسی میں مراد آباد کی ایک سرائے میں اُترے۔ اُس زمانے میں سیّد احمد خاں صدر الصّدور تھے۔ اُنھوں نے جو مرزا کے آنے کا حال سُنا تو اصرار کر کے اپنے مکان پر لے گئے۔ مولانا حالی نے اس کا ذکر اِن لفظوں میں کیا ہے:

"سر سیّد کہتے تھے کہ جب میں مراد آباد میں تھا، اُس وقت مرزا صاحب نواب یوسف علی خاں مرحوم سے ملنے کو رام پور گئے تھے، اُن کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی، مگر جب دلّی کو واپس گئے، تو میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہونچا اور مرزا صاحب کو اسباب اور تمام ہمراہیوں کے ساتھ اپنے مکان پر لے آیا۔ ظاہراً جب سے سر سیّد نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا سے اور مرزا اُن سے نہیں ملے تھے اور دونوں کو حجاب دامن گیر ہو گیا تھا اور اسی لیے مرزا نے مراد آباد میں آنے کی اُن کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب مرزا سرائے سے سیّد کے مکان پر پہونچے اور پالکی سے اُترے تو ایک بوتل اُن کے ہاتھ میں تھی۔ اُنھوں نے اُس کو مکان پر لا کر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سر سیّد نے کسی وقت اُس کو وہاں سے اُٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا۔ مرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے۔ سر سیّد نے کہا: آپ خاطر جمع رکھیے۔ میں نے اُس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے۔ مرزا صاحب نے کہا: "بھئی مجھے دکھا دو تم نے کہاں رکھی ہے۔" اُنھوں نے کوٹھری میں لے جا کر بوتل دکھا دی۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل اٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے کہ: "بھئی اِس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے، سچ بتاؤ کس نے پی ہے؟ شاید اِسی لیے تم نے کوٹھری میں لا کر رکھی ہے۔ حافظ نے سچ کہا ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بہ خلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

سرسیّد ہنس کر چُپ ہو رہے اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی، رفع ہو گئی۔ مرزا دو ایک دن وہاں ٹھہر کر دہلی چلے آئے۔"[۱]

حاؔلی نے "دو ایک دن" ٹھہرنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن غالب پانچ دن تک سرسیّد کے مہمان رہے تھے۔ تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:[۲]

"لو صاحب، کھچڑی کھائی، دن بہلائے، کپڑے پھاٹے گھر کو آئے۔ ۸۔ جنوری ماہ و سالِ حال دوشنبہ کے دن غضبِ الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا، تمھارا خط مضامینِ دردناک سے بھرا ہوا رام پور میں میں نے پایا۔ جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں پہنچ کر، بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ اُنھوں نے۔ بیمار داری اور غم خواری بہت کی۔"

دوسرے خط میں سیّد احمد حسن مودودی کو لکھا ہے:[۳]

"رام پور کی سرکار کا فقیرِ تکیہ دار روزینہ خوار ہوں۔ رئیسِ حال نے مسند نشینی کا جشن کیا۔ دعا گوئے دولت کو درِ دولت پر جانا واجب ہوا۔ ہفتم اکتوبر کو دلّی سے رام پور کو روانہ ہوا۔ بعد قطعِ منازلِ ستّہ وہاں پہنچا بعد اختتامِ بزم عازمِ وطن ہوا۔ ہشتم جنوری کو دلی پہنچا۔ غرض راہ میں بیمار ہوا۔ پانچ دن مراد آباد میں صاحبِ فراش رہا۔"

یہ ہے غالب اور سرسیّد کے تعلقات کی رویداد۔ جس کا ہمیں علم ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی تعلّقات کبھی رسمی حدود سے آگے نہیں بڑھے۔ اس کے ظاہرًا دو

۱۔ حالی: حیاتِ جاوید، جلد اوّل ۱۲۵ (حاشیہ)۔

۲۔ مہر: خطوطِ غالب، ۲۱۴۔ ۳۔ مہر: خطوطِ غالب، ۴۳۱۔

اسباب ہیں۔ ایک تو سرِ سیّد بسلسلۂ ملازمت دہلی سے باہر رہے۔ وہ شاعری تفنّنِ طبع سے زیادہ کرتے نہ تھے جو غالب سے خط و کتابت رکھتے۔ دوسرے یہ کہ خط و کتابت میں صلح صفائی ہوئی اور اس کے تین سال بعد غالب کا انتقال ہو گیا۔

غالب اور غلام امام شہیدؔ :

مولوی غلام امام شہیدؔ سے غالب کیوں برافروختہ تھے، اس کا حال نہیں کُھلتا۔ ایسا قیاس ہوتا ہے چوں کہ وہ محمد حسن قتیلؔ کے شاگرد تھے اور قتیلؔ سے غالب کو خدا واسطے کا بیر تھا، نیز شہید کے شاگردوں اور مدّاحوں کا حلقہ وسیع تھا اور وہ اپنے زمانے میں اچھے شاعر و نثر نگار شمار ہوتے تھے۔ پھر حیدر آباد میں اُن کی قدر افزائی ہوئی اور نواب محی الدّولہ نے اُنھیں ایک ہزار روپیہ زادِ راہ دے کر طلب کیا اور سرکارِ عالی سے چار سو روپیہ ماہوار مقرر کرا دیے۔ یہی نہیں بلکہ راجا گردھاری پرشاد اور محی الدّولہ نے زاد و راحلہ دے کر اُنھیں سفرِ حج کے لیے روانہ کیا، اپنے مولود اور نعتوں کی وجہ سے وہ عقیدت مندوں کا حلقہ بھی خاصا رکھتے تھے۔ اِن سب باتوں نے غالب پر اُن کا مجموعی تأثّر ایسا ہی کر دیا تھا۔

اور جب غالب نے سنا کہ حیدر آباد میں شہید کی اچھّی قدر ہو رہی ہے تو اُنھیں اپنی بدقسمتی کا احساس اور بھی زیادہ ہو گیا۔ وہاں اُن کے شاگردوں میں حبیب اللہ ذکاؔ موجود تھے۔ اُنھیں خط لکھ کر تفحّصِ احوال کرتے رہتے تھے۔ حکیم غلام نجف خاں کو ایک خط میں لکھا ہے[1]

> "مولوی فضل رسول صاحب[2] حیدر آباد گئے ہیں۔ مولوی غلام امام شہیدؔ آگے سے وہاں ہیں، محی الدّولہ محمد یار خاں سورتی نے اِن صورتوں کو

---

[1] مہر: خطوطِ غالب، ۳۸۵۔

[2] منشی فضل رسول واسطی سندیلوی (متوفی ۱۸۷۹ء) جو رشتہ میں شہید کے بھانجے تھے۔ ان کا دیوان نولکشور سے چھپ چکا ہے انھیں مظفر علی اسیر (متوفی ۷ فروری ۱۸۸۲ء) سے تلمّذ تھا (نادر روزنامچہ ص ۳۱)۔

وہاں بلایا ہے۔ پر یہ نہیں معلوم کہ وہاں اُن کو کیا پیش آیا ہے۔ اگر تم کو کچھ معلوم ہو گیا ہو تو مجھ کو ضرور لکھو۔"

ان جملوں میں جو طنز چھپا ہوا ہے اُس کا اندازہ "سورتی" اور "صورتوں" کے تلازمے ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہمیں لطف تب آئے گا جب یہ معلوم ہو کہ غلام امام شہید بدصورت تھے، اُن کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور کانوں میں کرنالے لگا کر سُنتے تھے۔ مولوی مظہر علی نے لکھا ہے:[1]

"مولوی غلام امام شہید ..... متوطن الٰہ آباد آج تشریف لائے.... شہید صاحب مولود خوب پڑھتے ہیں اور وقت پڑھنے کے عشق آنحضرت میں بے چین ہو جاتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آواز اچھی نہیں۔ بالفعل اُن کی عمر ستر برس کی ہے۔ کرنالے لگا کر سُنتے ہیں۔"

(۳ر اکتوبر ۱۸۷۲ء)

غالب برابر غلام امام شہید کے بارے میں ٹوہ لگاتے رہتے تھے۔ ۲۶ر اگست ۱۸۶۳ء کو حبیب اللہ ذکا کے موسومہ خط میں لکھتے ہیں:

"اب آپ اس خط کی رسید لکھیے اور اس میں غلام امام شہید کا حال مفصّل لکھیے کہ اُن کی وہاں کیا صورت ہے۔ ایک شخص مجھ سے یوں کہتا تھا کہ مختار الملک نے منہ نہ لگایا مگر محی الدولہ نے چار سو روپیہ مہینا سرکار جنابِ عالی سے مقرر کرا دیا ہے۔"[2]

پھر "اودھ اخبار" میں اُنھوں نے ایک خبر دیکھی تو جھٹ ذُکا کو لکھا:[3]

"ہاں صاحب، اودھ اخبار میں ایک قصیدہ مولوی غلام امام کا دیکھا 'مکان تنگ است، جہان تنگ است، مدح مختار الملک' میں، متضمن استدعائے مسکنِ وسیع، پھر مہینے بعد، اُسی اودھ اخبار میں

---

[1] ہاشمی: ایک نادر روزنامچہ/ ۲۸۔ [2] مہر: خطوطِ غالب/ ۴۶۴۔ [3] ماسبق/ ۴۶۴۔

یہ خبر دیکھی کہ نواب نے مسکن تو نہ بدلا، مگر تیس روپے مہینا بڑھا دیا۔
اُسی اخبار میں پھر دیکھا کہ ایک صاحب نے مولوی غلام امام کے کلام پر اعتراض کیا ہے، اور اُن کے شاگرد وضیع تخلص نے اُس کا جواب لکھا ہے۔
آپ سے اس روئداد کی تفصیل اور جوابِ اعتراض و معترض کے نام کا طالب ہوں۔ بہ سبیلِ استعجال۔" (۱۱ر جنوری ۱۸۶۷ء)

اچھا، لطیفہ یہ ہے کہ ذُکا نے شہید کو بتا دیا یا اُنھیں کسی طرح معلوم ہو گیا کہ غالب اُن کے بارے میں کیا لکھتے رہتے ہیں۔ اُس غریب نے خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کو شکایت لکھی کہ مرزا صاحب مجھ سے بے سبب ناراض ہیں۔ بے خبر نے غالب کو لکھا کہ حضرت یہ کیا ماجرا ہے۔ شہید پر آپ کیوں وار کر رہے ہیں، اگر کوئی اور ہوتا تو شاید غالب جواب میں شہید تو کیا قتیل کو بھی نہ بخشتے اور خوب کھری کھری سناتے۔ مگر بے خبر لیفٹنٹ گورنر کے میر منشی اور غالب کے دوست تھے، اُن سے ذرا کو دبتی تھی غالب نے معذرت لکھی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو[1]:

"منشی حبیب اللہ ذُکا کے اشعار آتے رہے اور میں اصلاح دے کر بھیجتا رہا۔ بعد وارد ہونے مولوی صاحب کے ایک غزل اُن کی آئی اور اُنھوں نے یہ لکھا کہ مولوی غلام امام شہید اکبر آبادی کی غزل پر یہ غزل لکھ کر بھیجتا ہوں۔ میں نے حسبِ معمول غزل کو اصلاح دے کر بھیجا اور یہ لکھا کہ مولانا شہید اکبر آباد کے نہیں، لکھنؤ اور الٰہ آباد کے ہیں، اِس کلمے سے زیادہ کوئی بات میں نے نہیں لکھی۔ اِس میں سے توہین کے معنی مستنبط ہوں تو میں اُن کا مُتّہَم سہی۔ اب نہیں جانتا کہ منشی صاحب نے مولوی صاحب سے کیا کہا اور مولوی صاحب نے آپ کو کیا لکھا؟"

ایک بار غالب کے دوست چودھری عبدالغفور سُرور نے اُنھیں لکھا تھا کہ آپ والیِ دکن کی مدح میں قصیدہ کہہ کر کیوں نہیں بھیجتے، وہاں آج کل ہُن برس رہا ہے۔ آپ کی بھی

---

[1] ماسبق ۳۴۶۔

ضرور قدردانی ہوگی۔ اُس کے جواب میں غالب نے لکھا تھا:[1]

"پہلے کچھ باتیں کہ بادی النظر میں خارج از بحث معلوم ہوں گی جو لکھی جاتی ہیں:

میں پانچ (برس) کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اُس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے، شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں، دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دیے، مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصّہ ساڑھے سات سو روپے سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتّہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریزیڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکرتر بمرگِ ناگاہ مر گئے۔"

"واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے، یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالعِ محسن سوز و مُربّی کُش کہاں پیدا ہوتے ہیں!اب جو میں والیِ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اُس کی ضائع ہو جائے گی اور والیِ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اُس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوند بندہ پرور یہ سب باتیں وقوعی و واقعی ہیں۔ اگر ان سے قطعِ نظر کر کے قصیدہ کا قصد کروں، قصد تو کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا۔ سوائے ایک سلکہ کے کہ وہ پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے، کوئی قوّت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے

---

[1] مہر: خطوطِ غالب، ۸-۲۹۷۔

مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیوں کر لکھی تھی۔ اور یہ شعر کیوں کر کہے تھے۔ عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے۔

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

پایانِ عمر ہے دل و دماغ جواب دے چکے ہیں، سَو روپے رام پور کے ساٹھ روپے پنشن کے، روٹی کھانے کو بہت ہیں، گرانی اور ارزانی اُمورِ عامّہ میں سے ہے، دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلے کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں۔ دیکھو منشی نبی بخش مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے ماہ گزشتہ میں گزر گئے، مجھ میں قصیدے لکھنے کی قوت کہاں، اگر ارادہ کروں فرصت کہاں۔ قصیدہ لکھوں آپ کے پاس بھیجوں، آپ دکن کو بھیجیں، متوسّط کب پیش کرنے کا موقع پائے پیش کیے پر کیا پیش آئے۔ اِن مراحل کے طے ہونے تک میں کیوں کر جیوں گا۔"؟

یہ خط ۱۸۶۰ء کا ہے اور یہ بادی النظر میں خارج از بحث باتیں اُنھوں نے تکلّفاً ہی لکھی ہیں امر واقع یہ ہے کہ وہ ریاست حیدرآباد سے انتفاع کی برابر کوشش کرتے رہے مگر مطلب برآری نہ ہو سکی۔ حبیب اللہ ذُکا کو ایک خط میں لکھا ہے [1]

"صنعت سہل ممتنع میں، میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ بھیجا کچھ قدردانی نہ فرمائی، ردِّ فرقۂ وہابیہ میں ایک مثنوی [2] جو سابق میں لکھی تھی،

---

[1] مہر: خطوطِ غالب/۳-۴۶۲ [غالب نے مختار الملک کی مدح میں جو قصیدہ بھیجا تھا وہ کلّیاتِ نظم میں شامل ہے] (طبع سوم نولکشور ۱۹۲۴ء، صفحات ۳۲۴ و بعد) اور غالب کا دستخطی قصیدہ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے۔ اُسی میں یہ شعر ہے :

کس نیست متاع مرا خریدار | با آنکہ بہا گراں نگویم

[2] یہ کلّیاتِ نظم کی مثنوی ششم ہے (ص ۹۸)، جس کا عنوان ہے: "بیان نمودار شانِ نبوت و ولایت کہ در حقیقت پرتو نور الانوار حضرتِ اُلوہیّت است" اِس مثنوی میں ۱۲۸ اشعار ہیں۔

وہ محی الدولہ کو بھیجی، رسید بھی نہ آئی، اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید (شاگرد قتیل) وہاں کوسِ 'انا ولا غیری' بجا رہے ہیں، اور سخن ناشناسوں کو اپنا زورِ طبع دکھا رہے ہیں۔ ایک کم ستر کی عمر میری ہوئی سوائے شہرتِ خشک کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ "احسنت" و "مرحبا" کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ خیر ستایش کا حق ستایش سے ادا ہوا مختار الملک نے یہ بھی نہ کیا۔ نہ مدح کی داد دی، نہ مدح کا صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب مجھ کو کیا سمجھے۔ محی الدولہ سے اور کچھ نہیں کہتا مگر یہ کہ خدا سمجھے۔"

ان اقتباسات سے غالباً واضح ہو گیا ہو گا شہید سے غالب کی برہمی (الف) شاگرد قتیل ہونے کی بنا پر (ب) سخن ناشناسوں میں مقبول ہونے کی وجہ سے (ج) حیدرآباد میں اُن کے علی الرغم نوازے جانے کے باعث تھی۔

خیر جس زمانے کا یہ خط ہے اُس وقت تو حیدرآباد کا سلسلہ نہ تھا۔ پہلے دو اسباب ہی تھے۔ چنانچہ سرسید نے شہید کے دو شعر لکھ کر تضمین کی فرمایش کی تو اُس کے جواب میں کہتے ہیں کہ آپ کا خط آنے سے تو خوشی ہوئی مگر جس کام کا حکم دیا ہے اُس سے رنجیدہ ہوا۔ کسی شاعر کے دو ایک شعر لے کر، اُن پر دو چار شعر اپنی طرف سے ٹانک دینا کون سی شاعری و معنی پروری ہے؟ اور ہو بھی تو یہ دو شعر اس قابل ہی کہاں ہیں۔ ان میں تازی کے پُرشکوہ لفظوں کے سوا کیا ہے؟ کوئی نازک خیال، کوئی باریک نکتہ تو ہے نہیں۔ پھر یہ ایسی بحریں ہیں کہ کسی ایرانی نے اُس میں آج تک شناوری نہیں کی۔ اُن کی تضمین، خواہ وہ مسدس ہو یا ترجیع بند بس اسی کام آسکتی ہے کہ بھکاری یاد کر لیں اور درد بھری آواز سے در در گاتے پھریں اور خاتم المرسلین کا کوئی عاشق شعر سُن کر اپنا گریبان چاک کر لے۔ پھر کہتے ہیں کہ واللہ مولانا شہید نے بہت عمدہ شعر لکھے ہیں اور اُن سے بہتر لکھے نہیں جا سکتے۔ مگر یہ شاعری و معنی پروری نہیں ہے۔ مجلسِ مولود شریف میں پڑھنے کی چیز ہے۔ حضرت اشرف المرسلین علیہ السلام کی نعت میں اس فقیر نے کئی مثنویاں اور قصیدے کہے ہیں اُن میں سے ایک مثنوی نقل کر کے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ ذرا اسے ملاحظہ فرمائیے۔ مجھ سے شیوۂ معنی پروری کے خلاف

کسی قسم کے شعروں کی فرمایش نہ کیجیے۔"

اس خط کا ماخذ ایک قلمی نسخہ ہے جس میں بہارِ دانش وغیرہ متعدد کتابیں ہیں۔ یہ انجمن محمدیہ آگرہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اُسی کے ایک سادہ ورق پر کسی نے غالب کا یہ خط نقل کر دیا ہے۔ اس کی پیشانی پر ایک مہر بھی لگی ہوئی ہے جس میں (اصلح الدین، ۱۲۶۷ھ) صاف پڑھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خط غالب کی زندگی میں نقل ہوا ہے۔ فارسی متن ملاحظہ ہو:

"بنام جوادالدولہ سید احمد خاں بہادر منصف فتح پور نواب معلی القاب وسیدِ عالی جناب سلامت۔

بہ رسیدنِ منشورِ رافت نشان شادمان شدم، وازان چہ مرا بسر انجامِ آن فرمان دادہ اند عنین، یک دو بیت از دیگرے گرفتن و برآن گفتار دو چار بیت از خویش افزودن کدام آئینِ سخن وری وکدام شیوۂ معنی پروری است؟ خاصا این دو بیت کہ جز شکوہِ الفاظِ تازی ہیچ گونہ معنیِ نازک ندارد وسیما در بحرے واقع شدہ کہ ہیچ کس از ایرانیان درآن بحر غزل نگفتہ، آنچہ درین دو بیت افزایند خواہی آن را مسدس نام نہند وخواہی ترجیع بند خوانند، خاص از بہر آنست کہ گدایان یادگیرند و بر درہا باآہنگ حزین بخوانند (و) کدام عاشقِ خاتم المرسلین بسماعِ این اشعار از خود رود و گریبان درد۔ حاشا ثم حاشا مخدومی مولوی غلام امام شہید سلمہ اللہ تعالیٰ ہرچہ گفتہ اند خوش گفتہ اند وخوشتر ازین نتوان گفت۔ لیکن این شاعری وسخن وری نیست۔ چیزے دیگر ہست کہ در مجلسِ مولود شریف توان خواند۔ فقیرِ حقیر را در نعتِ اشرف المرسلین علیہ وآلہ السلام قصیدہ ہا ومثنویہا است[۱]، ازان جملہ یکے مثنوی

---

[۱] کلیاتِ نظم فارسی میں غالب کی دو نعتیہ مثنویاں ہیں۔

نقل کردہ بخدمت می فرستم، این را بنگرند و بخوانند و از بندہ اشعارے
کہ نہ شیوۂ سخن گستران باشد آرزو نکنند و بندۂ خود انگارند و بخدمت
مہین برادرِ خود سلمہ اللہ تعالیٰ سلام برسانند۔ والسلام ازاسداللہ"

(۳)

اِسی کتب خانے میں ایک مجموعہ مثنویات ہے (مد نمبر ۳۶) جس میں ۲۶ مثنویاں شامل ہیں اُن میں ساقی نامہ عزت، مثنوی ناصر علی، ساقی نامۂ الٰہی، سوز و گدازِ نوعی۔ قضا و قدر سلیم، ساقی نامۂ ملا مرشد، ساقی نامہ زکی۔ قضا و قدر حکیم رکنا مسیح، قضا و قدر سعیدائے اشرف، اور محسن فانی کی مثنوی موسیٰ و موہنی شامل ہیں۔ اِسی مجلد میں کلیاتِ نظم غالب کے کچھ اوراق ہیں یہ صاف نستعلیق میں لکھے ہوئے ہیں۔ اِس مجموعۂ مثنویات پر جا بجا مہریں بھی ثبت ہیں، ایک تو صاف پڑھی جاتی ہے جس پر دین دیال ۱۲۶۸ھ لکھا ہوا ہے۔ دوسری ہندی میں ہے۔ یہ مہر بھی دین دیال ہی کی ہے لیکن اِس کا سال ٹھیک نہیں پڑھا گیا کہ ۱۸۴۴ء ہے یا ۱۹۴۴ء۔ اس میں مجھے شک ہے۔ بہر حال اِن اوراق میں ذیل کا قطعہ بھی ملتا ہے جو مرزا سیتا بیگ کے قطعہ تاریخ وفات سے قبل درج ہے[1]:

رفت چوں مولوی حمیدالدین
زیں جہاں کز فنا عبارت اوست

از خود از دہر رفت و دہر ہنوز
پُر ز آوازۂ فضیلتِ اوست

سیّدالانبیا، شفیعش باد
کان سعیدِ ازل زعشرتِ اوست

دخل را چوں فزدِں کنی بر خُلد
سالِ فوتش ہمیں حقیقت اوست

---

[1] سیتا بیگ کی وفات کا قطعہ تاریخ کلیاتِ نظم غالب میں موجود ہے۔

داخلِ خُلد گشت پنداری
دخل در خلد سالِ رحلت اوست

رمز دریاب تا غلط نہ کنی
زان کہ تکرارِ خُلد صورتِ اوست

"خُلد خُلد" است بر لبِ غالب
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّت اوست

اِس مادۂ تاریخ سے ۱۲٦۸ھ (۱۸۵۲ء) مستنبط ہوتے ہیں۔ کلیاتِ نظم سے اس کا اخراج ظاہراً مادۂ تاریخ کے بھونڈے پن کی وجہ سے ہوا۔ غالبؔ تاریخ گوئی سے قاصر تھے اور اِس کا اُنھوں نے متعدّد مواقع پر اعترافِ کیا ہے۔ میاں داد خاں سیّاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بھائی تمھاری جان اور اپنے ایمان کی قسم کہ فنِ تاریخ گوئی و معمّا سے بے گانہ محض ہوں۔ اُردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سُنی ہو گی[1] فارسی زبان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ اُن کا حال یہ ہے کہ مادّہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے۔ جب کوئی مادّہ بناؤں گا، حساب درست نہ پاؤں گا۔ دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادۂ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈ لا دیتے۔ موزوں میں کرتا۔ اگر آپ نے مادّے کی فکر کی ہے اور یہی حسابِ جمل منظور رکھا ہے تو ایسے تعمیے اور تخرجے آ گئے ہیں کہ وہ تاریخ ہنسی کے قابل ہو گئی ہے۔ کلکتہ میں قاضی القُضاۃ سراج الدین خاں مرحوم کی قبر پر مسجد بنی ہے۔ اُن کے بھتیجے مولوی ولایت حسین

---

[1] یہ غلط ہے، یہ دیوانِ اردو نسخۂ عرشی میں اُردو کے قطعاتِ تاریخ موجود ہیں (ص ۱۲۳)۔

خاں نے استدعائے تاریخ کی۔ میں نے لکھی۔ چنانچہ وہ فارسی
دیوان میں موجود ہے:

مفتیِ عقل از پئے تاریخِ ایں بنا
ایما بسوئے من زرہِ احترام کرد

گفتم بوئے بدیہہ: "خوشا خانۂ خدا"
شُد خشمگیں دمے کہ نظر در کلام کرد

خاشاک رُفت و پائے ادب در شکنجہ ریخت
ایہام رابہ تخرجہ یعنی تمام کرد

واسطے خدا کے غور کرو۔ "خوشا خانۂ خدا" مادّہ پھر اُس میں سے
خاشاک کے عدد دُور کرو نوسو اکیس کا تخرجہ[1]، پھر بھی دو اور زیادہ ہے۔
پائے ادب یعنی ب کو اُڑایا۔ بھلا یہ بھی کوئی تاریخ ہے؟"

یہی حال مذکورہ بالا قطعۂ تاریخ کا ہے۔ مادۂ تاریخ اُن کے عجز کا شاہد ہے۔ مولوی
حمید الدین کون تھے، میں اِس کی نشان دہی سے قاصر ہوں۔ (فروری ۱۹۶۴ء)

---

[1] خاشاک کے عدد تو ۹۲۲ ہوتے ہیں۔ یہاں بھی غالبؔ نے حساب کی غلطی کردی۔

نوادرِ غالبؔ (۳)

"مطبع محمدّی محمد مرزا خاں واقع دہلی" سے ایک چھوٹا سا رسالہ "عیدی نامہ" طبع ہوا تھا۔ اُس کے صفحات کی تعداد ۲۴ ہے۔ آخر میں تاریخ طبع زاد جے چند المتخلص بہ عاصی درج ہے، خاتمہ میں "مطبع محمدّی محمد مرزا خاں واقع دہلی کوچہ چیلہ حدّ چھاونی" لکھا ہوا ہے۔ اس مختصر رسالے میں بچوّں کے لیے عیدیاں جمع کر دی ہیں۔ اِس رسالے کے صفحہ ۱۹ پر تمت کے بعد "اشعارِ متفرق" کے زیرِ عنوان غالبؔ کے قطعات و رباعیات نقل ہوئی ہیں۔ مثلاً : سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں ۔ الخ

یا ۔ بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال
ایامِ جوانی رہے ساغر کش حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
اے عمرِ گزشتہ یک قدم استقبال

تیسرا قطعہ وہ ہے جس کا آخری مصرع ہے :

روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے

چوتھا قطعہ جس کا پہلا شعر ہے :

ہے چار شنبہ آخر ماہِ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مۓ مُشکبو کی ناند

یہ بھی دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں (ص ۱۲۸ پر) موجود ہے۔

پانچویں رباعی ہے: "آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال"۔ یہ نسخۂ عرشی میں (ص ۲۵۳ پر) ملتی ہے۔ البتہ چھٹی رباعی دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں نہیں ہے۔ اس کے عنوان میں لکھا ہے:

رباعیات درمدح تعلّق نوروز"

شاہا تجھے با دولت و بختِ فیروز
فرخ ہو سدا جہاں میں جشنِ نوروز

ہووے شرف اندوز ترے طالع سے
ہر سال حمل میں مہرِ عالم افروز

یہ رباعی دیوانِ ذوق مرتّبہ محمد حسین آزاد میں بھی شامل ہے۔

اِس کے بعد اسی مجموعے میں یہ دو قطعات بھی ہیں جو اگرچہ کلامِ غالب کے ذیل میں نقل ہوئے ہیں اور ان کے عنوان میں "مرزا نوشہ" لکھا ہوا ہے، مگر میرا وجدان کہتا ہے کہ یہ مرزا غالب کے طبع زاد نہیں ہو سکتے۔

عید آئی ہے دلِ اہلِ زمانہ شاد ہے
عیش سے وابستہ ہے غم سے ہر اک آزاد ہے

عشرت و عیش و طرب چھائے ہوئے ہیں جا بجا
ہر طرف اک جشن ہے ہر سُو مبارکباد ہے

دوسرا قطعہ بسنت سے متعلّق ہے:

گلشنِ دہر میں بسنت آئی
خوب گلدستہ، خوشی لائی
گوشِ گل سوے دیدۂ بلبل
دیدۂ گلرخاں تماشائی

اس کا سالِ انطباع بے چند عاصیؔ نے خدا جانے کون سی صنعت سے برآمد کیا ہے قِطعہ،

تاریخ ساقط الوزن ہے اور اس کا آخری شعر یہ ہے :

اس عرصہ میں پکارا ہاتف غیبی معطّر ہو
سبحان اللہ ہوئے فارغ کئی تازہ گل دیریں

لاکھ سر مارا مگر کوئی تاریخ برآمد نہ ہوئی۔ میرا قیاس یہ ہے کہ رسالہ مذکور غالب کی زندگی میں چھپا ہے اور نوروز والی رباعی جو اوپر نقل ہوئی غالب ہی کی ہے جو کسی دوسرے مجموعے میں نہیں ملتی۔

اس کے بارے میں —— امتیاز علی خاں عرشی تحریر فرماتے ہیں :

"نثار صاحب کی رائے میں یہ دونوں قطعے غالب کے طبع زاد نہیں ہو سکتے، لیکن میرے نزدیک ان قطعات پر شبہ کرنا مناسب نہیں، اس لیے کہ کتاب کے مندرجات سے کسی غلط انتساب کا ثبوت نہیں ملتا اور غالب کا رنگ متعین کرنا آسان نہیں۔ اگر ہم شاہا تجھے ..... الخ والی رباعی کو کلامِ غالب مانتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ باقی ماندہ دو قطعات کو مردود و مطرود رکھا جائے۔ جیسا کہ نثار صاحب کا خیال ہے کہ کتاب غالب کی زندگی میں شائع ہو چکی تھی، اس لیے یقین ہے کہ مرتبِ کتاب نے دوسرے کے کلام کو غالب کے نام سے شائع کرنے کی جرأت نہ کی ہوگی۔" (نقوش، نومبر ۱۹۶۴ء)

اس سلسلے میں مجھے اتنا اضافہ کرنا ہے کہ یہ رباعی شاہا تجھے الخ، دیوانِ ذوق مرتبہ محمد حسین آزاد میں بھی پائی جاتی ہے۔ اب اسے غالب سے منسوب کرنے کے لیے کسی قوی تر سند کی ضرورت ہوگی۔ (مارچ ۱۹۶۳ء)

نوادرِ غالب (۴)

(تین غیر مطبوعہ فارسی خطوط اور ایک فارسی قطعۂ تہنیت)

۱. تمہید

مرزا غالب اپنی معاشی ضرورت سے والیانِ ریاست کے درباروں میں رسائی کے لیے برابر کوشش کرتے رہتے تھے اور اُن کے جو احباب مقرّبینِ بارگاہ ہوتے تھے اُن کے توسّط سے اپنی معروضات اور مدحیہ اشعار بھیجتے رہتے تھے۔ اُنھوں نے راجستھان کی ریاست ٹونک سے بھی تعلّق پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ تقریباً ۲۸۰۰ مربّع میل میں پھیلی ہوئی چھوٹی سی ریاست جو پانچ متفرّق قصبوں میں بٹی ہوئی تھی ۱۸۰۶ء میں نوّاب امیر خاں نے بزورِ شمشیر قائم کی تھی، اور اسے ۱۸۱۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک معاہدے کی رو سے تسلیم بھی کر لیا تھا۔ نواب امیر خاں سے تو غالب کا کوئی ربط قائم نہیں ہو سکا کیوں کہ وہ بزم کے نہیں رزم کے آدمی تھے اور غالب بھی اُس وقت تک شاعر کی حیثیت سے زیادہ نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ البتّہ اُن کے انتقال کے بعد ۱۸۳۴ء میں نواب وزیر محمد خاں مسند نشین ہوئے اور اُن کو مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی [۱۸۰۶ء ۱۸۳۷ء] نے بھی ایک شاہی فرمان کی رُو سے "نواب وزیر الدّولہ" خطاب عطا کیا، تو غالب نے اُن سے ربط پیدا کرنا چاہا۔ یہ ایک علم دوست فرماں روا تھے۔ مومن خاں مومنؔ نے بھی ان کی مدح میں اشعار کہے تھے۔

غالب نے ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء سے پہلے کسی وقت میر تفضّل حسین خاں کی معرفت

ایک قصیدۂ تہنیت عرفی شیرازی کی زمین میں کہہ کر بھیجا تھا جس کا مطلع ہے :

اے ذاتِ تو جامع صفتِ عدل و کرم را
اے بر شرفِ ذاتِ تو اجماعِ اُمَم را

پھر عید الاضحیٰ کے موقع پر سالانہ قصیدۂ تہنیت بھیجنے لگے۔ عید الاضحیٰ ۱۲۶۷ھ/۶ اکتوبر ۱۸۵۱ء کے موقع پر مبارک باد دیتے ہوئے اُنھوں نے ۴۵ شعروں کا جو قصیدہ (نمبر ۵ کلیاتِ نظم، ص ۶۴۵) بھیجا اُس کا مطلع تھا :

عیدِ اضحیٰ بسرِ آغازِ زمستاں آمد
وقتِ آراستنِ حجرہ و ایوان آمد

اس قصیدے کا صلہ ملنے میں تاخیر ہوئی تو ایک قطعہ (۲۷۔اشعار کا) تقاضے کا بھیجا گیا

آیا چہ بود کہ میر نوّاب	ننوشت جواب نامہ ام ہان
آن گونہ عریضۂ کہ دانی	درویش نوشتہ سوے سلطان
آن گونہ قصیدۂ کہ گوئی	از صفحہ دمیدہ سنبلستان
این ہر دو رسید، نیست پیدا	زان سو اثرے بہ ہیچ عنوان

(باغِ دودر، قطعہ ۲۲)

اس میں آگے چل کر یہ کہا ہے کہ دراصل نوّاب صاحب نے دمشق سے دیبا، روم سے مخمل، عراق سے گھوڑے، دکن سے ہاتھی، نیشاپور سے فیروزے، اور بدخشاں سے یاقوت درآمد کرنے کا حکم دیا ہوگا، اور اِن چیزوں کے آنے میں دیر ہو رہی ہے، یہ آجائیں تو مجھے عنایت فرمائی جائیں گی۔ مولانا حالی نے اِسے ہجو ملیح کی مثال میں پیش کیا ہے۔ بہرحال اِس تقاضے کے تیور بھانپ کر نواب وزیر الدّولہ نے حکم دیا کہ پانسو ۵۰۰ روپے سکّہ مادھوی مرزا کو بطورِ صلہ بھیج دیے جائیں۔ یہ روپے مرزا کو ۱۴ صفر ۱۲۶۸ھ (۹ دسمبر ۱۸۵۱ء) کو وصول ہوئے اور غالب نے اپنے خط کے ساتھ اس کی رسید بھیجی۔ سیّد منظور الحسن برکاتی کا مضمون "غالب کی ایک فیصلہ کن نادر تحریر"

(آج کل فروری ۱۹۵۵ء) اسی سے متعلق ہے اور اس کا عکس رسالہ غالب نما جے پور (۱۹۷۰ء) میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ نواب وزیر الدّولہ وزیر محمد خاں نے ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں انتقال کیا اور اُن کے بیٹے نواب محمد علی خاں مسند آرا ہوئے۔ غالب نے اُن کی مسند نشینی پر بھی نو (۹) شعروں کی ایک مثنوی بطورِ تہنیت بھیجی جس کا پہلا شعر یہ تھا:

در ین سال نوّاب عالی جناب
بروے زمیں غیرتِ آفتاب

اور آخری شعر میں مادّہ تاریخ نظم ہوا تھا:

کہ چون اخترِ نیک آمد بہ فال
ہم از "اخترِ نیک" پیداست سال

نواب محمد علی خاں بہت اولوالعزم اور جیالے فرمانروا تھے۔ انگریزوں کو خوف ہوا کہ نواب امیر خاں کی طرح یہ بھی میدانِ کارزار گرم نہ کردیں اس لیے اُنھیں ایک قتل کے مقدمے میں ملوّث کر کے معزول کر دیا۔ ریاست اُن کے بیٹے نواب ابراہیم علی خاں (۱۸۶۴۔ ۱۹۳۰ء) کو دے دی اور اُنھیں جلا وطن کر کے بنارس بھیج دیا۔ یہ باقی عمر وہیں رہے اور علمی مشاغل میں زندگی بسر کی۔ کتب خانۂ سعیدیہ ٹونک، جو اب تین حصّوں میں بٹ چکا ہے: مخطوطات کا ایک حصّہ نیشنل میوزیم نئی دہلی میں، اور دوسرا ٹونک کے عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں، اور مطبوعات کا ذخیرہ سعیدیہ ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک میں پایا جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر نواب محمد علی خاں ہی نے بنارس میں اپنے قیام کے دوران جمع کیا تھا۔ سیّد نجف علی جھجری جنھوں نے معرکۂ قاطع برہان کے سلسلے میں اور غالب کی حمایت میں کتاب دافعِ ہذیان (اکمل المطابع دہلی ۱۲۸۱ھ) لکھی تھی، بنارس میں نواب محمد علی خاں کے ساتھ تھے۔

۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء میں مرزا غالب نے طالع یار خاں کے توسّط سے اپنی کتاب مہرِ نیم روز کا ایک نسخہ نواب وزیر الدّولہ کی خدمت میں بھیجا تھا جو ۲۷ جمادی الثّانیہ

۱۲۷۱ھ (۷؍ مارچ ۱۸۵۵ء) کو کتب خانے میں داخل کیا گیا تھا۔ اس نسخے کی تفصیلات سیّد جمیل الدین نے نوائے ادب بمبئی (جولائی ۱۹۵۱ء۔ جنوری ۱۹۵۲ء) میں شائع کر دی تھیں۔ اسی طرح غالب نے ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) میں اپنی تصنیف دستنبو کا ایک نسخہ نواب وزیر الدّولہ کی نذر کیا اور اُس پر اپنے قلم سے یہ اشعار لکھے :

نذر نواب وزیر الدّولہ — آن محیطِ کرم و دانش و داد
ہم بدین حیلہ مگر یاد آید — غالبِ خستہ کہ رفت ست ز یاد

اس نسخے کا تعارف بھی سیّد جمیل الدین شائع کرا چکے ہیں [نوائے ادب جولائی۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء]

یہاں مرزا غالب کے تین غیر مطبوعہ فارسی خطوط کا متن پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ تینوں خطوط نواب وزیر الدّولہ کے نام ہیں ——— ایک قطعۂ تہنیت فارسی میں بھی ہے جو اُنھوں نے عید الاضحیٰ کی مبارک باد کے طور پر بھیجا تھا۔ یہ سب ریاست ٹونک کے "منشی خانہ" میں محفوظ تھے، جو اب راجستھان اسٹیٹ آرکائوز میں ضم ہو چکا ہے۔ مجھے اِن خطوط کے عکس مولانا محمد عمران خاں صاحب ٹونکی مرحوم کی عنایت سے دستیاب ہوئے تھے۔ اُن کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

۲۔ خطوط کا فارسی متن

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا

بہ موقف عرضِ باریافتگانِ بزمِ حضورِ موفور السّرور نوّاب قدسی القاب عظیم الشان رفیع المکان ولیِ نعمت، آیۂ رحمت، قبلۂ دنیا و دین حضرت امیر المؤمنین دامَ اقبالہ وزادَ افضالہٗ می رساند کہ عریضہ نگار اگرچہ بحسبِ صورت از دور ماندگانِ نظرگاہِ قربت است، امّا از روے معنی وابستۂ دامان آن دولتِ ابد مدّت است. ہماں ثنا گستری راکہ در آن حضرت شرفِ قبول یافتہ، و منظورِ نظرِ کیمیا اثر اُفتادہ، ذریعۂ روشناسی می انگارد. ہمانا بدعوی گاہ استحقاقِ رافت وارزشِ عطوفت دست آویزے شگرف بکف دارد. دریں ہنگام کہ خان صاحب مشفق و مہربان طالع یارخاں و سعادت واقبال نشاں اصغر یارخاں از اسلام آباد ٹونک بدین دیار آمدند، مسوّدہ بزبانِ اردو بمن نمودند و فرمودند کہ خاطرِ آسمان پیوند والا خداوند بدان گرایش دارد کہ این عبارت از ہندی بفارسی نقل کردہ شود، تا دل نشین نسخہ، سرانجام یافتہ باشد. ازان جاکہ حق پرستی و حق گزاری آئین، و رعایتِ حقوق خداوندانِ نعمت از ضروریاتِ دین است،

پیوستہ در بندِ آں بودمے کہ اگر تقریبے دست بہم دہد، خدمتے بجا آرم تا نوازش و بخششِ آں حضرت را باندازۂ طاقتِ خویشتن تلافی کردہ باشم. چوں از میامنِ حسنِ اتّفاق ایں خجستہ تقریب پدید آمد، بہ سرانجام کار و آرایشِ گفتار ہمّت گماشتم و دعا و ثنائے کہ مکنونِ ضمیر بود در ضمنِ آن نگارش بہ تقدیم رساندم. ہرچند متاع اندک است، و ہدیہ مُحَقَّر، لیکن چون من شنوم کہ خلیفہ از اعرابی آبِ شور بہ ارمغان پزیرفت، و سلیمان پائے ملخ از مور. دل را بہ نویدِ قبول شاد میکنم. آفریدگار زبان مرا از گزاف نگہ دارد، واز حق امیدوارم کہ جُز حقّ در ضمیرِ من نگزرد. حق اینست کہ ہم بہ استماعِ محامدے کہ از مشفقی طالع یار خاں خصوصاً و از دیگران عموماً می شنوم و ہم بمشاہدۂ التفاتے کہ دربارۂ من بظہور آمدہ است حیف می خورم کہ در عہدِ فرمانروائی لارڈ الّن برا بہادر سواد شہر دہلی مخیم سرادقِ جاہ و جلال شد و این سوختہ اختر توفیقِ قدم بوس نیافت. اکنون بر آن سرم کہ اگر مرگ امان دہد و تاب و طاقت ہمرہی کند ازین شہر بہ نیّت ہجرت نقل کردہ، مشتِ استخوان خود را بدان درگاہ کہ کعبۂ آمالِ درویشانِ بے دستگاہ است، رسانم و بقیۂ عمر در خدمتِ حضرت امیرالمومنین بسر برم.

نیّر دولت و اقبال سرچشمۂ فروغِ جاودانی باد.

عرضداشت اسداللہ. معروضہ چارم ذی الحجہ ۱۲۶۴ ہجری

مہر

اللہ
محمد
اسد خاں

(۲)

عرضداشت ہوا خواہ اسداللہ بحضورِ فیض گنجور جناب مستطاب ہمایون القاب قبلۂ دنیا و دین، حضرتِ امیرالمؤمنین دام اقبالہ مبنی بران مایۂ نیایش کہ مریدان بجا توانند آورد، و متضمن آن قدر ستایش کہ سخنوران را در اندیشہ تواند گزشت، ہمانا خود را از دیر باز بدامن آن دولتِ جاوید طراز بستہ، ازانجا کہ بکار دیگر نیایم و خدمتے شایستہ سرانجام نتوانم داد، بر ثنا خوانی و دعاگوئی قناعت ورزیدہ باخود آن قرار دادہ ام کہ ہر سال بتقریب تہنیت عیدِ اضحیٰ سواد ستایشے از جانبِ من روشناسِ نگاہ التفات می شدہ باشد چنانکہ سال گزشتہ قصیدہ کہ بیتِ اسم در آن نگارش اینست :

صورتِ معنیِ اسلام وزیرالدّولہ
کہ دلش آینۂ صورتِ ایمان آمد

رواں داشتہ ام و امسال ایں قطعہ رواں می دارم. زیادہ حدِ ادب نیّر اقبال در درخشندگی با مہرِ جہاں تاب توأم باد.

معروضہ بیستم ذی قعدہ ۱۲۶۹ ہجری

مہر

نجم الدّولہ دبیر الملک
اسد اللہ خاں بہادر
نظام جنگ

(۳) قطعۂ تہنیت

اے کہ برنامِ توصدرہ جم و قیصر صد بار
عرضہ دربارۂ کم ساختنِ باج نوشت
در کفِ فیض، قلم را علمِ فتح شمرد
بر سرِ بخت، کُلہ را گہرین تاج نوشت
خمِ ابروے ترا، چرخ مہِ نو دانست
روزِ بدخواہِ تُرا، دہر شبِ داج نوشت
آں دقائق کہ بود در گروِ سہمُ الغیب
قلمِ تیرِ تو، بر صفحۂ آماج نوشت
تو نرفتی و بنامِ تو خداوندِ کریم
رقم قافلہ سالاریِ حُجّاج نوشت
کاتبِ دہر بسرمایۂ عمرِ تو فزُود
ہرچہ در زایچۂ خضر بہ ہَیلاج نوشت
باد فرخندہ و فرّخ بتو عیدِ اضحیٰ
وانگہ این قطعہ کہ این بندۂ محتاج نوشت

(۴)

بحضور مکرمت ظہور جناب مستطاب نواب صاحب قبلۂ و کعبۂ دو جہان قلزم فیض و عمّانِ احسان دام اقبالہ.

عرضداشت ہوا خواہ اسد اللہ.

ہمانا مقصودِ عریضہ نگار از ہر گونہ نظم و نثر جز ستایش و نیایش نیست، یا رب آن روزِ دل افروز فراز آید کہ دیدہ بدان کف پاے عرش آساے روشناس گردد و کارِ خامہ از زبان گرفتہ شود، اگر روزگار مساعدت اسباب دریغ نداشت درین زمستان احرام طوافِ کعبۂ مقصود خواہم بست، یعنی زحمتِ آستان نشینان خواہم داد. مرحومی میر تفضّل حسین خاں را از کجا آرم کہ ہم نیایشِ نامۂ مرا از نظرِ انور گزرانَد و ہم منشورِ کرامت و توقیعِ خوشنودیِ خداوند بمن باز رساند- دانم کہ "تا خود بہ ہمایون خدمت نرسم کارِ من چنانکہ من میخواہم روائی نخواہد پزیرفت. درین بارلختی بزبان مجموعۂ دانش و داد شیخ الٰہ داد حوالت رفتہ است امیّد کہ بسمعِ رضا اِصغا فرمودہ آید، زیادہ حدِّ ادب بہار دولت و اقبال جاودان و بہارستانِ جاہ و جلال بے خزان باد.

معروضۂ یکم محرم ۱۲۷۱ ہجری

مہر

نجم الدولہ دبیر الملک
اسد اللہ خاں بہادر
نظام جنگ

۳:۱ اردو ترجمہ

اللہ کی حمد اور رسولؐ پر درود کے بعد

نواب قُدسی القاب، عظیم الشان، رفیع المکان، ولی نعمت، آیۂ رحمت، قبلۂ دنیا و دین حضرت امیر المؤمنین دام اقبالہ و زاد افضالہ کی (خوشیوں بھری بزم کے باریابوں) کی خدمت میں عرض ہے کہ عریضہ نگار اگرچہ بظاہر نظرگاہِ قربت سے دُور پڑے ہوؤں میں سے ہے، لیکن بباطن دامانِ دولت ابد مدّت سے وابستہ ہے، اور اس قصیدہ نگاری کو جو آں حضرت کی نظر سے گزرتی ہے اور شرفِ قبول پاتی ہے اپنے تعارف کا ذریعہ اور آپ کی رافت و رحمت کے استحقاق کی دستاویز سمجھتا ہے۔

اِس زمانے میں جب خاں صاحب مشفق و مہربان طالع یار خاں اور سعادت و اقبال نشان اصغر یار خاں اسلام آباد ٹونک سے اِس شہر میں آئے تو اُنھوں نے اردو زبان میں ایک مسوّدہ مجھے دکھایا اور فرمایا کہ خداوند کی خاطرِ آسمان پیوند اِس طرف مائل ہے کہ اِس عبارت کو ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا جائے تاکہ دل نشین عبارت میں ایک نسخہ تیّار ہو جائے۔

چوں کہ حق پرستی و حق گزاری میرا آئین اور خداوند نعمت کے حقوق کی رعایت منجملۂ ضروریاتِ دین ہے، مسلسل اِس فکر میں تھا کہ کوئی تقریب ہاتھ آئے تو کچھ خدمت انجام دوں تاکہ آں حضرت کی نوازش و بخشش کی اپنے مقدور بھر کچھ تلافی کر سکوں۔ چوں کہ

حسنِ اتّفاق سے یہ تقریب نکل آئی ہے، میں نے عبارت آرائی کر کے اسے انجام دینے کی ہمّت کرلی اور جو دعا و ثنا ضمیر میں پوشیدہ تھی اسے بھی اس نگارش کے ضمن میں بطور مقدّمہ لکھ دیا۔ ہر چند یہ ایک متاعِ قلیل اور ہدیۂ حقیر ہے، مگر جب سنتا ہوں کہ خلیفہ نے ایک بُدّو سے کھاری پانی کا ہدیہ اور سلیمانؑ نے چیونٹی سے ٹِڈّی کی ٹانگ کا تحفہ قبول کیا تھا تو میں بھی اپنے دل کو نویدِ قبول سے شاد کرلیتا ہوں۔ خدا میری زبان کو ڈینگ مارنے سے بچائے اور حق سے امیّد وار ہوں کہ سوائے حق کے میرے ضمیر میں کچھ نہ گزرے۔ حق یہ ہے کہ آپ کے محامد مشفقی طالع یار خاں سے خصوصاً اور دوسروں سے عموماً سنتا ہوں اور میرے حال پر آپ نے جو التفات فرمایا ہے اُس کے مشاہدے کے بعد یہ افسوس ہوتا ہے کہ لارڈ الن برا کی فرمانروائی کے زمانے میں جب شہر دہلی آپ کے جاہ و جلال کا خیمہ گاہ بنا تھا تو اِس سوختہ اختر کو قدم بوسی کی توفیق نہ ہوئی۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر موت نے مہلت دی اور تاب و طاقت نے ساتھ دیا تو اس شہر سے ہجرت کی نیّت سے نکلوں اور اپنی مٹھّی بھر ہڈّیوں کو اُس درگاہ میں جو بے دستگاہ درویشوں کی امیّدوں کا کعبہ ہے پہنچادوں اور باقی عمر حضرت امیر المؤمنین کی خدمت میں بسر کروں۔

خدا کرے نیّرِ دولت و اقبال سرچشمۂ فروغِ جاودانی رہے۔

عرضداشت اسد اللہ۔ معروضۂ چہارم ذی الحجّہ ۱۲۶۴ ہجری

مہر

۲:۳

عرضداشت ہوا خواہ اسداللہ بحضور فیض گنجور جناب مستطاب ہمایوں القاب قبلۂ دنیا و دین حضرت امیرالمؤمنین دام اقبالہ۔

اُس نیازمندی کی بِنا پر جو مرید بجا لاسکتے ہیں اور اُس ستایش کے ضمن میں جو شاعروں کے اندیشے میں گزر سکتی ہے، میں نے خود کو ایک مدّت سے اس دولت جاوید طراز کے دامن سے وابستہ کر رکھا ہے۔ چوں کہ کسی اور مصرف کا نہیں ہوں اور کوئی ڈھنگ کی خدمت انجام نہیں دے سکتا، اس لیے ثنا خوانی اور دعا گوئی پر قناعت کر کے اپنے اوپر یہ لازم کرلیا ہے کہ ہر سال عیدِ اضحیٰ کے موقعے پر مبارک باد کی ایک تحریر اِس روشنا سِ نگاہِ التفات کی جانب سے ہوا کرے جیسا کہ سالِ گزشتہ ایک قصیدہ جس کی بیتِ اسم یہ ہے:

صورتِ معنی اسلام وزیرالدّولہ
کہ دلش آئینہ صورتِ ایماں آمد

بھیجا ہے اور اس سال یہ قطعہ روانہ کر رہا ہوں۔ زیادہ حدّ ادب۔ الٰہی نیّرِ اقبال مہر جہاں تاب کی طرح چمکتا رہے۔

معروضہ بیستم ذی قعدہ ۱۲۶۹ ہجری

مہر

۳:۳ تہنیت کے اشعار کا ترجمہ

۱. اے وہ کہ جمشید و کسریٰ نے تجھے سو بار سو سو طرح سے اپنی درخواست بھیجی ہے کہ اُن کے باج کی رقم کچھ کم کر دی جائے۔

۲. فیض تیرے ہاتھ میں قلم کو فتح کا علم سمجھتا ہے اور بخت تیری کلاہ کو گوہریں تاج لکھتا ہے۔

۳. آسمان تیرے خمِ ابرو کو مہِ نو جانتا ہے اور تیرے بدخواہ کے دن کو بھی زمانہ سیاہ رات لکھتا ہے۔

۴. وہ اسرار (قضا) جو غیبی تیر میں پوشیدہ ہوتے ہیں انھیں تیرے قلمِ تیر نے چاندماری کے کھلے صفحے پر لکھ رکھا ہے۔

۵. اگرچہ تو گیا نہیں مگر خداوند کریم نے قافلۂ حجّاج کی امارت تیرے نام میں لکھ دی۔

۶. زمانے کے کاتب نے وہ سب تیرے سرمایۂ عمر میں جوڑ دیا ہے جو خضر کے جنم پتڑے میں اُن کی عمر کے بارے میں لکھا تھا۔

۷. تجھے عیدِ سعیدِ قرباں مبارک ہو اور یہ قطعۂ تہنیت بھی جو اس بندۂ محتاج نے لکھا ہے۔

۳ : ۴

عرضداشت ہوا خواہ اسداللہ بحضور مکرمت ظہور جناب مستطاب نواب صاحب قبلہ و کعبہ دو جہان قلزم فیض عمّان احسان دام اقبالہ۔

چوں کہ یہ عریضہ نگار ہر طرح کی نظم و نثر سے سوائے تعریف اور اظہار نیازمندی کے کچھ اور غرض نہیں رکھتا ہے۔ خدا کرے وہ دل افروز دن بھی نکلے جب یہ آنکھیں اُن عرش پیما قدموں سے روشناس ہوں اور قلم کا کام زبان سے لیا جائے۔ اگر زمانے نے مساعدت کے اسباب سے دریغ نہ کیا تو اب کی جاڑوں میں اس کعبہ مقصود کے طواف کا احرام باندھوں گا یعنی آپ کے آستانے پر پہنچوں گا۔

مرحومی میر تفضّل حسین خاں کو کہاں سے لاؤں جو میرے نیاز نامہ کو نظر انور سے گذاریں اور خداوند کا فرمان و پروانۂ خوشنودی میرے پاس بھیجیں۔ جانتا ہوں کہ جب تک خود خدمت مبارکہ میں نہ پہنچوں گا میرا کام حسب دل خواہ نہ ہوگا۔ اس بار مجموعۂ دانش و داد شیخ اللہ داد سے کچھ زبانی عرض کیا ہے، امیّد ہے کہ آپ شرف سماعت بخشیں گے۔ زیادہ حدّ ادب۔ الٰہی بہار دولت و اقبال جاوداں اور بہارستان جاہ و جلال بے خزاں رہے۔

معروضہ یکم محرّم ۱۲۷۱ ہجری

مہر

ماده [illegible]

به توصیف عرض ارباب فضایل [illegible] القاب عظیم الشان رفیع المکان

ولی نعمت آیهٔ رحمت قبلهٔ دنیا و دین حضرت امیرالمؤمنین دام اقباله و زاد افضاله [illegible]

[illegible] اگرچه [illegible] از [illegible] زمان [illegible] اما از [illegible]

دامان آن دولت [illegible] آنحضرت [illegible] قبول یافته و منظور نظر [illegible]

[illegible] روشناسی [illegible] استحقاق [illegible] و ارزش [illegible] آمیز [illegible]

[illegible] در [illegible] هنگام [illegible] طالع [illegible] زمان و سعادت [illegible]

[illegible] اسلام [illegible] که [illegible] آمده [illegible] در زمان [illegible] نموده [illegible] خاطر

[illegible] خداوند [illegible] گرایش [illegible] از [illegible] نقل کرده شود [illegible]

[illegible] انجام یافته [illegible] از آنجا [illegible] حق پرستی و حق گزاری [illegible] و [illegible] حقوق خداوندان نعمت

از [illegible] پیوسته در بند آن بوده [illegible] اگر [illegible] دست [illegible]

نوازش و بخشش آنحضرت [illegible] به اندازهٔ طاقت خویشتن [illegible] کرده [illegible] چون [illegible] حسن اتفاق [illegible]

[illegible] تقریب [illegible] به انجام کار و آرایش گفتار [illegible] گماشتم و [illegible] هم [illegible] بود [illegible]

آن نگارش [illegible] به [illegible] چون [illegible] شایع [illegible] لیکن چون [illegible]

به [illegible] پذیرفت [illegible] از [illegible] دل [illegible] قبول [illegible] آخر [illegible] زمان [illegible]

گزاف [illegible] و از حق امید دارم [illegible] حق در [illegible] حق [illegible] هم [illegible]

[illegible] طالع [illegible] و از دیگران [illegible] هم [illegible]

[illegible] در عهد فرمانروا [illegible] تا [illegible] جاه و جلال [illegible]

[illegible] اکنون [illegible] اگر [illegible]

از این [illegible] نقل کرده [illegible] در درگاه [illegible] آنحضرت [illegible]

[illegible] در خدمت حضرت امیرالمؤمنین [illegible] آفتاب [illegible] فروغ جاودانی

[illegible] تا [illegible] هجری

[illegible]

دام مجده

المخلص ... الرحمن

حضرت قبله دنیا و دین جناب مستطاب ... فیض گنجور ... اسعد ... مرشد

مبنی بر آن پایه نیایش که مرد این بجا توانند آورد و متعلق آن قدر ستایش که سخنوران ندارند
در اندیشه تواند گذشت همانا خود را از دیرباز بجا من آن حضرت طلب بطراز بسته
از انجا که بکار دگر نیایم و خدمتی شایسته سرانجام نتوانم داد جز تهنیت خوانی و دعاگوئی
فرصت و در زمره اخوند آن قرار داده ام که هر سال تهنیت عید اضحی سواد ستایشی
از جانب من روشناس نگاه التفات میشده باشد چنانکه سال گذشته قصیده که در آن ... اسم
در آن نگارش یافته سه مرتبه معز اسلام وزیر الدوله ... آن صورت ... ابهام
روان داشته بودم و امسال این قطعه نوا میدارم نتیجه ادب نیر اقبال در خشندگی
با همه جهانیان توام باد حرره ... ذیقعده سنه ۱۲۹۹ هجری

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تو نرفتی و بنام تو خداوند کریم
رقم قافله سالاری حجاج نوشت

کاتب [illegible] سرمایه عمر تو فزود
همه چیز را بجز خضر به منهاج تو [illegible]

از قضا [illegible] منحنی
والحق این قطعه که [illegible] تو [illegible]

هو

بجمع ۱۸

[illegible]

[illegible]

بحضور کرامت ظهور جناب مستطاب نواب [illegible] دام اقباله

ورقه انشاء جواب [illegible]

همانا مقصود هر خامه نگار از هرگونه نظم و نثر جز ستایش و نیایش نیست یاربا آن روز دل افروز فراز آید
که دیده بدان لعل پارسی [illegible] بهار روز بشناس گردد و کار خامه از زبان گرفته شود اگر روزگار مساعدت اصحاب
دریغ نداشت درین زمستان احرام طواف کعبه مقصود خواهم بست یعنی زحمت آستان نشینان خواهم داد
مرحومی میر تفضل حسین خان را از کجا آرم که هم نیازنامه مرا از نظر انور گذراند و هم منشور [illegible]
توقیع خشنودی خداوند بمن باز رساند. دانم که تا خود به همایون خدمت نرسم کار من چنانکه من
بخواهم روا نخواهد پذیرفت درین بار لختی بزبان مجموعه دانش و داد شیخ الله داد مودت
رفته است. امید که بسمع رضا اصغا فرموده آید زیاده حد ادب بهار دولت و اقبال جاودان زود
بهارستان جاه و جلال بلند آوازه باد سحرگاه یکم محرم [illegible]

۴۔ حواشی

۱۔ نواب وزیرالدّولہ کا پورا خطاب "وزیرالدّولہ امیرالملک نواب محمد وزیر خان بہادر نصرت جنگ" ہے اور اکبر شاہ ثانی نے جس فرمان کی رو سے یہ خطاب مرحمت کیا تھا وہ اب ادارہ تحقیقات عربی و فارسی ٹونک میں محفوظ ہے۔

۲۔ میر تفضّل حسین خاں مرزا غالب کے گہرے دوست تھے، اُن کا مولد خیر آباد تھا۔ دہلی میں تعلیم حاصل کی اور ٹونک جا کر نواب وزیرالدّولہ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ انھوں نے ریاست کی طرف سے سفیر بنا کر جنرل اوکٹرلونی کے پاس اجمیر بھیج دیا تھا۔ ان کے بھائی ارشاد حسین خاں بھی ٹونک میں وکیل تھے۔ میر تفضّل حسین خاں کے توسّط سے غالب نے ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء میں ایک قصیدہ عرفی شیرازی کی زمین میں لکھ کر نواب وزیرالدّولہ کی خدمت میں بھجوایا تھا، اس پر نواب صاحب کی طرف سے صلہ ملنے میں دیر ہوئی اور غالب اپنا فارسی دیوان مطبع دارالسّلام سے چھپوانے والے تھے۔ اُنھوں نے میر تفضّل حسین خاں کو لکھا:

> "نواب ٹونک نے مجھ کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور میری مدح گوئی کو نگاہ میں نہیں لائے، اس لیے میں نے طے کر لیا ہے کہ میں بھی بے حوصلگی سے کام لوں اور یہ قصیدہ
>
> اے ذات تو جامع صفت عدل و کرم را
>
> وے بر شرفِ ذاتِ تو اجماع اُمم را
>
> قلم زد کر دوں، دیوان میں درج نہ کروں۔ نواب نے میرا نام اپنے دربار

ہیں پسند نہیں کیا، ہیں بھی نواب کا نام اپنے دیوان میں درج کرنا پسند نہیں کروں گا۔"

بعض حضرات کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ تفضّل حسین خاں کی زندگی میں غالب کو ریاست ٹونک سے صلہ نہیں ملا۔ انھیں ۱۴ر صفر ۱۲۶۸ھ (۹ر دسمبر ۱۸۵۱ء) کو پانسو روپے[۵] وصول ہوئے تھے۔
میر تفضّل حسین خاں کا انتقال ۱۲۷۰ھ (۵۴-۱۸۵۳ء) میں ہوا۔ غالب نے ہرگوپال تفتہ کے نام اپنے خط میں اس حادثے پر رنج وغم کا اظہار کیا ہے (۲۲ر فروری ۱۸۵۴ء) اور ان کا قطعۂ تاریخِ وفات بھی لکھا تھا جو کلّیات نظم فارسی میں موجود ہے۔

احمد حسین رسوا ان کے صاحبزادے بھی سفیر ریاست مقرّر ہو گئے تھے۔ مشہور شاعر افتخار حسین مضطر خیرآبادی اُن کے بیٹے اور جاں نثار اختر پوتے تھے۔ تفضّل حسین خاں کے نام غالب کے خطوط سبدِ باغِ دو در (مرتبہ: وزیر الحسن عابدی) میں شامل ہیں جن کا اُردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے (تحریک دہلی، اپریل ۱۹۷۴ء)۔ مزید تفصیلات کے لیے رجوع کیجیے:

عبدالرؤف عروج — بزمِ غالب ۱۱۷-۱۱۹

منظور الحسن برکاتی — غالب کی ایک نادر فیصلہ کن تحریر، آج کل، دہلی، جون ۱۹۵۵ء

" " — غالب کا ایک باکمال دوست — میر تفضل حسین خاں شاعر، بمبئی، فروری-مارچ ۱۹۶۹ء

وزیر الحسن عابدی (مرتّب) — سبدِ باغِ دو در لاہور

۳- طالع یار خاں اور اصغر یار خاں:

ان کے والد کا نام "بزمِ غالب" (ص ۲۵۳-۲۵۴) میں نواب محمد یوسف خاں دیا گیا ہے۔ مجھے اُن کے اخلاف سے جو شجرہ ملا ہے، اس کی رو سے ان کے والد نواب محمد سعید خاں تھے۔ ممکن ہے نواب محمد یوسف خاں عرف کلّو خواص (جن کے نام سے ایک گلی حویلی کلّو خواص آج بھی بازار چتلی قبر سے سوئی والوں کی طرف جاتے ہوئے داہنے ہاتھ پر موجود ہے۔) نواب محمد سعید خاں کے والد ہوں۔ "بزمِ غالب" میں انھیں حمیدالدین ناگوری کی اولاد بتایا ہے جن

کا ایک قلمی رسالہ درفنِ کیمیا سازی ٹونک کے کُتب خانے میں ملتا ہے اور یہ بظاہر حمید الدین ناگوری (خلیفہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ) اور قاضی حمید الدین ناگوری سہروردی (متوفی رمضان ۶۴۳ھ) سے مختلف شخصیت معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر شیخ فاروقی اور ثانی الذکر شیخ صدّیقی تھے۔

طالع یار خاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ریاست ٹونک میں ملازم ہوئے تو وہاں رہنے کے لیے ایک حویلی اور وزیر پورہ کا علاقہ جاگیر میں دیا گیا تھا جس کے کاغذات بیکانیر آرکائوز میں موجود ہیں۔ مولانا محمد عمران خاں صاحب ٹونکی کی تحقیق کے مطابق یہ ۱۸۳۴ء کے بعد ٹونک آئے ہوں گے لیکن اگر یہ ۱۸۲۳ء میں نواب محمد وزیر خاں کو فنونِ سپہ گری سکھانے پر مامور ہوئے تھے تو اُس وقت نواب صاحب دہلی میں ہوں گے۔ انھوں نے فنِ بانک پر ایک رسالہ اُردو زبان میں لکھا تھا اور اس کو نواب وزیر الدّولہ کی فرمائش پر فارسی میں مرزا غالب سے ترجمہ کرانا چاہتے تھے۔ غالب نے یہ ترجمہ مکمّل کر دیا تھا مگر وہ ابھی تک دستیاب نہیں ہے۔

طالع یار خاں کے دو بیٹے صفدر یار خاں اور اصغر یار خاں اور چار بیٹیاں تھیں۔ صفدر یار خاں کا نام بعض جگہ غلطی سے اسفند یار خاں لکھا گیا ہے۔ (مثلاً مولانا عمران خاں کا مضمون "غالب کا ٹونک سے تعلّق" تحریک دہلی، ستمبر ۱۹۷۴ء)۔

غالب کے ایک خط سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صفدر یار خاں اور اصغر یار خاں ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے ٹونک سے رخصت لے کر دہلی آئے تھے کہ یہاں ہنگامہ شروع ہو گیا اور یہ واپس نہیں جا سکے۔ فتح دہلی کے بعد دار و گیر شروع ہوئی تو دونوں بے گناہ پکڑے گئے اور پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔

> "ان (طالع یار خاں) کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے۔ غدر کے سبب نہیں جا سکے۔ یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں، پر یقین ہے کہ مردہ سے بدتر ہوں گے۔"
>
> (عودِ ہندی بنام انوار الدّولہ شفق)

لیکن غالب نے مصلحتاً حقیقت کو چھپایا ہے۔ بغاوت کا اعلان ہونے پر یہ دونوں جنگ آزادی

میں حصّہ لینے کو دہلی آئے تھے، اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ اصغر یار خاں نے ایک انگریز کو گولی مار کر ہلاک بھی کر دیا تھا۔ بعد فتح دہلی دونوں بھائی فرار ہو کر ٹونک جا رہے تھے مگر الور میں گرفتار کر لیے گئے اور دہلی لا کر انھیں پھانسی پر چڑھا دیا گیا (ابوالفیض عثمانی، تاریخ ۱۸۵۷ء کی ترتیب میں خطوطِ غالب کی اہمیت۔ بشارت جے پور، یکم و ۱۵/ اگست ۱۹۷۲ء)۔ نواب وزیر الدّولہ کے انتقال (۱۸۶۴ء) کے بعد طالع یار خاں بھوپال چلے گئے تھے اور غالباً وہیں انتقال ہوا۔

صفدر یار خاں کے تین بیٹے تھے: سکندر یار خاں، افضل یار خاں اور محمد یار خاں۔ ان میں افضل یار خاں سے نسل چلی جن کے دو بیٹے احمد یار خاں اور سلطان یار خاں اور تین بیٹیاں (محمّدی، محمودہ، مقصودہ) ہوئیں۔ افضل یار خاں کی شادی سیّد شیر زماں خاں کی صاحبزادی ملکہ بیگم سے ہوئی تھی۔ شیر زماں خاں کے دو بیٹے سیّد احمد اور سیّد محمد تھے۔ بیگم عابدہ احمد (ممبر پارلیمنٹ و چیرمین غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی) موخر الذّکر کی نواسی ہیں۔ ان کی رشتے داریاں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان میں بھی تھیں۔ ملکہ بیگم حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ کو "ماموں" کہا کرتی تھیں۔

نواب طالع یار خاں کے نواسوں میں دہلی کالج کے سابق پرنسپل مرزا محمود بیگ مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری ایم۔ این مسعود بھی تھے۔ شجرۂ خاندان جو مجھے نواب طالع یار خاں کے پرپوتے سلطان یار خاں (ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا) سے ملا ہے، یوں ہے:

نواب سعید خاں

↓

نواب طالع یار خاں (متوفّی ۱۸۶۴ء)

صفدر یار خاں (۱۸۵۸ء) | اصغر یار خاں (۱۸۵۸ء) | دختر ۴

سکندر یار خاں (لاولد) | افضل یار خاں | محمد یار خاں (مجرّد)

احمد یار خاں | سلطان یار خاں | محمّدی | محمودہ | مقصودہ

۴۔ لارڈ ایلن برا : یہ ۱۸۴۲ء میں لارڈ آکلینڈ کی جگہ گورنر جنرل ہو کر آئے تھے۔ اِن کی مدح میں غالب نے ۴۰ اشعار کا ایک قصیدہ کہہ کر سیّد الاخبار دہلی میں چھپوایا تھا جس کا مطلع ہے :

اے برتر از سپہرِ بلند آستانِ تو
تو پاسبانِ مُلک، و مُلک پاسبانِ تو

ایلن برا نے سرکار انگریزی سے غالب کو خلعت ہفت پارچہ بھی دلایا تھا اور ان کے توسّط سے غالب نے ایک (۷۷) اشعار کا قصیدہ ملکہ وکٹوریا کی مدح میں لکھ کر انگلستان بھی بھیجا تھا جو ملکہ کے سامنے پیش بھی ہو گیا تھا۔ ان کا گورنر جنرلی کا دَور بہت مختصر رہا۔ ۱۸۴۴ء میں یہ انگلستان واپس ہو گئے تھے۔

۵۔ شیخ اللہ داد کے بارے میں سر دست کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ بظاہر یہ نواب وزیرالدولہ کے متوسّلین میں سے تھے۔ خط نمبر ۳ پر صاد کا نشان نواب وزیرالدّولہ کے قلم سے ہے اور نیچے لکھا ہے :

"حکم شد کہ از شیخ اللہ داد حال عارض دریافتہ بحضور گذارش نمودہ شود۔
فقط۔ تحریر بتاریخ بست و ششم ماہِ صفر ۱۲۷۱ھ۔"

مراجع :

ریاست ٹونک سے مرزا غالب کے تعلّقات کے سلسلے میں مندرجۂ ذیل مضامین ملاحظہ ہوں :

۱. سیّد جمیل الدین — مہر نیم روز کا ایک خاص نسخہ۔ نوائے ادب، بمبئی جولائی ۱۹۵۱ء۔ جنوری ۱۹۵۲ء

۲. جوہر ٹونکی — غالب اور ٹونک۔ نگار لکھنؤ، ستمبر ۱۹۵۱ء

۳. منظور الحسن برکاتی — یادِ غالب۔ آج کل، دہلی، فروری ۱۹۵۲ء

۴. 〃 〃 〃 — غالب کی ایک نادر فیصلہ کن تحریر۔ آج کل، جون ۱۹۵۵ء

۵. سیّد جمیل الدین — دستنبو کا ایک خاص نسخہ۔ نوائے ادب، بمبئی، اکتوبر ۱۹۵۶ء

۶۔ سیّد قدرت نقوی — غالب اور ٹونک ۔ ماہِ نو کراچی ۔ فروری ۱۹۵۸ء

۷۔ منظور الحسن برکاتی — غالب کے دوست ۔ آج کل دہلی، فروری ۱۹۵۸ء

۸۔ 〃 〃 〃 — غالب اور ٹونک ۔ "غالب نما" جے پور ۱۹۷۰ء

۹۔ محمد عمران خاں — غالب کا ٹونک سے تعلق ۔ تحریک دہلی، ستمبر ۱۹۷۴ء

۱۰۔ ابوالفیض عثمانی — راجستھان سے مرزا غالب کا تعلق ۔ نخلستان، اکتوبر ۱۹۷۵ء

۱۱۔ منظور الحسن برکاتی — غالب کا ایک باکمال دوست ۔ "شاعر" بمبئی، فروری ۔ مارچ ۱۹۶۹ء

۱۲۔ ابوالفیض عثمانی — تاریخ ۱۸۵۷ء کی ترتیب میں خطوطِ غالب کی اہمیت ۔ اخبار "بشارت" جے پور، یکم و ۱۵ / اگست ۱۹۷۲ء

۱۳۔ منظور الحسن برکاتی — ٹونک میں غالب کے احباب ۔ تحریک دہلی، اپریل ۱۹۷۴ء

دیوانِ غالب: نسخۂ امروہہ

(خود غالب کے قلم سے لکھا ہوا نادر مخطوطہ)

دریافت کی کہانی:

برِ صغیر کے طول و عرض میں ابھی غالب کی صد سالہ برسی منانے کا سلسلہ جاری تھا کہ ۵ر اپریل ۱۹۶۹ء کو میرے ایک ہم وطن جناب توفیق احمد چشتی قادری، جو پُرانی اشیاء اور قلمی کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ کتابوں کی کھوج میں بھوپال پہنچے اور اُن کے ایک ہم پیشہ نے بعض اور کتابوں کے ساتھ ہی "دیوانِ غالب" کا ایک نادر روزگار نسخہ یہ کہہ کر دیا کہ "میاں کیا یاد کروگے تمھیں مرزا غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان دے رہا ہوں، مگر اس کی قیمت ۲۵ روپے سے کم نہیں لوں گا!" توفیق احمد صاحب نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے مول بھاؤ شروع کیا اور معمولی ردوکد کے بعد گیارہ روپے میں اس دُرِّ یتیم کو خرید لیا۔ ۵ر اپریل ۱۹۶۹ء کو انھوں نے یہ نسخہ خریدا اور اُسی دن دہلی کے لیے روانہ ہوگئے۔ خود خریدار کو بھی اس بے بہا نسخے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں تھا، اس نے ۷ر اپریل ۱۹۶۹ء کے اخبار "الجمعیۃ" دہلی میں اشتہار دیا کہ میرے پاس غالب کے اپنے قلم سے لکھا ہوا نسخہ موجود ہے، جو حضرات خریداری میں دلچسپی رکھتے ہوں وہ مجھ سے خط و کتابت کرلیں۔ اشتہار میں خاص طور سے نام لے کر حکیم عبد الحمید صاحب دہلوی (متولی ہمدرد دواخانہ) کو متوجہ کیا گیا تھا، اس لیے انھوں نے اسی سال بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں، مزارِ غالب کے متصل، تقریباً دس لاکھ

روپے کے خرچ سے غالب اکیڈمی قائم کی ہے، اور اس کی مختصر مگر خوب صورت عمارت بنوائی ہے، جس کا افتتاح ۲۲ فروری ۱۹۶۹ء کو صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں عمل میں آچکا ہے۔ مالکِ نسخہ کا خیال تھا کہ اس کتاب کی واقعی قیمت حکیم صاحب موصوف ہی سے مل سکتی ہے۔ اشتہار کے آخر میں اس نسخے کی قیمت کا تعین بھی کر دیا گیا تھا کہ "کم از کم چھ ہزار روپے ہو گی"۔ لیکن بہت سے لوگوں نے اس اشتہار کو دیکھ کر باور نہیں کیا اور اسے مذاق یا جعل سازی سمجھا، چنانچہ غالب اکیڈمی کے ذمہ داروں نے بھی توفیق احمد صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور انھیں اصل نسخہ دیکھے بغیر یہ اطمینان حاصل رہا کہ کسی جعل ساز نے غالب صدی کے موقع پر یہ "ہنر" دکھانے کی کوشش کی ہے۔ میرے استفسار پر اکادمی کے ایک ذمہ دار رکن نے بتایا کہ "اشتہار دیکھنے کے باوجود ہم نے مالکِ نسخہ کو اس لیے نہیں بلایا کہ دہلی سے امروہہ تک کا کرایہ خواہ مخواہ ادا کرنا پڑے گا۔" (اور یہ کرایہ ساڑھے تین روپے سے بھی کم ہوتا ہے!)

مجھ سے بعض دوستوں نے اخبار "الجمعیۃ" دہلی کے اس اشتہار کا تذکرہ کیا تو فوری طور پر مجھے بھی یقین نہیں آیا اور یہ گمان ہوا کہ غالب کا خط پہچاننا ہر شخص کا کام نہیں، نسخہ کسی اور کا لکھا ہوا ہوگا۔ لیکن اس بد گمانی پر مطمئن ہو جانا میں نے گوارا نہ کیا اور مالکِ نسخہ کو خط لکھ کر یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ نسخہ لے کر دہلی آئیں اور مجھ سے ملیں، یا مجھے کوئی تاریخ اور وقت بتائیں تاکہ میں خود اُن کے پاس پہنچ کر یہ نسخہ دیکھ سکوں۔ ادھر میں نے خط لکھا (۱۶ اپریل) اُدھر اسٹیٹ آرکائوز الٰہ آباد کے ایک کارکن امروہہ آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ نسخہ دیکھا اور غالب کے خط کی شناخت کرا کے پریس ٹرسٹ آف انڈیا کو ایک مختصر سی خبر بھیج دی جو انگریزی اخباروں میں اس طرح شائع ہوئی:

Rare Poems By Ghalib Found

LUCKNOW, April 16 (PTI)

A rare collection of Ghalib,s gazals written in his own hand has been found with a dealer in old manuscripts, Taufiq Ahmed of

Amroha.

An official of the UP Archives,Allahabad said on such collection of the poet,s works about 1,ooo verses had been found before.

He said the collection, which included 13 persian and || Urdu 'rabais' appeared to be Ghalib,s work up to the age of 23. About 100 verses in it had been scored off by the poet himself.

یہ اطلاع ۱۷؍اپریل ۱۹۶۹ء کو انگریزی، اردو، ہندی اور دوسری زبانوں کے اخبارات میں چھپی اور آل انڈیا ریڈیو نے اپنے خبرنامے میں نشر کی۔ اسی دن توفیق احمد صاحب یہ نسخہ لے کر میرے پاس دہلی پہنچے اور میں نے خبر کی اشاعت کا حال اُن سے بیان کیا۔ اپنے تھیلے سے نسخہ نکال کر جس وقت انھوں نے میرے سامنے رکھا، میں نے پہلی ہی نگاہ میں اسے شناخت کر لیا کہ واقعی یہ غالبؔ کا خط ہے۔ اپنی مختصر سی زندگی میں مجھے بہت کم کتابوں کی زیارت سے اتنی خوشی ہوئی ہے جتنی اس قلمی نسخے کو دیکھ کر حاصل ہوئی۔ توفیق احمد صاحب نے ازراہِ عنایت مجھے اس نسخے سے استفادے کی اجازت دی اور میں نے اسی دن ایک خط "ہماری زبان" (علی گڑھ) کے ایڈیٹر کو لکھا جس میں تصدیق کی گئی تھی کہ اخباروں میں جو خبر شائع ہوئی ہے وہ درست ہے، یہ نسخہ میں نے دیکھا ہے، اس میں کچھ شک نہیں کہ غالبؔ ہی کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس کی لوح اور ترقیمے کی عبارت بھی مراسلے میں درج کر دی گئی تھی۔ "ہماری زبان" کی یہ اطلاع، پہلی باضابطہ خبر تھی جو کسی کے نام سے چھپی اور جسے پڑھ کر اہلِ علم کے دل سے شکوک اور بدگمانی کا اثر زائل ہوا۔ یہ مراسلہ ۲۲؍اپریل ۱۹۶۹ء کے "ہماری زبان" میں چھپا اور اگلے دن ۲۳؍اپریل ۱۹۶۹ء کے اخبار "الجمعیۃ" دہلی میں دوسرا مراسلہ "غالب صدی کی سب سے زیادہ گراں قدر دریافت: دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ آج پہلی بار اس نسخے کا تفصیلی تعارف لکھ کر "تلاشِ غالب" میں اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔

یہ تو اس نسخے کے دریافت ہونے کی کہانی تھی۔ آج ممکن ہے غیر ضروری سی معلوم ہو۔ لیکن آیندہ غالبؔ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے میں نے اسے محفوظ کر دینا مناسب سمجھا۔ اب اس نسخے کی ظاہری کیفیت عرض کرتا ہوں۔

(الف) نسخے کی کیفیت :

دیوانِ غالب کا یہ نادر مخطوطہ ۶۳ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کا سائز ½۵ × ½۷ ہے۔ صرف ورق ۱۔ب پر عنوان شنگرفی روشنائی سے لکھا ہوا ہے باقی مخطوطہ سیاہ روشنائی سے خط شکستہ شفیعا آمیز میں ہے، شروع میں اکثر غزلوں کے مقطع میں تخلص کی جگہ چھوڑ دی ہے غالباً شنگرفی سے لکھنے کا ارادہ ہوگا، لیکن وہ کبھی لکھا ہی نہیں گیا۔ کاغذ عمدہ اور دبیز ہے۔ حیرت یہ ہے کہ ۱۵۰ سال تک یہ کسی ایسی جگہ محفوظ رہا ہے کہ کرم خوردگی یا آب زدگی کا کوئی نشان اس پر نہیں ہے۔ پورا مخطوطہ بالکل محفوظ اور صاف حالت میں ہے حاشیوں کی چند غزلیں جو بعد میں کسی اور قلم سے اضافہ ہوئی ہیں، ان کے بعض اشعار جلد بندی میں کٹ گئے ہیں۔ غالبؔ کے قلم سے لکھا ہوا ایک ایک لفظ صاف پڑھا جاتا ہے۔ ہر صفحے پر اوسطاً ۲ کالم ہیں اور ہر کالم میں تقریباً ۹ سطریں مکتوبی ہیں۔ لیکن تمام نسخے میں کالم یا سطروں کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ بعض صفحوں پر اشعار کو مثمن یا مربع شکل میں بھی لکھا ہے۔ کچھ اوراق کا سائز نسبتہً بڑا ہے اور اس کے کنارے مڑے ہوئے ہیں، ان مڑے ہوئے کناروں پر کسی دوسرے خط سے نئی غزلیں اضافہ کی گئی ہیں جن کی فہرست آگے دی جا رہی ہے۔

اس نسخے کی ابتدا ورق ۱۔ب سے ہوتی ہے۔ اس کی لوح پر لکھا ہے:

"یا علی المرتضیٰ علیہ وعلیٰ اولاد الصلوۃ والسلام یا حسن بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
یا حسین ابو المعانی میرزا عبد القادر بیدل رضی اللہ عنہ"

یہ پوری عبارت شنگرفی روشنائی سے لکھی ہے، اس کے بعد مطلع سر دیوان:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

ورق ۶۱۔ الف تک غزلیات ہیں، ان کے خاتمے پر لکھا ہے: "تمام شد غزلیات بعونہ تعالیٰ" پھر اسی صفحے پر بائیں ہاتھ کو "عنوان صحیفہ رباعیات" لکھ کر پہلے فارسی کی تیرہ رباعیاں درج کی ہیں، ان میں صرف مندرجہ ذیل ایک رباعی کلیات نظم غالب (مطبوعہ نولکشور، ص ۵۰۴) پر ملتی ہے، باقی بارہ غیر مطبوعہ ہیں (ملاحظہ ہو: فہرست) مطبوعہ رباعی یہ ہے:

شاہیم و جنونِ ما تمکیں دلتنگ
داریم بہ بحر و بر ز وحشت آہنگ
مرجاں در ویم زارہ پشت نہنگ
بر کوہ زنیم سکہ از داغ پلنگ

اس میں بھی یہ اختلاف ہے کہ کلیات نظم میں پہلا مصرع یوں ہے:

شاہیم زبانہ افسر داغ اورنگ

ورق ۶۲۔ب سے اردو رباعیات بغیر جداگانہ عنوان کے شروع ہو گئی ہیں۔ ان کی تعداد گیارہ ہے۔ دیوان میں فارسی رباعیات کے شمول سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ اس دیوان کی ترتیب کے وقت (۱۲۳۱ھ) تک غالب نے باقاعدہ فارسی گوئی شروع نہیں کی تھی، کبھی کبھار منہ کا مزا بدلنے کو کچھ کہہ لیتے ہوں گے۔ ان کا سب سے پہلا فارسی کلام یہی رباعیات ہیں جو انھوں نے دیوانِ اردو کے آخر میں درج کر دیں۔ بعد میں جب وہ باقاعدہ فارسی دیوان فراہم کرنے کی طرف متوجہ ہوئے تو یہ اردو دیوان نظری کر چکے تھے لہٰذا اس میں مندرج فارسی رباعیات بھی دیوانِ فارسی میں شامل نہ ہو سکیں۔ ممکن ہے مندرجہ بالا ایک رباعی انھوں نے حافظے کی تحویل میں، یا کسی اور بیاض میں رکھ چھوڑی ہو، اور وہاں سے کلیاتِ نظم فارسی میں شامل کر لی ہو۔ نسخۂ امروہہ کی اردو رباعیات سب مطبوعہ ہیں۔ اگرچہ بعض لفظی اختلافات ہیں۔ یہ رباعی جو سب سے آخر میں ہے البتہ غیر مطبوعہ ہے (ملاحظہ ہو عکس ورق ۶۳۔ الف):

گلخن شرر اہتمام بستر ہے آج
یعنی تبِ عشق شعلہ پرور ہے آج
ہوں درد ہلاک نامہ بر سے بیمار
قارورہ مرا خون کبوتر ہے آج

اس رباعی کے معاً بعد ترقیمہ :

”تمت تمام شد، بتاریخ چہار دہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ، سنہ ہجری وقت دو پہر روز باقیماندہ فقیر بیدل اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد اللہ عفی اللہ عنہ، از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ بہ فکر کاوش مضامین دیگر، رجوع بہ جناب روح میرزا علیہ الرحمۃ آورد۔ فقط“

اس عبارت میں سنہ ہجری کے اعداد لکھنے سے رہ گئے ہیں، اسی کے ساتھ ورق ۶۳ الف پر یہ مخطوطہ تمام ہو جاتا ہے۔ دیوان کے ساتھ اسی جلد میں ایک مخطوطہ ”قصہ لیلیٰ مجنوں“ بھی شریک کر دیا گیا ہے لیکن غالبؔ کے متعلق اس کی کچھ اہمیت نہیں ہے اس کی تفصیلات کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے۔

(ب) بخطِ غالب ہونے کے شواہد :

اس نسخے سے متعلق دو باتیں خاص طور سے بحث طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے بخط غالب ہونے کے قرائن ترقیمے کی عبارت سے قطع نظر، اور کیا کیا ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کا زمانہ ترتیب و کتابت کیا متعین کیا جائے گا؟ خاص طور پر اس صورت میں کہ ترقیمے کی عبارت میں غالبؔ نے سہواً سنہ ہجری کے اعداد نہیں لکھے ہیں۔ یہاں اس سلسلے میں چند بنیادی اہمیت کے امور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

نسخۂ امروہہ کے ترقیمے کی عبارت میں کوئی شک پیدا کرنے والی بات نہیں ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اس وقت لکھا گیا ہے جب غالبؔ صرف اسد تخلص کرتے

تھے اور بیدل کے رنگ میں خیالی مضامین باندھتے تھے۔ بیدل سے ان کی عقیدت لوح دیوان اور ترقیمے کی عبارتوں سے ظاہر ہے اور یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ تشیع کی طرف ابتدائے عمر ہی سے مائل تھے۔ اس میں "عفی اللہ عنہ" کے الفاظ اس پر گواہ ہیں کہ مصنف خود ہی کاتب بھی ہے۔

LIBRARY
IDARE-ADBIYAT-E-URDU
Acc. No ۳۳۵۷۵
Date ۲۰۰۵/۸/۳

(ج) غالب کا املا:

دوسرا بدیہی طریقہ یہ ہے کہ غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی متعدد تحریریں دستیاب ہوتی ہیں ان کی روشِ تحریر اور املا سے اس کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ لیکن اس تقابل میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہمیں غالب کی زیادہ تر تحریریں ادھیڑ عمر یا بڑھاپے کی ملی ہیں اور نسخۂ امروہہ عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ انسان کے خط میں جو تبدیلی رونما ہوتی ہے، اگر اس کا لحاظ نہ رکھا گیا تو اسے شناخت کرنے میں دشواری بھی ہوسکتی ہے۔ جوانی میں انسان کے جسم میں طاقت اور ہاتھ میں بل ہوتا ہے اس لیے حروف کی نشست اور نوک پلک میں بھی جماؤ اور نزاکت ہوتی ہے، لیکن قویٰ میں اضمحلال پیدا ہوجانے پر ہاتھ کی گرفت کمزور ہوجاتی ہے اور خط میں پختگی تو رہتی ہے مگر تناسب اور نشستِ حروف کا جماؤ اور نوک پلک کی نفاست کم ہوجاتی ہے۔ یہ نسخہ جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے ۱۲۳۱ھ میں لکھا گیا ہے اور ۱۲۳۵ھ سے یقیناً پہلے اس کی کتابت ہوئی ہے۔ ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء میں غالب کی عمر ۱۹ سال ہوگی۔ اس عمر کی تحریر کا مقابلہ، چالیس پچاس برس کی عمر میں لکھی ہوئی تحریروں سے کیا جائے تو روشِ خط اور خصوصیاتِ کتابت کو بہت گہری نظر سے دیکھنا ہوگا۔

غالب کی سب سے قدیم تحریر جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے وہ ان کا ایک خط ہے جو خداداد خاں اور دلی داد خاں کے نام ہے جو آگرے میں مہاجنی کا کاروبار کرتے تھے، یہ خط آزاد لائبریری علی گڑھ کے حبیب گنج کلکشن میں محفوظ ہے۔ حال ہی میں

اس کو ڈاکٹر مختار الدین احمد نے علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں شائع کرا دیا ہے وہ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"مرزا کے اس مکتوب پر سالِ تحریر ۱۸۰۴ء درج ہے جو کسی طرح درست نہیں ہو سکتا اس وقت تو مرزا کی عمر چھ سات سال کی ہوگی۔ اگر صفر کو ایک کا عدد سمجھا جائے اور ۱۸۱۴ء پڑھا جائے جب بھی قرینِ قیاس نہیں، اس طرح مرزا کی عمر سولہ سترہ سال قرار پاتی ہے اور تحریر کی پختگی بتا رہی ہے کہ یہ تحریر سولہ سترہ سال کے لڑکے کی نہیں ہو سکتی، مزید برآں خط کے آخر میں مرزا کی مہر ہے جس پر ۱۲۳۱ھ منقوش ہے مطابق ۱۸۱۶ء کے ہے۔ اگر اس سال یہ مہر کھدی ہے تو اس کا استعمال ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء یا اس کے بعد ہوا ہوگا، گویا ۱۸۱۴ء خارج از بحث ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تحریر ۱۸۲۴ء سے پہلے کی نہیں ہو سکتی"۔[1]

جناب مالک رام اس خط کا زمانۂ تحریر ۱۸۴۰ء مانتے ہیں[2] لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اس سنہ سے بہت پہلے کی تحریر ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین کا یہ خیال کہ ۱۸۲۴ء کی ہو سکتی ہے، قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ مگر ہمارے مفید مطلب سرِ دست صرف دو امور ہیں: ایک تو یہ کہ زمانے کے تعین میں محققین کے اختلاف کے باوجود یہ غالب کی قدیم ترین تحریر ہے اور دوسری بات، جو اس موقع پر زیادہ اہم ہے یہ کہ اس کی روشِ کتابت اور نسخۂ امروہہ کے خط میں اتنی مماثلت موجود ہے جو دونوں تحریروں کو ایک ہی کاتب سے منسوب کرنے کے لیے قطعاً کافی ہو سکتی ہے۔

غالب کے طرزِ تحریر کی کچھ خصوصیات ہیں۔ جنھیں ان کی تحریروں کو دیکھنے والے آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔ مثلاً وہ الف اور دال یا الف اور رے کو ملا دیتے

---

[1] علی گڑھ میگزین: غالب نمبر (مرتبہ بشیر بدر) ۱۹۶۹ء۔ صفحہ ۳۶۔
[2] ذکرِ غالب (طبع ۴) صفحہ ۲۲۔

ہیں۔ یعنی فریادی، بہادر، بہار وغیرہ الفاظ اس طرح لکھیں گے کہ دال یا رے الف ہی میں جڑی ہوئی ہوگی۔ یاے معروف و مجہول اگر بغیر وصل آئے تو سامنے کی طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ یعنی لفظ 'شوخی' اس طرح لکھیں گے کہ ی کا آخری حصہ بڑی سی رے معلوم ہوگا۔ اسی طرح غیر مخلوط ہاے ہوز کا سرا اتنا دبیز کردیں گے کہ اگر اس کے نیچے شوشہ نہ ہو تو اسے میم بھی سمجھا جاسکتا ہے دال اور واؤ کو ملا دینا بھی غالب کی منفرد روش ہے وہ 'دو' یا 'دوری' یا 'دوست' اس طرح لکھتے ہیں کہ اس شکل کو ٹائپ میں ظاہر کرنا بہت مشکل ہے بعض الفاظ کو ملا کر لکھنا بھی ان کی روش ہے مثلاً محفل میں کو یوں لکھیں گے؛ محفلمیں۔ اسی طرح؛ مجلسمیں، جوشمیں وغیرہ۔

اگر کسی لفظ میں دال اور واؤ دونوں حروف ہیں تو ان کا مجموعہ دوچشمی ہا کی طرح بھی بنا دیتے ہیں جیسے 'افزودن' میں آخری تینوں حروف ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ ب ت ٹ وغیرہ حروف وہ دو طرح لکھتے ہیں کبھی تو دندانے دار، جس کا شوشہ آخر میں اوپر کی طرف اٹھتا ہوا ہوتا ہے اور کبھی اس طرح کہ مقام وصل پر وہ دبیز ہوتی ہے اور آگے بڑھتے ہوئے نکیلی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بالکل خنجر کی سی شکل بن جاتی ہے۔

اس کے علاوہ غالب صحت الفاظ اور املا کا بہت خیال رکھتے تھے، اگر کوئی اور کاتب یا پیشہ ور ناقل اس دیوان کو نقل کرتا تو ممکن نہ تھا کہ اس میں املا کی صریح غلطیاں یا کم سے کم غالب کے خلاف مزاج املا کا بکثرت اظہار نہ ہوتا[1] لیکن یہ پورا مخطوطہ املا کی غلطیوں سے حیرت انگیز طور پر پاک ہے صرف ایک جگہ غالب نے "کثافت ہا" کو "کسافتہا" لکھ دیا ہے، یہ سہو قلم ہے۔ لیکن ایک سے زائد جگہ پر انھوں نے "عدو" کی عین اور "مشاطہ" کی میم پر پیش لگایا ہے حالاں کہ دونوں بفتح

---

[1] غالب کے املا سے تفصیلی بحث ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے مقدمہ خطوط غالب (مرتبہ مہیش پرشاد) میں اور مولانا عرشی نے مقدمہ مکاتیب غالب (طبع ششم ۱۹۴۹ء، صفحات ۲۱۹ و مابعد) میں کی ہے اس سے رجوع کیا جائے۔

اول ہیں اگر غالب اس کا تلفظ بضمِ اوّل کرتے تھے تو یہ ان کی غلطی اور عوامی تلفظ کی تقلید تھی۔

(د) زمانہ، کتابت:

مرزا نے پہلی بار اپنا دیوان کب مرتب کیا، یہ ابھی تک قطعیت سے طے نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اس زمانے کا جو بھی تخمینہ اب تک کیا گیا ہے نسخۂ امروہہ کی دریافت کے بعد اس پر نظرِ ثانی کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اس بحث کی وضاحت کے لیے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ مرزا نے شعر گوئی کب سے شروع کی؟ اس بارے میں خود اُن کے بیانات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ انھوں نے شعر گوئی کے آغاز کے وقت اپنی عمر ایک جگہ دس سال، دوسرے موقع پر بارہ سال، تیسری جگہ پندرہ سال لکھی ہے۔ قدر بلگرامی کو لکھا تھا۔[۱]

"بارہ برس کی عمر سے، نظم و نثر میں کاغذ مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں، باسٹھ برس کی عمر ہوئی، پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔"

دوسرے خط میں کہتے ہیں:[۲]

"پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس بکا، نہ مدح کا صلہ ملا نہ غزل کی داد۔"

ان بیانوں کو سامنے رکھ کر مولانا امتیاز علی عرشی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:[۳]

"میرزا صاحب کی سخن سرائی کا آغاز ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) ۱۲۲۵ھ (۱۸۰۹ء) اور ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں سے کسی ایک سال ہوا تھا۔ ان میں سے

۱۔ اردوئے معلیٰ (مطبع کریمی لاہور ۱۹۲۶ء)، ص ۴۰۳۔

۲۔ ایضاً، ص ۴۱۹۔

۳۔ دیباچہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ص ۱۳۔

راجح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریباً دس برس کی عمر سے شعر گو تھے کیوں کہ کلیاتِ فارسی کا اظہار، جو سب سے قدیم ہے، یہی ثابت کرتا ہے، اور اس کی تائید ان کے ہم جولی لالہ کنہیا لال کے بیان سے بھی ہوتی ہے جسے خواجہ حالی مرحوم نے نقل کیا ہے۔"

اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ مرزا نے دس برس کی عمر یعنی ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا تب بھی یہ نکتہ قابلِ لحاظ ہے کہ شعر گوئی کا آغاز جمع دیوان کے آغاز کو مستلزم نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۱ء) تو اُس صورت میں خارج از بحث ہو جاتا ہے، اگر ہم بقول حالی نواب حسام الدین حیدر خاں کا لکھنؤ جا کر میر کو غالب کا کلام سنانا اور میر کا اس پر تبصرہ کرنا صحیح مان لیں کہ[۱]:

"اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔"

اس لیے کہ میر کا انتقال ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں ہوا ہے اور حسام الدین خاں اسی سال یا (۱۸۰۹ء) میں ان سے ملے ہوں گے۔ اس لیے آغاز شعر گوئی کا زمانہ ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) مان لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

اپنا بالکل ابتدائی دور کا کلام مرزا نے کسی بیاض میں یا متفرق پرچوں پر لکھا ہو گا، اس بیاض کے ردیف وار جمع ہونے یا دیوان کی صورت میں شروع ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ اُنھوں نے ایک خط میں لکھا تھا:

"پندرہ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا گیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔"[۲]

اس کی رو سے انھوں نے ۱۲۲۷ھ سے شعر کہنا شروع کیا اور ۱۲۳۷ھ تک "بڑا دیوان"

---

[۱] حالی: یادگارِ غالب، ص ۹۷-۹۸ (بحوالہ ذکرِ غالب، طبع چہارم، ص ۴۲-۴۳)۔
[۲] عود ہندی: ۱۵۹۔

جمع کر لیا۔ لیکن یہ تخمینہ بھی صحیح نہیں ہے۔ غالب نے ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) میں اپنا دیوان مکمل کر لیا تھا۔ جب ان کی عمر ۱۸۔ ۱۹ سال سے زائد نہیں تھی۔ اور وہ یہی نسخۂ امروہہ ہے۔

(ہ) زمانہ ترتیب:

نسخۂ امروہہ کے اختتام پر واضح الفاظ میں ترقیمہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب اس دیوان کی کتابت سے ۱۴ رجب کو منگل کے دن شام کے وقت فارغ ہوئے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ انھوں نے سنہ ہجری کے اعداد نہیں لکھے، اگر یہ اعداد بھی موجود ہوتے تو اس نسخے کی اہمیت اور قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا بصورت موجودہ ہمیں دوسرے ذرائع سے سنہ کی تعیین کرنی پڑتی ہے۔

سب سے پہلے تو ہم اس سنہ کی آخری ممکنہ حد متعین کر لیں جب یہ نسخہ لکھا گیا۔ اتفاق سے اس کی ایک قوی اندرونی شہادت موجود ہے۔ ورق ۱۴۱۔ الف کے حاشیے پر غالب نے اپنے قلم سے ایک مختصر یادداشت لکھی ہے "لعل خاں اوّل صفر ۱۲۳۵ھ دو روپیہ آٹھ آنے" (ملاحظہ ہو عکس)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا نے لعل خاں نامی کسی شخص کو ڈھائی روپیہ ماہوار یکم صفر ۱۲۳۵ھ سے ملازم رکھا تھا۔ اور ورق ۱۴۱۔ الف کے حاشیے پر اس یادداشت کا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس تاریخ تک دیوان لکھا جا چکا تھا ورنہ یہ عبارت اول و آخر کے کسی صفحے پر ہونا چاہیے تھی۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ تقویم ہجری و عیسوی کی رو سے ۱۴ رجب کس سال منگل کے دن واقع ہوئی تھی۔ تقویم کا حساب بتاتا ہے کہ ۱۲۳۱ھ میں ۱۴ رجب کو بدھ کا دن تھا، واقعی تاریخ اس حساب میں ایک دن کا فرق رویت کی وجہ سے رہ جاتا ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ۱۲۳۱ھ میں رجب کا چاند ۲۹ جمادی الثانی کو نظر آیا تھا تو ۱۴ رجب کو سہ شنبہ ہی پڑتا ہے۔ ۱۲۳۱ھ میں غالب کی عمر ۱۹ سال ہوتی ہے اور انھوں نے اپنی شاعری کے آغاز، جمع دیوان کے بارے میں جو شہادتیں چھوڑی ہیں ان سے اس سنہ کو تسلیم کر لینے میں کوئی تناقض یا تضاد نہیں ہے۔

اگر ۱۲۳۱ھ والے حساب کو ازراہِ احتیاط نہ بھی مانا جائے (اور بظاہر ہمیں کوئی مانع نظر نہیں آتا) تو اتنا بالکل بدیہی ہے کہ غالب کا یہ دیوان صفر ۱۲۳۵ھ سے پہلے لکھا گیا ہے اور اس کی کتابت کا زمانہ ۱۲۳۱ھ سے ۱۲۳۵ھ کے مابین کوئی سال ہو سکتا ہے۔

پہلی تسوید کے وقت اس دیوان میں ۵۳۲ اشعار تھے اور تمام غزلوں کے مقطع میں اسدؔ تخلص استعمال کیا گیا تھا۔ نظرِ ثانی کے زمانے میں (بعد ۱۲۳۱ھ) وہ اپنا تخلص غالبؔ طے کر چکے تھے۔ چنانچہ بہت سی غزلوں میں اسد کی جگہ غالب موزوں کر دیا ہے۔ نیز انھوں نے ۱۲۳۱ھ اور صفر ۱۲۳۷ھ کے درمیان دو سال کے عرصے میں کم سے کم تیرہ غزلیں اور کہیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۲۲ ہوتی ہے اور یہ اشعار کاتبِ دیوان کو املا کرا دیے جو اس نے اس دیوان کے حاشیوں پر لکھ لیے۔ ان کے شمول سے ہی نسخۂ امروہہ کے اشعار کی کل تعداد ۱۶۵۴ ہو جاتی ہے۔ (دیکھو فہرست اشعار)

(و) ترتیب دیوان کے مدارج:

نسخۂ امروہہ کی دریافت کے بعد میری رائے یہ ہے کہ مرزا نے اپنا ابتدائی دور کا کلام کسی بیاض میں فراہم کرنا شروع کیا، (خواہ وہ ردیف وار ہو یا بہ ترتیب نظم لکھی گئی ہو) لیکن اس میں ۱۲۳۱ھ تک ڈیڑھ ہزار اشعار جمع ہو چکے تھے۔ ایسی کوئی بیاض ابھی تک ہمارے علم میں نہیں ہے لیکن نسخۂ امروہہ کی دریافت کے بعد امید کی جا سکتی ہے کہ کبھی وہ بھی مل جائے گی۔ اس بیاض کو انھوں نے نوک پلک درست کرنے کے بعد دیوان کی شکل میں ردیف وار ترتیب دیا اور اُسے اپنے قلم سے صاف کر کے دیوان کا پہلا نسخہ تیار کر لیا، جو زیرِ بحث دیوان ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ نسخۂ امروہہ کی خام شکل ایک اور دیوان تھا، بعض قرینوں سے بھی ملتا ہے۔ مولانا عرشی نے اپنے مرتبہ دیوان کے مقدمے میں تحریر فرمایا ہے:

"میرزا صاحب نے اپنا ردیف وار اردو دیوان صفر ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء)

میں صاف کرایا تھا اس کی اصل کوئی مردف دیوان تھا یا وہ بیاض تھی، جس میں بہ ترتیب نظم، اشعار لکھے گئے تھے، اس سوال کا جواب دینے کے لیے ابھی تک کوئی مسالہ نہیں مل سکا۔ لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ میرزا صاحب نے ۱۲۳۷ھ سے قبل کے کہے ہوئے متعدد شعر اس میں شامل نہیں کیے تھے چنانچہ "یادگار نالہ" کے وہ شعر جو عمدۂ منتخبہ، عیار الشعرا اور دوسرے قدیم ماخذوں سے نقل کیے گئے ہیں، اس دعوے کا بیّن ثبوت ہیں"۔

اب یہ تو معلوم ہو گیا کہ نسخۂ بھوپال کی اصل ایک مردف اور مرتب دیوان تھا لیکن اس میں بھی بعض وہ اشعار نہیں ہیں جو عمدۂ منتخبہ اور عیار الشعرا میں غالب سے منسوب ہوئے ہیں۔ اس سے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ نسخۂ امروہہ کے مسودے میں بھی غالب نے ترمیمیں کی تھیں اور بعض غزلیں خارج کر دی تھیں، جن کے یہ اشعار عمدۂ منتخبہ اور عیار الشعرا میں باقی رہ گئے ہیں: [1]

نیاز عشق خرمن سوز اسبابِ ہوس بہتر
جو ہو جائے نثار برق مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں، واہ، غلط
کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

محفل شمع عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں
ہوئے ہے جادۂ رہ رشتہ، گوہر ہر گام
جس گزر گاہ میں، میں آبلہ پا جاتا ہوں

---

[1] ان اشعار سے متعلق بحث کے لیے رسالہ 'اردو'، کراچی غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون اور رسالہ 'نقوش'، لاہور غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) میں ڈاکٹر وحید قریشی کا فاضلانہ مقالہ "دیوانِ غالب نسخۂ شیرانی"، بھی ملاحظہ ہوں۔

سرِ گرا مجھ سے سبک رو کے نہ بہنے سے رہو
کہ بہیک جنبشِ لب مثلِ صدا جاتا ہوں

دیکھتا ہوں اُسے، تھی جس کی تمنّا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے

دیکھ وہ برق تبسّم بسکہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوّارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ میخانہ، بولا میفروش
اب شکست توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

بیاہ تو ہو کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

مندرجہ بالا سب اشعار عمدۂ منتخبہ سے لیے گئے ہیں اور ذیل کے اشعار عیار الشعراء میں ہیں:

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانتے ہے
ایسے ہنستے کو رُلایا ہے کہ جی جانتے ہے

صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی
کہ روئے غنچۂ گل سوے آشیاں پھر جائے

یہ سب اشعار نسخۂ بھوپال میں نہیں ہیں، چونکہ ان تذکروں کا زمانۂ تالیف نسخۂ بھوپال کی ترتیب سے قبل کا ہے اس لیے انھیں نسخۂ امروہہ میں ہونا چاہیے تھا، لیکن یہ نسخہ بھی ان اشعار سے خالی ہے۔ اس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نسخۂ امروہہ بھی کسی دیوان یا بیاض کی اصلاح یافتہ شکل ہے اور یہ اشعار اس میں موجود ہوں گے جنھیں بعد میں غالب نے قلم زد کردیا، جس طرح نسخۂ امروہہ میں انھوں نے بہت سے اشعار قلم زد کردیے ہیں جنھیں نسخۂ بھوپال میں شامل نہیں کیا۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ نسخۂ امروہہ کے حواشی پر بعض غزلیں (جن کی فہرست آگے دی گئی ہے) کسی دوسرے بدخط کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ملتی ہیں اور یہ سب غزلیں (ایک مستثنیٰ) نسخۂ بھوپال کے متن یا حواشی میں شامل ہیں گویا ان کا زمانۂ تصنیف ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء اور ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء کے درمیان ہے۔ یہاں فہرست بنا کر ظاہر کیا جاتا ہے کہ مرزا غالب کا متداول دیوان اپنی ترتیب و انتخاب کے کن مدارج سے گزرا ہے۔

۱۔ **ابتدائی بیاض**: (ردیف وار یا بہ ترتیب نظم) جس میں آغاز شعر گوئی سے ۱۲۳۱ھ تک کا کلام تھا۔

۲۔ **نسخۂ امروہہ**: جسے ابتدائی بیاض کی مرتب شکل کہنا چاہیے۔ یہ ۱۴ رجب ۱۲۳۱ھ روز سہ شنبہ کو مکمل ہوا۔

۳۔ **دوسرا نسخہ**: نسخۂ امروہہ میں حک و اصلاح اور ترمیم و اضافے کے بعد یہ دیوان تیار ہوا جس کا ابتدائی حصّہ (نسخۂ امروہہ کے ورق ۲۸۔ الف تک) خود غالب کے قلم سے صاف کیا گیا تھا، باقی حصّہ کسی اور کاتب نے نقل کیا اس لیے کہ نسخۂ امروہہ کے ورق ۲۸۔ الف پر اس غزل کے ساتھ جس کا مقطع ہے:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

یہ لکھا ہوا ہے:

"تا ایں جا نوشتہ ام"

اور اس مطلع کے ساتھ:

جوں مردمکِ چشم میں ہوں جمع نگاہیں
خوابیدہ حیرت کدۂ داغ ہیں آہیں

یہ نوٹ کیا گیا ہے کہ "ازیں جا شروع"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترمیم و اصلاح کے بعد نسخۂ امروہہ کو ورق ۲۸۔الف تک خود غالب نے صاف کرنا شروع کر دیا تھا اس دوران میں انھیں کاتب مل گیا تو باقی حصّہ اس سے لکھوایا گیا۔ اور جو غزلیں بعد میں کہی گئی تھیں وہ کاتب نے نسخۂ امروہہ کے حاشیے پر لکھ لی تھیں وہاں سے مبیضہ میں نقل ہوئیں۔ یہی مبیضہ نسخہ بھوپال کی اصل رہا ہوگا اس لیے میں اس کا زمانۂ کتابت صفر ۱۲۳۷ھ سے پہلے اور صفر ۱۲۳۵ھ کے بعد مانتا ہوں۔

۴۔ **نسخۂ بھوپال**[1]: اس کی کتابت ۵ صفر ۱۲۳۷ھ/ اکتوبر ۱۸۲۱ء میں تمام ہوئی۔ یہ وہی نسخہ ہے جس کا کلام نسخۂ حمیدیہ میں شامل ہے اصل مخطوطہ مفقود ہو چکا ہے۔

۵۔ **نسخۂ شیرانی**[2]: یہ بھوپال کا مبیضہ ہے اس کا زمانہ قیاساً ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۶ء بتایا جاتا ہے۔

۶۔ گل رعنا[3]: تاریخ ترتیب مابین ۴ شعبان ۱۲۴۳ھ/ ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء و ربیع الاوّل

۱؎ تفصیل کے لیے: دیباچہ نسخۂ عرشی، صفحات ۷۵ تا ۷۸۔ ڈاکٹر عبداللطیف: غالب (اردو ترجمہ) مطبوعہ دہلی، ص ۱۴۵، ۱۴۶۔

گیان چند: غالب اور بھوپال۔ اردوے معلی (دہلی) غالب نمبر، حصّۂ اول۔ ۱۹۶۰ء۔

سیّد حامد حسین: دیوانِ غالب نسخۂ بھوپال کی کہانی۔ اردو ادب (علی گڑھ) غالب نمبر شمارہ ۱/ ۱۹۶۹ء۔

ابو محمد سحر: دیوانِ غالب کا ایک اہم گم شدہ مخطوطہ۔ نیا دور (لکھنؤ) غالب نمبر، فروری ۱۹۶۹ء۔

۱۔ ملاحظہ ہو دیباچہ نسخۂ عرشی صفحات ۷۸ تا ۸۱ معاصر (پٹنہ) حصّہ ۱۲۔

وحید قریشی: دیوانِ غالب نسخۂ شیرانی (نقوش لاہور) غالب نمبر، فروری ۱۹۶۹ء۔

۲۔ دیباچہ نسخۂ عرشی صفحات ۸۱ تا ۸۲۔

مالک رام: گل رعنا (حصّۂ فارسی) نگار (لکھنؤ) ۱۹۶۰ء نیز "نذرِ ذاکر" ۱۹۶۸ء۔

۱۲۴۵ھ / ستمبر ۱۸۲۹ء۔

۷۔ **نسخۂ رام پور**[1]: (قدیم) مکتوبہ ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۳ء۔

۸۔ **نسخۂ بدایوں**[2]: مابین ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۵ء و ۱۲۵۴ھ / ۳۹-۱۸۳۸ء۔

۹۔ **نسخۂ کراچی**[3]: ۲۶ شعبان ۱۲۶۱ھ / اگست ۱۸۴۵ء۔

۱۰۔ **نسخۂ لاہور**: غالباً ۱۲۶۸ھ / ۲ ۱۸ء کا لکھا ہوا۔

۱۱۔ **نسخۂ رام پور جدید**: ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء۔

۱۲۔ **نسخۂ طاہر**: مکتوبہ ۶ جمادی الثانیہ ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء۔

ان نسخوں میں غالبؔ کے قدیم کلام کا مطالعہ کرنے کے لیے نسخۂ امروہہ سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس کی ترقی یافتہ شکل نسخۂ بھوپال سے ہے جسے اب تک غالبؔ کا سب سے پہلا دیوان سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کا مبیضہ نسخۂ شیرانی ہے۔ گل رعنا کو متداول دیوان کا نقشِ اول کہنا چاہیے۔

(ز) نسخۂ امروہہ کی اصلاحیں:

زیرِ بحث نسخے میں غالبؔ نے پہلی روایت کو تبدیل کر کے کس طرح کی تبدیلیاں کی ہیں اس سے ان کے ذوقِ سخن کا ارتقا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

۱۔ غزل نمبر ۵ کا دوسرا شعر ہے:

اوگی اک پنبۂ روزن سے بھی چشم سفید آخر
حیا کو انتظار جلوہ ریزی کے کہیں پایا

---

[1] دیباچہ نسخۂ عرشی، صفحات ۸۲-۸۴۔

[2] نقوش لاہور شمارہ ۸۱، ۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) میں مولانا عرشی کا مضمون "دیوانِ غالب کا ایک اور نادر مخطوطہ"۔

[3] سیّد عبداللہ: دیوان غالب کا ایک نادر قلمی نسخہ۔ ماہِ نو (کراچی) جولائی ۱۹۵۴ء۔

پہلا مصرع ابتدا میں یوں تھا :

اوگے چشم سفید از پنبۂ روزن تماشا ہے

غالب نے اسے اپنے قلم سے تبدیل کیا ہے۔

۲۔ غزل ۸ کا مقطع :

اسد کو بت پرستی عالم درد آشنائی ہے
نہاں ہے نالۂ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

ترمیم سے قبل پہلا مصرع یوں تھا :

اسد کو بت پرستی مطلب از درد آشنائی ہے

۳۔ غزل ۱۵ شعر ۳ :

اسیر بے زبانی ہوں مگر صیاد بے پروا
بدام جوہر آیینہ ہو جاوے شکار اپنا

پہلا مصرع ابتداء یوں تھا :

گرفتارانِ الفت بے زباں ہیں کاش صیاد ے

۴۔ غزل ۱۶ شعر ۳ :

بسکہ جوش گریہ سے زیر و زبر ویرانہ تھا
چاک موج سیل تا پیراہن دیوانہ تھا

ترمیم سے پہلے یوں تھا :

چاک موج سیل در پیراہن دیوانہ تھا

۵۔ غزل ۱۶ شعر ۳ :

حیرت اپنے نالۂ بیدرد سے غفلت بنی
راہ خوابیدہ کو غوغائے جرس افسانہ تھا

قبل اصلاح :

حیرت از شور فغاں بے اثر غفلت ہوئی

۶۔ غزل ۱۶ شعر ۵ :

شب تری یا شیر سحر شعلۂ آوازہ سے
تا شمع آہنگ مضراب پر پروانہ تھا

قبل اصلاح :

از نفس گرمی سحر شعلہ آوازہ یاد

۷۔ غزل ۱۹ شعر ۵ :

تمنائے زباں محو سپاس بے زبانی ہے
کیا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

قبل اصلاح :

تمنّائے زباں محو سپاس بے زبانی ہا

۸۔ غزل ۲۱ شعر ۴ :

شرر فرصت نگہ، سامان یک عالم چراغاں ہے
بقدر رنگ یاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا

۹۔ غزل ۲۲ شعر ۵ :

فزوں ہوتا ہے ہر دم جوش خوں باری تماشا ہے
نفس کرتا ہے رگ ہائے مژہ پر کام نشتر کا

قبل اصلاح :

نفس کرتا ہے بر رگ ہائے مژگاں کام نشتر کا

۱۰۔ غزل ۲۵ مقطع :

بہار رنگ خون گل ہے ساماں اشک باری کا
جنون برق اور شعلہ نشتر ہے رگ ابر بہاری کا

قبل اصلاح :

کہ برق اور شعلہ نشتر ہے رگ ابر بہاری کا

۱۱۔ غزل ۲۸ شعر ۵ :

وحشی بن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا
رشتہ چاک جیب دریدہ صرف قماش دام کیا

قبل اصلاح :

رشتہ چاک جیب دریدہ یکسر صرف دام کیا

۱۲۔ غزل ۳۰ شعر ۲ :

عجب اے آبلہ پایان صحرائے نظر بازی
کہ تار جادۂ رہ رشتہ گوہر نہیں ہوتا

قبل اصلاح :

عجب اے آبلہ پایان صحرائے محبت ہا

۱۳۔ غزل ۳۶ شعر ۳ :

بت پرستی ہے بہار نقشبندی جہاں
ہر صریر خامہ میں یک نالۂ ناقوس تھا

قبل اصلاح :

از صریر خامہ پیدا نالۂ ناقوس تھا

۱۴۔ غزل ۳۷ شعر ۹ :

وہ نفس ہوں کہ اسد مطرب دل نے مجھ سے
ساز پر رشتہ پئے نغمہ بیدل باندھا

قبل اصلاح :

وہ نفس ہوں کہ اسد زمزمۂ فرصت نے
رشتہ بر ساز پئے نغمۂ بیدل باندھا

یہ چند مثالیں اس ترمیم اور اصلاح کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے اخذ کی گئی ہیں، جن سے نسخۂ امروہہ ابتدائی ترتیب کے بعد گزرا ہے۔ ان میں کچھ اصلاحیں نسخۂ

بھوپال کے متن میں موجود ہیں اور کچھ وہاں حاشیے پر درج ہوئی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ نسخہ بھوپال کی تسوید کے بعد عمل میں آئیں۔

(ح) نسخۂ حمیدیہ کی تصحیح:

نسخۂ امروہہ کی جہاں یہ خصوصیت ہے کہ وہ غالبؔ کے قلم سے لکھا ہوا ہے، اور اب تک دریافت ہونے والے تمام نسخوں میں قدیم ترین اور سب سے زیادہ مستند ہے، نیز اس میں غالبؔ کی متعدد غزلیں اور اشعار غیر مطبوعہ ہیں، جو پہلی بار سامنے آئے ہیں، وہیں اس کی ایک ضمنی اہمیت اور بھی ہے۔ نسخۂ بھوپال (مکتوبہ صفر ۱۲۳۷ھ) اب مفقود ہو چکا ہے۔ مگر یہ ۱۹۲۱ء میں مفتی انوار الحق مرحوم کی تصحیح اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمے کے ساتھ "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کی اشاعت کے وقت تک اردو میں دواوین کی ترتیب و تصحیح کے معیاری نمونے موجود نہیں تھے، اس لیے اس کا متن پوری احتیاط اور چھان بین کے ساتھ مدوّن نہیں ہوا۔ دوسرے یہ کہ نسخۂ بھوپال کا معتدبہ کلام وہ تھا جو اس وقت تک اور کسی نسخے میں نہیں ملتا تھا لہٰذا اس کی تصحیح کا کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہیں تھا۔ اب خواہ کاتبِ نسخہ نے غلطی کی ہو یا مرتب سے پڑھنے میں سہو ہوا ہو، جو بھی طباعت، کتابت یا قراٴت کی غلطی اس میں رہ گئی وہ کسی اور ذریعے سے دور نہیں کی جا سکتی، قیاسی تصحیح کو صحت کا مدار بنانا عموماً خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اب نسخۂ امروہہ کے سامنے آجانے سے یہ دشواری نہ رہے گی، نسخۂ حمیدیہ کے بہت سے اشعار جو مہمل معلوم ہوتے تھے اُن کی صحت ہو گئی اور وہ بامعنی نظر آنے لگے۔ چند مثالیں لکھتا ہوں، اشعار کا متن نسخۂ عرشی سے لیا گیا ہے اور تصحیح نسخۂ امروہہ سے کی گئی ہے:

۱۔ وحشت خواب عدم شور تماشا ہے اسد
(جو) مژہ، جوہر نہیں آئینہ تعبیر کا (جز)

۲- عدم ہے خیر خواہ (جلوۂ) زندان بیتابی
جلوہ کو
خرام ناز برق خرمن (سعی پسند) آیا
حاصل سعی پسند آیا

۳- بعجز آباد وہم مدعا تسلیم شوخی ہے
تغافل کو نکر (معزول) تمکین آزمائی کا
مغرور

۴- نظر بازی طلسم وحشت آباد (پریشاں) ہے
پرستاں
رہا بیگانۂ تاثیر افسوں آشنائی کا

۵- اسد کو پیچتاب طبع برق آہنگ مسکن (سے)
ہے
حصار شعلۂ جوالہ میں عزلت نشیں پایا

۶- نزاکت ہے فسوں دعوی طاقت شکستن ہا
شرار تنگ، انداز چراغ از جسم (خستنہا)
جستن ہا

۷- ہوانے ابر سے کی موسم گل میں نمد باقی
کہ تھا آئینۂ خور بے نقاب (زنگ) بستن ہا[1]
زنگ

---

[1] بعض اشعار ممکن ہے نسخۂ عرشی میں طباعت کی غلطی سے مسخ ہو گئے ہوں۔ یہ سطور لکھتے وقت میرے سامنے نسخۂ حمیدیہ نہیں ہے لیکن قریب یہ یقین ہے کہ نسخۂ عرشی میں طباعت کی غلطیاں اتنی وافر مقدار میں نہ رہی ہوں گی۔

۸۔ (غریبی) بہر تسکین ہوس در کار ہے ورنہ
فریبی
بو ہم زر گرہ میں باندھتے ہیں۔ برق حاصل ہا

۹۔ عیادت ہائے طعن آلود یاراں زہر قاتل ہے
رفوئے زخم (کرتی ہے) بنوک نیش عقرب ہا
(کرتے ہیں)

۱۰۔ داغ مہر ضبط بے جا مستی سعی (پسند)
سپند
دو دمجمر لالہ ساں درد تہہ پیمانہ تھا

۱۱۔ صدا ہے کوہ میں حشر آفریں اے غفلت اندیشاں
پئے سنجیدن یاراں (ہو) حامل خواب سنگیں کا
ہوں

۱۲۔ آیا نہ (بیابان طلب گام) زباں تک
آیا نہ بیان طلب کام،
تب خالۂ لب ہو نہ سکا آبلۂ پا

۱۳۔ فریاد سے پیدا ہے اسد گرمی وحشت
تب خالۂ لب ہے جرس (آبلۂ) پا
قافلہ

۱۴۔ زمیں کو صفحۂ گلشن بنایا خوں چکانی (نے)
سے
چمن بالیدنیہا از رم نخچیر ہے پیدا

۱۵۔ ہے عرق افشاں مشی سے، ادہم مشکیں یاد
وقت شب (اختر کنی ہے) چشم بیدار رکاب
اختر گنے ہے
اختر شمر ہے

۱۶۔ شب کہ تھا (نظارگی) روئے بتاں کا اے اسد
نظارہ گر
گر گیا بام فلک سے صبح طشت آفتاب

۱۷۔ اسد (پردے) میں بھی آہنگ شوق یار قائم ہے
(پیری)
نہیں ہے نغمے سے خالی خمیدن ہائے چنگ آخر

۱۸۔ لذت تقریر عشق، پردگی گوش دل
جوہر افسانہ ہے عرض (تجمل) ہنوز
تجمل

۱۹۔ تیز تر ہوتا ہے خشم تند (خوبیاں) عجز سے
خوباں
ہے رگ سنگ فساں تیغ شعلہ خار و خس

۲۰۔ وحشت افزا گریہ ہا موقوف فصل گل اسد
چشم دریا ریز ہے (میزاب) سرکار چمن
میر آب

۲۱۔ خموشی خانہ زاد چشم بے پروا نگاہاں ہے
غبار سرمہ یاں گرد سواد (برگستاں) ہے
نرگستاں

۲۲۔ رہا بے قدر دل در پردۂ جوش ظہور آخر
گل و نرگس بہم (آئینہ و اقلیم) لو کراں ہے
آئینہ در اقلیم

۲۳۔ دیوانگاں ہیں حامل رازِ نہانِ عشق
لے بے تمیز گنج (کو پروانہ) چاہیے
بو یرانہ

۲۴۔ کیا یکسر گداز دل (بیاز) جوشش حسرت
نیاز
سویدا، نسخہ تہ بندی داغ تمنا ہے

۲۵۔ گریے سے بند محبت میں ہوئی نام آوری
لخت لخت دل (رنگیں) خانۂ زنجیر ہے
نگیں

۲۶۔ ہجوم ضبط فغاں سے مری زبان خموش
(برنگ بستۂ) زہراب دادہ پیکاں ہے
برنگ پستۂ

۲۷۔ پنبۂ (مینائی ہی) رکھ لو تم اپنے کان میں
مینائے مے
مے پرستاں ناصح بے صرفہ گو بے ہودہ ہے

۲۸۔ اثر میں یاں تک اے دست دعا (حل تصرف) کر
دخل تصرف
کہ سجدہ قبضۂ تیغ خم محراب ہو جاوے

۲۹۔ (ہے) عشق وفا جانتے ہیں لغزش پا تک
ہم
اے شمع تجھے دعوی ثابت قدمی ہے

۳۰۔ گداز سعی بینش شست و شو(سے) نقش خودکامی
شوے
سراپا شبنم آئیں اک نگاہ پاک باقی ہے

مندرجہ بالا مثالیں سرسری ورق گردانی کا حاصل ہیں، اگر نسخۂ امروہہ سے نسخۂ حمیدیہ کے متن کا مقابلہ کیا جائے تو بہت سی دلچسپ غلطیاں برآمد ہوں گی جو اس لیے شائع ہو گئیں کہ نسخۂ حمیدیہ کا متن "حرف آخر" ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک مثال عمدۂ منتخبہ سے بھی پیش کرتا ہوں۔ یہ مطلع سرور نے درج کیا ہے:

جگر سے ٹوٹے ہوئے مو کی ہے سناں پیدا
دہان زخم سے آخر ہوئی زباں پیدا

تذکرہ سرور کے قلمی نسخۂ لندن کا عکس (مملوکۂ جناب مالک رام) میری نظر سے گزرا ہے اب یاد نہیں کہ اس میں مطلع کے یہی الفاظ ہیں یا ان سے کچھ مختلف ہیں، مگر دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو نے جو تذکرہ سرور کا متن مسخ کیا ہے وہ پیش نظر ہے اس میں مطلع اسی طرح ہے۔ جناب مالک رام نے اپنے مرتبہ دیوان میں اور مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی کے حصّہ "یادگار نالہ" میں اسی طرح درج کیا ہے اور مذکورہ بالا مصادر سے جہاں بھی نقل ہوا ہے اس کی یہی صورت ہے میں نے مطبوعہ تذکرہ سرور کے نسخے پر غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کی قیاسی تصحیح یوں کی تھی:

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا

اب یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ نسخۂ امروہہ کا متن میرے قیاس کی پوری تائید کر رہا ہے۔

(ط) نسخۂ امروہہ کے حواشی کا اضافہ:

جیسا کہ ہم نے شروع میں بتایا ہے، اس نسخے کے حاشیوں پر کسی دوسرے خط سے مندرجہ ذیل ۱۳ غزلیں حاشیوں پر اضافہ کی گئی ہیں اور یہ نسخۂ بھوپال کے متن یا حواشی میں داخل ہیں، یہ بھی اس کا ثبوت ہے کہ نسخۂ امروہہ، نسخۂ بھوپال کے مسودے

کا مسوّدہ ہے۔ حاشیے کی غزل نمبر ۲۱۶ موخر الذکر نسخے میں شامل نہیں کی گئی۔ جتنا کلام نسخۂ امروہہ کے حاشیے پر لکھا ہوا ملتا ہے اس کی ہر غزل کا مطلع یہاں لکھا جاتا ہے:

غزل (۱۱۶) غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

(حاشیہ ورق ۳۱۔ الف۔ تعدادِ اشعار ۶۔ یہ سب اشعار نسخۂ بھوپال کے متن میں داخل ہیں اور ۴ شعر اُس کے حاشیے پر درج ہیں جو ۱۲۳۷ھ کے بعد اضافے ہوئے)

غزل (۱۲۳) وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

(حاشیہ ورق ۳۲۔ ب، تعدادِ اشعار ۹۔ یہ غزل نسخۂ بھوپال کے بھی حاشیے پر تھی)

غزل (۱۳۱) وارستہ اُس سے ہیں کہ محبّت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

(حاشیہ ورق ۳۴۔ الف، تعدادِ اشعار ۱۰۔ نیز حاشیہ نسخۂ بھوپال)

غزل (۱۴۸) چاہیے خوباں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

(حاشیہ ورق ۴۸۔ الف، تعدادِ اشعار ۹ نیز آخر نسخہ بھوپال)

غزل (۱۵۲) عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

(حاشیہ ورق ۳۸۔ ب، تعدادِ اشعار ۱۰ نیز حاشیہ نسخۂ بھوپال)

غزل (۱۵۷) پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

(حاشیہ ورق ۳۹۔ ب، تعدادِ اشعار ۱۴۔ آخر نسخۂ بھوپال)

غزل (۱۷۹) جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
یارب اسے لکھ دیجیو قسمت میں عدو کی

(حاشیہ ورق ۴۱-ب، تعدادِ اشعار ۷۔ متن نسخۂ شیرانی)

غزل (۱۷۵) پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق

سامان صد ہزار نمک داں کیے ہوئے

(مطلع ندارد)

(حاشیہ ورق ۴۳-ب، تعدادِ اشعار ۱۳۔ آخر نسخۂ بھوپال)

غزل (۱۳۸) بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے

جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

(حاشیہ ورق ۴۵۔ الف، تعدادِ اشعار ۹ نیز نسخۂ شیرانی)

غزل (۱۹۳) رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے

دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

(حاشیہ ورق ۴۸-ب، تعدادِ اشعار ۷۔ متن نسخۂ شیرانی)

غزل (۲۰۳)

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے

کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

(اضافہ بر حاشیہ ورق ۵۰۔ الف، تعدادِ اشعار ۱۲۔ متن نسخۂ بھوپال)

غزل (۲۱۶) سمجھاؤ اسے یہ وضع چھوڑے

جو چاہے کرے پہ دل نہ توڑے

(حاشیہ ورق ۵۲-ب، تعدادِ اشعار ۹۔ یہ غزل غیر مطبوعہ ہے)

غزل (۲۳۰)

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے

جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

(حاشیہ ورق ۵۵-ب، تعدادِ اشعار ۷۔ نسخۂ بھوپال ۲ شعر اضافہ)۔

(ی) تعدادِ اشعار کا گوشوارہ :

ردیف	غزلیات	اشعار	ردیف	غزلیات	اشعار
الف	۵۰	۲۱۶	ع	۲	۱۱
ب	۲	۱۲	غ	۲	۱۱
ت	۲	۱۱	ف	۲	۱۱
ث	۲	۱۳	ک	۱	۵
ج	۲	۱۴	گ	۱	۹
چ	۲	۱۴	ل	۵	۳۳
ح	۱	۵	م	۵	۳۵
د	۴	۲۸	ن	۲۶	۱۷۹
ر	۷	۴۴	و	۷	۵۱
ز	۷	۴۴	ہ	۸	۵۰
س	۳	۱۶	ی	۱۱۰	۷۳۳
ش	۲	۱۴			
میزان ۱۲	۸۴	۴۳۱	۱۱	۱۶۹	۱۶۵۴

(ک) کل مشمولات کی فہرست : غزلیات

یہاں ہر غزل کے مطلع کا صرف پہلا مصرع درج کیا گیا ہے، اس کے سامنے اس زمین کے شعروں کی تعداد لکھی ہے۔ مصرع شروع میں ستارے کا نشان اس کی علامت ہے کہ یہ غزل دیوانِ غالب کے اور کسی نسخے میں نہیں ملتی۔

الف

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا (۷)

۲۔ جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا (۶)

۳۔ شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا (۶)

۴۔ خود آرا وحشت چشم پری سے شب وہ بد خو تھا (۷)

۵۔ دو یدن کے کمیں جوں ریشۂ زیر زمیں پایا (۶)

۶۔ نزاکت ہے فسون طاقت شوخی شکستن ہا (۶)

۷۔ بساں جوہر آینہ از ویرانی دلہا (۶)

۸۔ بشغل انتظار مہوشاں در خلوت شبہا (۶)

۹۔ برہن شرم ہے باوصف شوخی اہتمام اوس کا (۶)

۱۰۔ یاد روزے کہ نفس در گرہ یارب تھا (۷)

۱۱۔ شب کہ دل زخمی عرض دو جہاں تیر آیا (۶)

۱۲۔ سیر آنسوے تماشا ہے طلب گاروں کا (۷)

۱۳۔ طاؤس در رکاب ہے ہر ذرہ آہ کا (۷)

۱۴۔ یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا (۶)

۱۵۔ نہ بھولا اضطراب دم شماری انتظار اپنا (۷)

۱۶۔ بسکہ جوش گریہ سے زیر و زبر ویرانہ تھا (۹)

۱۷۔ رات دل گرم خیال جلوۂ جانانہ تھا (۷)

۱۸۔ پئے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا (۷)

۱۹۔ نہ ہو حسنِ تماشا دوست سوا بے وفائی کا (۶)

۲۰۔ کرے گر حیرت نظارہ طوفاں نکتہ گوئی کا (۷)

۲۱۔ زبس خوں گشتہ رشک وفا تھا ذوق بسمل کا (۷)

۲۲۔ فرو پیچیدنی ہے فرش بزم عیش گستر کا (۶)

۲۳۔ کیا کس شوخ نے ناز از سر تمکیں نشستن کا (۵)

۲۴۔ عیادت سے زبس ٹوٹا ہے دل یاران غمگیں کا (۷)

۲۵۔ بہار رنگ خون گل ہے ساماں اشک باری کا (۷)

٢٦۔ درد اسم حق سے دیدار صنم حاصل ہوا (٦)

٢٧۔ قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا (٧)

٢٨۔ وحشی بن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا (٥)

٢٩۔ گر نہ احوال شب فرقت بیاں ہو جائے گا (٦)

✪ ٣٠۔ تنک ظرفوں کا رتبہ جہد سے برتر نہیں ہوتا (٧)

٣١۔ لب خشک در تشنگی مردگاں کا (٦)

٣٢۔ ہے تنگ ز وا ماندہ شدن حوصلہ پا (٥)

✪ ٣٣۔ وہ فلک رتبہ کہ بر توسنِ چالاک چڑھا (٥)

٣٤۔ شب کہ ذوق گفتگو سے تیرے دل بیتاب تھا (٦)

٣٥۔ نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا (٦)

٣٦۔ شب کہ وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا (٥)

٣٧۔ شبِ اختر قدح عیش نے محمل باندھا (٩)

٣٨۔ عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا (٧)

٣٩۔ خلوت آبلۂ پا میں ہے جولاں میرا (١٠)

٤٠۔ بہ مُہر نامہ جو بوسہ گلِ پیام رہا (٧)

✪ ٤١۔ خط جو رخ پر جانشینِ ہالۂ مہ ہو گیا (٤)

٤٢ بسکہ عاجز نارسائی سے کبوتر ہو گیا (٦)

٤٣۔ یک گام بے خودی سے لوٹیں بہار صحرا (٦)

✪ ٤٤۔ دل بیتاب کہ سینے میں دم چند رہا (٥)

✪ ٤٥۔ جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا (٥)

٤٦۔ اُف نہ کی گو سوز غم سے بے محابا جل گیا (٦)

✪ ٤٧۔ نہاں کیفیت مے میں ہے سامان حجاب اوس کا (٥)

٤٨۔ زبس ہے ناز پرداز غرورِ نشہ صہبا (٥)

۴۹۔ گرفتاری میں فرمانِ خطِ تقدیر ہے پیدا (۶)

۵۰۔ سحر گر باغ میں وہ حسرتِ گلزار ہو پیدا (۶)

ب

۵۱۔ بسکہ ہے میخانہ ویراں جوں بیابانِ خراب (۷)

۵۲۔ ہے بہاراں میں خزاں پرور خیال عندلیب (۵)

ت

۵۳۔ نیرنگیِ جلوہ ہے بزم تجلی زار دوست (۶)

۵۴۔ جاتا ہوں جدھر سب کی اُٹھے ہے ادھر انگشت (۵)

ث

۵۵۔ دود شمع کشتہ گل بزم سامانی عبث (۷)

۵۶۔ ناز لطف عشق باوصف توانائی عبث (۶)

ج

۵۷۔ گلشن میں بندوبست بہ ضبط دگر ہے آج (۷)

۵۸۔ ہے لب گل کو زوا جنبیدن برگ اختلاج (۷)

چ

۵۹۔ بیدل نہ ناز وحشت جیب دریدہ کھینچ (۷)

۶۰۔ قطع سفرِ ہستی و آرام فنا ہیچ (۷)

ح

۶۱۔ دعویٰ عشق جنوں سے بگلستان گل وصبح (۵)

د

۶۲۔ بسکہ وہ پا کو بیاں در پردۂ وحشت ہیں یاد (۵)
۶۳۔ تو پست فطرت اور خیال بسا بلند (۷)
۶۴۔ حسرت دست گہ و پائے تحمل تا چند (۹)
۶۵۔ بکام دل کریں کس رنگ گم رہاں فریاد (۷)

ر

۶۶۔ شیشہ آتشیں رخ پر نور (۷)
۶۷۔ بسکہ مائل ہے وہ رشک ماہتاب آئینہ پر (۷)
✪ ۶۸۔ دنداں کا خیال چشم ترکر (۶)
۶۹۔ بنشیں بسعی ضبط جنوں نوبہار تر (۷)
۷۰۔ فسون یک دلی ہے لذت بیداد دشمن پر (۶)
۷۱۔ صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر (۶)
۷۲۔ دیا یاروں نے بے ہوشی میں درماں کا فریب آخر (۵)

ز

۷۳۔ حسن خود آرا کو ہے مشق تغافل ہنوز (۶)
۷۴۔ چاک گریباں کو ہے ربط تامل ہنوز (۶)
۷۵۔ بیگانہ وفا ہے ہوائے چمن ہنوز (۶)
۷۶۔ میں ہوں سراب یک تپش آموختن ہنوز (۷)
۷۷۔ داغ اطفال ہے دیوانہ بکہسار ہنوز (۷)
۷۸۔ نہ بندھا تھا بہ عدم نقش دل مور ہنوز (۷)
۷۹۔ کو بیاباں تمنا و کجا جولاں عجز (۷)

س

۸۰۔ حاصل، دلبستگی ہے کو نہی عمرو بس (۶)

۸۱۔ دشت الفت میں ہے خاک کشتگاں محبوس و بس (۵)

۸۲۔ کرتا ہے بیاد بت رنگیں دل مایوس (۵)

ش

۸۳۔ زجوش اعتدال فصل و تمکین بہار آتش (۹)

۸۴۔ باقلیم سخن ہے گردا فروز سواد آتش (۵)

ع

۸۵۔ جادۂ رہ خور کو وقت شام ہے تار شعاع (۶)

۸۶۔ رخ نگار سے ہے سوز جاودانی شمع (۵)

غ

۸۷۔ عشاق اشک چشم سے دھوویں ہزار داغ (۵)

۸۸۔ بلبلوں کو دور سے کرتا ہے منع بار باغ (۶)

ف

۸۹۔ نامہ بھی لکھتے ہو تو بخط غبار حیف (۶)

۹۰۔ عیسیٰ مہرباں ہے شفاریز یک طرف (۵)

ک

۹۱۔ آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیان اشک (۵)

گ

۹۲۔ گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ (۹)

ل

۹۳۔ بدر ہے آئینہ طاق ہلال (۷)
۹۴۔ ہوں بہ وحشت انتظار آوارۂ دشتِ خیال (۷)
۹۵۔ ہر عضو غم سے ہے شکن آسا شکستہ دل (۵)
۹۶۔ بہر عرضِ حالِ شبنم سے رقم ایجادِ گل (۹)
۹۷۔ گر چہ ہے یک بیضۂ طاؤس آسا تنگ دل (۵)

م

۹۸۔ اثر کمندی فریادِ نارسا معلوم (۷)
۹۹۔ ازاں جا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم (۷)
۱۰۰۔ یاں اشک جدا گرم ہیں اور آہ جدا گرم (۶)
۱۰۱۔ بس کہ ہیں بدمستِ بشکن بشکنِ میخانہ ہم (۹)
۱۰۲۔ جس دم کہ جادہ وار ہو تارِ نفس تمام (۶)

ن

۱۰۳۔ خوش وحشتے کہ عرضِ جنونِ فنا کروں (۹)
۱۰۴۔ آنسو کہوں کہ آہ سوارِ ہوا کہوں (۷)
۱۰۵۔ جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں (۹)
۱۰۶۔ جوں مردمک چشم میں ہوں جمع نگاہیں (۷)

۱۰۷۔ جائے کہ پائے سیلِ بلا درمیاں نہیں (۷)

۱۰۸۔ مرگِ شیریں ہو گئی تھی کوہکن کے فکر میں (۷)

۱۰۹۔ ہے ترحم آفریں آرائشِ بیدادیاں (۷)

۱۱۰۔ اے نوا ساز تماشا سر بکف جلتا ہوں میں (۵)

۱۱۱۔ فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں (۹)

۱۱۲۔ تنِ بہ بندِ ہوس در ندادہ رکھتے ہیں (۸)

۱۱۳۔ بغفلت عطرِ گل ہم آگہی مخمور ملتے ہیں (۷)

۱۱۴۔ سرشکِ آشفتہ سر تھا قطرہ زن مژگاں سے جانے میں (۶)

۱۱۵۔ فزوں کی دوستوں نے حرصِ قاتل ذوقِ کشتن میں (۶)

۱۱۶۔ غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں (۶)

اضافہ برحاشیہ۔ ورق ۳۱۔ الف

۱۱۷۔ خوں در جگر نہفتہ بہ زردی رسیدہ ہوں (۷)

۱۱۸۔ سودائے عشق سے دمِ سرد کشیدہ ہوں (۷)

۱۱۹۔ ہوئی ہیں آب شرمِ کوشش بے جا سے تدبیریں (۷)

۱۲۰۔ بے دماغی، حیلہ جوئی، ترکِ تنہائی نہیں (۷)

۱۲۱۔ ظاہرا سرپنجۂ افتادگاں گیرا نہیں (۷)

۱۲۲۔ ضبط سے مطلب بجز وارستگی دیگر نہیں (۷)

۱۲۳۔ وہ فراق اور وہ وصال کہاں (۸)

اضافہ برحاشیہ۔ ورق ۳۲۔ ب

۱۲۴۔ ضمانِ جادہ رو یاندن ہے خطِّ جامِ مے نوشاں (۵)

۱۲۵۔ نہیں ہے بے سبب قطرے کو شکلِ گوہر افسردن (۷)

۱۲۶۔ دیکھیے مت چشمِ کم سے سوئے ضبطِ افسردگاں (۵)

۱۲۷۔ سازشِ صلح بتاں میں ہے نہاں جنگیدن (۵)

۱۲۸۔ صاف ہے ازبسکہ عکس گل سے گلزار چمن (۷)

و

۱۲۹۔ منقار سے رکھتا ہوں بہم چاک قفس کو (۵)

۱۳۰۔ اگر وہ آفت نظارہ جلوہ گستر ہو (۵)

۱۳۱۔ وارستہ اس سے ہیں کہ محبّت ہی کیوں نہ ہو (۱۰)

اضافہ بر حاشیہ۔ ورق ۳۴۔ الف

۱۳۲۔ بیدرد سر بسجدۂ الف فرو نہو (۷)

۱۳۳۔ حسد بہیمانہ ہے دل، عالم آب تماشا ہو (۹)

۱۳۴۔ صبا دلیے تکلّف فصل کا برگ و نوا گم ہو (۸)

۱۳۵۔ خشکی مے نے تلف کی مے کدے کی آبرو (۷)

ہ

۱۳۶۔ اشک چکیدہ رنگ بریدہ (۷)

۱۳۷۔ خوشا طوطی و کنج آشیانہ (۶)

۱۳۸۔ رفتار سے شیرازۂ اجزاے قدہ باندھ (۶)

۱۳۹۔ خلق ہے صفحہ عبرت سے سبق ناخواندہ (۵)

۱۴۰۔ بسکہ مے پینے لگے بادہ کشاں پوشیدہ (۵)

۱۴۱۔ از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ (۷)

۱۴۲۔ جوشِ دل ہے نشہ ہاے فطرت بیدل نہ پوچھ (۷)

۱۴۳۔ جز دل، سراغِ درد بدل خفتگاں نہ پوچھ (۷)

ی

۱۴۴۔ ضبط سے اسپند جوں مردمِ اقامت گیر ہے (۷)

۱۴۵۔ کرے ہے رہرواں سے خضر راہ عشق جلادی (۵)

۱۴۶۔ یہ سرنوشت میں میری ہے اشک افشانی (۶)

۱۴۷۔ ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے (۱۰)

۱۴۸۔ چاہیے خوباں کو جیتنا چاہیے (۹)

اضافہ برحاشیہ۔ ورق ۳۸۔ الف

۱۴۹۔ ہر رنگ سوز پردۂ یک ساز ہے مجھے (۸)

۱۵۰۔ کہوں کیا گرم جوشی وقت مے آتش عذاروں کی (۶)

۱۵۱۔ جنوں تہمت کش تسکیں نہ ہو گو شادمانی کی

۱۵۲۔ عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی (۱۰)

اضافہ برحاشیہ۔ ورق ۳۸۔ ب

۱۵۳۔ نکوہش ہے سزا فریادی بیداد دلبر کی (۷)

۱۵۴۔ آنکھوں میں انتظار سے جاں پرشتاب ہے (۶)

۱۵۵۔ بے خود زبسکہ خاطر بیتاب ہو گئی (۵)

۱۵۶۔ ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے (۶)

۱۵۷۔ پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے (۱۴)

اضافہ برحاشیہ۔ ورق ۳۹۔ ب

۱۵۸۔ جنوں رسوائی وارستگی زنجیر بہتر ہے (۶)

۱۵۹۔ مژہ پہلوے چشم اے جلوۂ ادراک باقی ہے (۶)

۱۶۰۔ خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے (۷)

۱۶۱۔ زبسکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے (۵)

۱۶۲۔ ترجبیں رکھتی ہے شرم قطرہ سامانی مجھے (۷)

۱۶۳۔ ہم زباں آیا نظر فکر سخن میں تو مجھے (۵)

۱۶۴۔ باعث واماندگی ہے عمر فرصت جو مجھے (۵)

۱۶۵۔ یاد ہے شادی میں عقد نالۂ یارب مجھے (۶)
۱۶۶۔ کاوش وزد حنا پوشیدہ افسوں ہے مجھے (۵)
۱۶۷۔ دیکھ تری خوے گرم دل بہ تپش رام ہے (۷)
۱۶۸۔ بسکہ سودائے خیال زلف وحشت ناک ہے (۷)
۱۶۹۔ جنس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی (۷)

اضافہ برحاشیہ۔ ورق ۱۴۱۔ ب

۱۷۰۔ چشم خوباں مے فروش نشہ زار ناز ہے (۷)
۱۷۱۔ بسکہ حیرت سے زپا افتادۂ زنہار ہے (۷)
۱۷۲۔ کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جائیے (۷)
۱۷۴۔ کاشانہ ہستی کہ برانداختنی ہے (۷)
۱۷۵۔ سامان صد ہزار نمک داں کیے ہوئے (۱۳)

اضافہ برحاشیہ۔ ورق ۴۳۔ ب

۱۷۶۔ حکم بیتابی نہیں اور آرمیدن منع ہے (۷)
۱۷۷۔ چارسوے عشق میں صاحب دوکانی مفت ہے (۶)
۱۷۸۔ بیتابی یار دوست ہمرنگ تسلی ہے (۷)
۱۷۹۔ گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے (۵)
۱۸۰۔ دریوزۂ ساماں ہا اے بے سروسامانی (۷)
۱۸۱۔ نظر بہ نقص گدایاں کمال بے ادبی ہے (۷)
۱۸۲۔ دلا، غلط ہے تمنائے خاطر افروزی (۶)
۱۸۳۔ بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے (۹)
۱۸۴۔ خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے (۶)
۱۸۵۔ اگر گل حسن و الفت کی بہم جوشیدنی جانے (۸)
۱۸۶۔ گلستان یک تماشا پیش پا افتادہ مضموں ہے (۷)

۱۸۷۔ صبح سے معلوم آثار ظہور شام ہے (۶)

۱۸۸۔ دیکھتا ہوں وحشت شوق خروش آمادہ سے (۶)

۱۸۹۔ اے خیال وصل نادر ہے مے آشامی تری (۷)

۱۹۰۔ چشم گریاں بسمل شوق بہار دید ہے (۵)

۱۹۱۔ وہ مژۂ بر آہ رویانیدن از دل تیز ہے (۶)

۱۹۲۔ نظر پرستی و بیکاری خود آرائی (۸)

۱۹۳۔ رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے (۷)

اضافہ بر حاشیہ۔ ورق ۴۸ ب

۱۹۴۔ گدائے طاقت تقریر ہے زباں تجھ سے (۹)

۱۹۵۔ شکل طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے (۱۱)

۱۹۶۔ باغ تجھ بن گل نرگس سے ڈراتا ہے مجھے (۹)

۱۹۷۔ قتل عشاق نہ غفلت کش تدبیر آوے (۷)

۱۹۸۔ تشنۂ خون تماشا جو وہ پانی مانگے (۱۱)

۱۹۹۔ ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے (۸)

۲۰۰۔ فرصت آئینہ صد رنگ خود آرائی ہے (۷)

۲۰۱۔ داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے (۸)

۲۰۲۔ گریہ سرشاری شوق بہ بیاباں زدہ ہے (۷)

۲۰۳۔ درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے (۱۲)

اضافہ بر حاشیہ۔ ورق ۵۰۔ الف

۲۰۴۔ خواب غفلت بہ کمیں گاہ نظر پنہاں ہے (۷)

۲۰۵۔ دامان دل بوہم تماشا نہ کھینچیے (۷)

۲۰۶۔ تا چند ناز مسجد و میخانہ کھینچیے (۷)

۲۰۷۔ کرتا ہے گل جنوں تماشا کہیں جسے (۷)

۲۰۸ ۔ منت کشی میں حوصلہ بے اختیار ہے (۷)
۲۰۹ ۔ مستی بذوق غفلت ساقی ہلاک ہے (۵)
۲۱۰ ۔ حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ہے (۵)
۲۱۱ ۔ خود فروشی ہائے ہستی بسکہ جائے خندہ ہے (۶)
۲۱۲ ۔ شوخی شرابِ جولاں آبیار نغمہ ہے (۷)
۲۱۳ ۔ نشۂ مے بے چمن، دود چراغ کشتہ ہے (۷)
۲۱۴ ۔ عبارت بسکہ تجھ سے گرمی بازار بستر ہے (۵)
۲۱۵ ۔ خطر ہے رشتۂ الفت رگ گردن نہ ہو جاوے (۵)
۲۱۶ ۔ سمجھاؤ اسے یہ وضع چھوڑے (۹) [اضافہ برحاشیہ ۔ ورق ۵۲ ۔ ب]
۲۱۷ ۔ نوائے خفتۂ الفت اگر بیدار ہو جاوے (۷)
۲۱۸ ۔ دل بیمار از خود رفتہ تصویر نہالی ہے (۶)
۲۱۹ ۔ شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے (۸)
۲۲۰ ۔ زلف سیہ افعی نظر بد قلمی ہے (۵)
۲۲۱ ۔ اس قامت رعنا کی جہاں جلوہ گری ہے (۵)
۲۲۲ ۔ تا چند نفس غفلت ہستی سے بر آوے (۹)
۲۲۳ ۔ تحیر ہے گریباں گیر ذوق جلوہ پیرائی (۱۱)
۲۲۴ ۔ غم و عشرت قدم بوس دل تسلیم آئیں ہے (۹)
۲۲۵ ۔ محو آرامیدگی سامان بیتابی کرے (۵)
۲۲۶ ۔ اے خوشا وقتے کہ ساقی یک خمستان وا کرے (۷)
۲۲۷ ۔ چاک کی خواہش اگر وحشت بعریانی کرے (۵)
۲۲۸ ۔ بہ نقص ظاہری رنگ کمال طبع پنہاں ہے (۶)
۲۲۹ ۔ جہاں زندان موجستان دہلے پریشاں ہے (۶)
۲۳۰ ۔ کیا تنگ ہم ستم زدگان کا جہان ہے (۷) [اضافہ برحاشیہ ۔ ورق ۵۵ ۔ ب

۲۳۱ - ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک افغاں ہے (۷)
۲۳۲ - تغافل مشربی سے ناتمامی بسکہ پیدا ہے (۶)
۲۳۳ - اثر سوز محبّت کا قیامت بے محابا ہے (۶)
۲۳۴ - بہ بزم مے پرستی حسرت تکلیف بے جا ہے (۷)
۲۳۵ - بہرہ پروردن، سراسر لطف گستر سایہ ہے (۴)
✪ ۲۳۶ - وہ نہا کر آب گل سے سایہ گل کے تلے (۵)
۲۳۷ - جوہر آئینہ ساں مژگاں بدل آسودہ ہے (۷)
۲۳۸ - بہار تعزیت آباد عشق ماتم ہے (۵)
۲۳۹ - عذار یار نظر بند چشم گریاں ہے (۷)
۲۴۰ - شفق بدعوی عاشق گواہ رنگیں ہے (۷)
✪ ۲۴۱ - روتا ہوں بسکہ در ہوس تارمیدگی (۵)
۲۴۲ - عاشق نقاب جلوۂ جانانہ چاہیے (۵)
۲۴۳ - یوں بعد ضبط اشک پھرا گرد دریا کے (۷)
۲۴۴ - بہ فکر حیرت رم آئینہ پرداز زانو ہے (۷)
✪ ۲۴۵ - بدست آوردن دل گوہر دریائے شاہی ہے (۵)
✪ ۲۴۶ - نہ چھوڑو محفل عشرت میں جائے میکشاں خالی (۷)
۲۴۷ - ہوا جب حسن کم، خط بر عذار سادہ آتا ہے (۵)
۲۴۸ - نگاہ سرمہ سا نے عرض تکلیف شرارت کی (۵)
۲۴۹ - خدایا دل کہاں تک دن بصد رنج و تعب کاٹے (۵)
۲۵۰ - تماشائے جہاں مفت نظر ہے (۷)
۲۵۱ - بس کہ زیر خاک با آب طراوت راہ ہے (۵)
۲۵۲ - بس کہ چشم از انتظار جوش خطاں بے نور ہے (۷)
۲۵۳ - سوختگاں کی خاک میں ریزش نقش داغ ہے (۵)

(ل) رباعیات فارسی

- ✪ ۱۔ اے رونق مدعاے تمکیں مددے
- ✪ ۲۔ لیلیٰ بہوا عناں سپرد افسوں را
- ✪ ۳۔ اے حسن مخور فریب رعنائی ہا
- ✪ ۴۔ ندرت کشش بکارگاہ تحریر
- ✪ ۵۔ ایں بادہ کہ از میکدۂ جم آمد
- ✪ ۶۔ گوئی کہ ہنوز جستجو خواہی کرد
- ✪ ۷۔ آں را کہ دلے بہ بیکسی ہم خانہ است
- ✪ ۸۔ ہر چند جنوں فسردہ ساماں نبود
- ✪ ۹۔ مرد آں کہ بوہم خود ہراساں نبود
- ✪ ۱۰۔ پیمانہ بزم عیش ما گوشش خود است
- ۱۱۔ شاہیم و جنون ما ز تمکیں دلتنگ
- ✪ ۱۲۔ انگور کز و ست انجمن پردازی
- ۱۳۔ گفتم کہ اسد گفت دل آشفتہ من

(م) رباعیات اردو

- ۱۔ ہر چند کہ دوستی میں کامل ہونا
- ۲۔ بعد از اتمام بزم عید اطفال
- ۳۔ شب زلف و رخ عرق فشاں کا غم تھا
- ۴۔ دل تھا کہ جو جان درد تمہید سہی
- ۵۔ ساماں ہزار جستجو یعنی دل
- ۶۔ اے کاش بتاں کا خنجر سینہ شگاف

۷ - اے کثرتِ فہم بے شمار اندیشہ
۸ - بے گریہ کمالِ ترجبینی ہے مجھے
۹ - گر جوہرِ امتیاز ہوتا ہم میں
۱۰ - ہے خلق اسد قماش لڑنے کے لیے
گلخن شررِ اہتمام بسترہے آج
✪ ۱۱ -

(ن) مرزا غالب کی ۱۹ غیر مطبوعہ غزلیں اور ۱۳ رباعیاں

(ورق ۷ - الف)

(۱)

فروپیچیدنی ہے فرش، بزم عیش گستر کا
دریغا، گردش آموز فلک ہے دور ساغر کا

خط توخیز کی، آئینہ میں دی کس نے آرایش
کہ ہے تہ بندی پر ہائے طوطی، زنگ جوہر کا[1]

گیا جو نامہ بر، واں سے برنگ باختہ آیا
خطوط روئے تالیں، نقش ہے پشت کبوتر کا

شکست گوشہ گیراں، ہے فلک کو حاصل گردش
صدف سے، آسیائے آب میں ہے دانہ گوہر کا

فزوں ہوتا ہے ہر دم، جوش خوں باری، تماشا ہے
نفس کرتا ہے رگہائے[2] مژہ پر کام نشتر کا

خیالِ شربت عیسیٰ، گدازِ ترجبینی ہے
اسد ہوں مست، دریا بخشیِ ساقیِ کوثر کا

(غزل نمبر ۲۲، تعدادِ اشعار ۷)

---

[1] شعر ۲، ۳، ۴ قلم زد کر دیے ہیں، مگر پوری غزل غیر مطبوعہ ہے اور دیوانِ غالب کے کسی نسخے میں نہیں ملتی۔

[2] پہلے "برگہائے مژگاں" لکھا تھا، بعد میں ترمیم کی۔

(۲)

(ورق ۹۔ الف)

تنک ظرفوں کا رتبہ، جہد سے برتر نہیں ہوتا
حبابِ مے، بصد بالیدنی، ساغر نہیں ہوتا

عجب، اے آبلہ پایانِ صحرائے نظر بازی[1]
کہ تارِ جادۂ رہ، رشتۂ گوہر نہیں ہوتا

خوشا عجزے کہ عاشق جل بجھے جوں شعلۂ خاشاک
کہ کم از سرمہ اس کا مشتِ خاکستر نہیں ہوتا

تماشائے گل و گلشن ہے، مفتِ سر مجیبی ہا
بہ از چاکِ گریباں، گلستاں کا در نہیں ہوتا

نہ رکھ چشمِ حصولِ نفع، صحبت ہائے ممسک سے
لبِ خشکِ صدف، آبِ گہر سے تر نہیں ہوتا

نہ دیکھا کوئی ہم نے آشیاں بلبل کا گلشن میں
کہ جس کے در پہ غنچہ شکلِ قفلِ زر نہیں ہوتا

صفا کب جمع ہو سکتی ہے، غیر از گوشہ گیری ہا
صدف بن قطرۂ نیساں اسد گوہر نہیں ہوتا

(غزل نمبر ۳۰ تعداد اشعار ۷)

(۳)

(ورق ۹۔ ب)

وہ فلک رتبہ، کہ بر توسنِ چالاک چڑھا
ماہ پر، ہالہ صفت، حلقہ فتراک چڑھا

نشۂ مے کے اُتر جانے کے غم سے انگور
صورتِ اشک، بہ مژگانِ رگِ تاک چڑھا

---

[1] پہلے "نظر بازی" کی جگہ "محبت ہا" لکھا تھا جسے قلم زد کر دیا۔

بوسۂ لب سے ملی، طبع کو کیفیتِ خال
مے کشیدن سے مجھے، نشّۂ تریاک چڑھا
میں جو گردوں کو بمیزان طبیعت تولا
تھا یہ کم وزن، کہ ہم سنگِ کفِ خاک چڑھا
اے اسد واشدنِ عقدۂ غم گر چاہے
حضرتِ زلف میں جُوں شانہ، دلِ چاک پہ چڑھا
(غزلِ نمبر ۳۳، تعدادِ اشعار ۵)

(۴)

(ورق ۱۱۔ب)

خط جو رخ پر جانشینِ ہالۂ مہ ہوگیا
ہالہ، دُودِ شعلۂ جوّالۂ مہ ہوگیا
حلقۂ گیسو کھلا دورِ خطِ رخسار پر
ہالۂ دیگر، یہ گرد ہالۂ مہ ہوگیا
شب کہ مست دیدنِ مہتاب تھا وہ جامہ زیب
پارہ چاک کتاں پر کالۂ مہ ہوگیا
شب کہ وہ گل باغ میں تھا جلوہ فرما اے اسد
داغ مہ جوشِ چمن سے لالۂ مہ ہوگیا
(غزلِ نمبر ۴۱، تعدادِ اشعار ۴)

(۵)

(ورق ۱۲۔ب)

دل بیتاب کہ سینے میں دمِ چند رہا
بدمِ چند، گرفتار غم چند رہا
زندگی کے ہوئے ناگہ نفسِ چند تمام
کوچۂ یار جو مجھ سے قدمِ چند رہا

لکھ سکا میں نہ اُسے شکوۂ پیماں شکنی
لاجَرَم توڑ کے عاجز، قلم چند رہا

اُلفتِ زر ہمہ نقصاں ہے، کہ آخر قاروں
زیرِ بارِ غم دام و درم چند رہا

عمر بھر ہوش نہ یک جا ہوئے میرے کہ اسد
میں پرستندۂ روئے صنم چند رہا

(غزل نمبر ۴۴، تعدادِ اشعار ۵)

(۶)

(ورق ۱۲۔ ب)

جگر سے ٹوٹی ہوگئی سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا[1]

بسانِ سبزہ رگِ خواب ہے زباں ایجاد
کرے ہے خامشی احوالِ بےخوداں ایجاد

صفا و شوخی و اندازِ حسن پا بر کاب
خطِ سیاہ سے ہے گردِ کارواں پیدا

نہیں ہے آہ کو ایمائے تیر بالیدن
وگرنہ ہے خمِ تسلیم سے کماں پیدا

نصیبِ تیرہ، بلا گردشِ آفریں ہے اسد
زمیں سے ہوتے ہیں صد دامنِ آسماں پیدا

(غزل نمبر ۴۵، تعدادِ اشعار ۵)

---

[1] صرف یہ مطلع اعظم الدولہ سرور کے تذکرہ "عمدۂ منتخبہ" میں موجود ہے۔ غزل کے باقی اشعار کسی نسخے میں نہیں ملتے۔

(۷)

(ورق ۱۳ ـ الف)

نہاں کیفیتِ مے میں ہے، سامانِ حجاب اُس کا
بُنا ہے پنبۂ مینا سے ساقی نے نقاب اُس کا

اگر اُس شعلہ رو کو دوں پیامِ مجلس افروزی[1]
زبانِ شمعِ خلوت خانہ، دیتی ہے جواب اُس کا

عیاں کیفیتِ مے خانہ ہے، جوے گلستاں میں
کہ مے عکسِ شفق ہے اور ساغر ہے حباب اُس کا

اُٹھائے میں نے جو اُفتادگی میں متّصل صدمے
کروں گا اشک ہاے واچکیدہ سے حساب اُس کا

اسد کے واسطے رنگے بروے کار ہو پیدا
غبارِ آوارہ و سرگشتہ ہے یا بوتراب اُس کا

(غزل نمبر ۴، تعدادِ اشعار ۵)

(۸)

(ورق ۱۳ ـ الف و ب)

زبس ہے نازپردازِ غرورِ نشّۂ صہبا
رگِ بالیدۂ گردن ہے موجِ بادہ در مینا

در آبِ آئینہ، از جوشِ عکسِ گیسوے مشکیں
بہارِ سنبلستاں جلوہ گر ہے، آنسوے دریا

(ورق ۱۳ ـ ب)

کہاں ہے دیدۂ روشن، کہ دیکھے بے حجابانہ
نقابِ یار ہے ازپردہ ہاے چشمِ نابینا

---

[1] مجلس آرائی کو قلم زد کر کے مجلس افروزی بنایا ہے۔

نہ دیجے پاسِ ضبطِ آبرو وقتِ شکستن بھی
تحمل پیشۂ تمکین رہیے، آئینہ آسا

اسد طبعِ متیں سے گر نکالوں شعر برجستہ
شرر ہو قطرۂ خونِ فسردہ در رگِ خارا

(غزل نمبر ۲۸، تعدادِ اشعار ۵)

(۹)

(ورق ۳۳- الف)

ضمانِ جادہ رویاندن ہے خطِ جامِ مے نوشاں
وگرنہ منزلِ حیرت سے کیا واقف ہیں مدہوشاں

نہیں ہے ضبط جُز مشاطگی ہائے غم آرائی
کہ میلِ سُرمہ، چشمِ داغ میں ہے آہ خاموشاں

بہ ہنگامِ تصوّر، ساغرِ زانو سے پیتا ہوں
مئے کیفیتِ خمیازہ ہائے صبح آغوشاں

نشانِ روشنیِ دل نہاں ہے تیرہ بختوں کا
نہیں محسوس دودِ مشعلِ بزمِ سیہ پوشاں

پریشانی اسد در پردہ ہے سامانِ جمعیت
کہ ہے آبادیِ صحرا ہجومِ خانہ بر دوشاں

(غزل نمبر ۱۲۴- تعدادِ اشعار ۵)

(۱۰)

(ورق ۳۳- الف)

نہیں ہے بے سبب قطرے کو شکلِ گوہر افسردن
گرہ ہے حسرتِ آبے بروئے کار آوردن

مہِ نو سے ہے رہزن وار نعل واژگوں باندھا
نہیں ممکن بجولاں ہائے گردوں دخلِ بے بُردن

خمارِ ضبط سے بھی، نشّۂ اظہار پیدا ہے
تراوشِ شیرۂ انگور کی ہے مفتِ افسردن

خراب آبادِ غربت میں عبث افسوسِ ویرانی
گل از شاخ دور افتادہ، ہے نزدیکِ پژمردن

فغان و آہ سے حاصل بجز دردِ سرِ یاراں
خوشا اے غفلت آگاہاں، نفس وزدیدن و مردن

دریغا بستنِ رختِ سفر سے ہو کے میں غافل[1]
رہا پامال حسرت ہائے فرشِ بزم گستردن

اسد ہے طبع مجبور تمنّا آفرینی ہا
فغاں بے اختیاری و فریبِ آرزو خوردن

(غزل نمبر ۱۲۵، تعدادِ اشعار ۷)

(۱۱)

(ورق ۳۳ - ب)

سازشِ صلح بتاں میں ہے نہاں جنگیدن
نغمہ و چنگ ہیں جوں تیر و کماں فہمیدن

بسکہ شرمندۂ بوئے خوشِ گلرویاں ہے
نکہتِ گل کو ہے غنچے میں نفس دزدیدن

ہے فروغِ رخِ افروختۂ خوباں سے
شعلۂ شمع پر افشانِ بخود لرزیدن

گلشنِ زخم کھلاتا ہے جگر میں پیکاں
گرہِ غنچہ ہے، سامانِ چمن بالیدن

---

[1] مصرع میں ترمیم کی ہے، پہلے یوں لکھا تھا: دریغا ہو کے از بربستنِ رختِ سفر غافل۔

چمن دہر میں ہوں سبزۂ بیگانہ اسد
وائے اے بے خودی و تہمتِ آرامیدن

(غزل نمبر ۱۲۷، تعدادِ اشعار ۵)

(۱۲)

(ورق ۳۷-ب)

کرے ہے رہرواں سے خضرِ راہِ عشق جلادی
ہُوا ہے موجۂ ریگِ رواں شمشیرِ فولادی

نظر بند تصوّر ہے، قفس میں لطفِ آزادی
شکستِ آرزو کے رنگ کی کرتا ہوں صیّادی

کرے ہے حسن ویراں کا رُروئے سادہ رُویاں پر
غبارِ خط سے تعمیرِ بنائے خانہ بربادی

چنار آسا، عدم سے با دلِ پُر آتش آیا ہوں
تہی آغوشیِ دستِ تمنّا کا ہوں فریادی

اسد از بسکہ فوجِ درد و غم سرگرم جولاں ہے
غبارِ راہ ویرانی ہے، ملکِ دل کی آبادی

(غزل نمبر ۱۳۵، تعدادِ اشعار ۵)

(۱۳)

(ورق ۵۲-ب حاشیہ)

سمجھاؤ اُسے، یہ وضع چھوڑے
جو چاہے کرے، پہ دل نہ توڑے [۱]

تقریر کا اُس کی حال مت پوچھ
معنی ہیں بہت و لفظ تھوڑے

---

[۱] یہ غزل نسخۂ امروہہ کے حاشیے پر کسی اور شخص کے قلم سے اضافہ ہوئی ہے اور دیوانِ غالب کے کسی معلوم نسخے میں نہیں ملتی۔

نذرِ مژہ کر دل و جگر کو
چھیڑے ہی سے جائیں گے یہ پھوڑے

عاشق کو یہ چاہیے ہرگز
اندوہ سے (اپنا) منہ نہ موڑے[1]

آجا لبِ بام، کوئی کب تک
دیوار سے اپنے سر کو پھوڑے

جاتے ہیں رقیب کو خط اُس کے
کاغذ کے دوڑتے ہیں گھوڑے

قطعہ

غم خوار کو ہے قسم، کہ زنہار
غالب کو نہ تشنہ کام چھوڑے

حسرت زدۂ طرب ہے یہ شخص
دم جب کہ بوقت نزع توڑے

پانی نہ چھوائے اُس کے منہ میں
گل مے میں بھگو بھگو نچوڑے

(غزل نمبر ۲۱۶، تعدادِ اشعار ۹)

(۱۴)

(ورق ۵۴ ۔ الف)

اس قامتِ رعنا کی جہاں جلوہ گری ہے
تسلیم فروشی روشِ کبکِ دری ہے

---

[1] کوئی لفظ 'اندوہ سے' کے بعد لکھنے سے رہ گیا ہے ہم نے وزن پورا کرنے کے لیے لفظ (اپنا) قوسین میں اضافہ کر دیا ہے۔

شرمندۂ الفت ہوں، مداواطلبی سے
ہر قطرۂ شربت مجھے اشکِ شکری ہے

سرمایۂ وحشت ہے دلا، سایۂ گلزار
ہر سبزۂ نوخاستہ یاں بالِ پری ہے

روشن ہوئی یہ بات دمِ نزع کہ آخر
فانوس کفن بہرِ چراغ سحری ہے

ہم آئے ہیں غالب رہِ اقلیم عدم سے
یہ تیرگیِ حال، لباسِ سفری ہے

(غزل نمبر ۲۲۱، تعدادِ اشعار ۵)

(۱۵)

(ورق ۵۸-الف)

روتا ہوں بسکہ در ہوسِ آرمیدگی
جوں گوہر اشک کو ہے فرامُش چکیدگی

بر خاک افتادگیِ کشتگانِ عشق
ہے سجدۂ سپاس، بہ منزل رسیدگی

انساں نیاز مندِ ازل ہے کہ جوں کماں
مطلب ہے ربط سے رگ و پے کی خمیدگی

ہے بسمل ادائے چمن عارضاں، بہار
گلشن کو رنگِ گل سے ہے در خوں طپیدگی

دیکھا نہیں ہے ہم نے بہ عشقِ بتاں اسد
غیر از شکستہ حالی و حسرت کشیدگی

(غزل نمبر ۲۴۰، تعدادِ اشعار ۵)

(۱۶)

(ورق ۵۷ - الف)

وہ نہا کر آبِ گل سے، سایۂ گل کے تلے
بال کس گرمی سے، سُکھلاتا تھا سنبل کے تلے

کثرتِ جوشِ سویدا سے، نہیں تل کی جگہ
خال کب مشاطہ دے سکتی ہے کاکل کے تلے

بسکہ خوباں باغ کو دیتے ہیں وقتِ مے شکست
بال اوگ جاتا ہے شیشے کا رگِ گل کے تلے

ہے پر افشاندن طپیدن ہا بتکلیف ہوس
ورنہ صد گلزار ہے یک بالِ بلبل کے تلے

پے بہ مقصد بُردنی ہے، خضرِ مے سے اے اسد
جادۂ منزل ہے خط ساغرِ مل کے تلے

(غزل نمبر ۲۳۵، تعدادِ اشعار ۵)

(۱۷)

(ورق ۵۹ - الف)

بدست آوردنِ دل، گوہر دریائے شاہی ہے
وگرنہ حاتم دستِ سلیماں، فلسِ ماہی ہے

سخن تاریک طبعوں کا، ہے اظہار کثافت ہائے[1]
کہ رنگِ خامۂ فولاد، مانا مے سیاہی ہے

خمیدن نشۂ مے میں ہے، شرم زشت اعمالی
دماغ زُہد میں آخر غرورِ بے گناہی ہے

---

[1] غالب نے سہواً 'کسافتہا' لکھا ہے۔

نہیں ہے خالی آرایش سے، بے سامانیِ عاشق
شکستِ حال، اندازِ آفرینِ کجکلاہی ہے

اسد خوباں بھی دورِ چرخ سے رنجیدہ خاطر ہیں
گریباں چاکی گلہا، نشانِ دادخواہی ہے

(غزل نمبر ۲۴۴، تعدادِ اشعار ۵)

(۱۸)

(ورق ۵۹ - الف)

نہ چھوڑو محفلِ عشرت میں جا اے مے کشاں خالی
کمیں گاہ بلا ہے، ہو گیا شیشہ جہاں خالی

نہ دوڑا ریشۂ دیوانگی، صحنِ بیاباں میں
کہ تارِ جادہ سے ہے، سُبحۂ ریگِ رواں خالی

دکانِ ناوکِ تاثیر ہے، از خود تہی ماندن
سراسر عجز ہو کر، خانہ مانندِ کماں خالی

محبّت ہے نوا سازِ فغاں، در پردۂ دلہا
کرے ہے مغز سے مانندِ نے کے استخواں خالی

عبث ہے خطِ ساغر جلوہ، طوقِ گردنِ قمری
مئے الفت سے ہے مینائے سروِ بوستاں خالی

نہ بھولو ریزشِ اعداد کی قطرہ فشانی پر
عزیزاں، ہے برنگِ صفر، جامِ آسماں خالی

اسد ہنستے ہیں میرے گریہ ہائے زار پر مردم
بھرا ہے دہر بیدردی سے، دل کیجے کہاں خالی

(غزل نمبر ۲۴۵، تعدادِ اشعار ۷)

(۱۹)

(ورق ۶۰- الف)

تماشائے جہاں مفت نظر ہے
کہ یہ گلزار، باغ رہ گزر ہے

جہاں شمعِ خموشی جلوہ گر ہے
پرِ پروانگاں بالِ شرر ہے

بجیب اشک چشم سرمہ آلود
مسی مالیدہ دندان گہر ہے

شفق ساں، موجۂ خوں ہے رگِ خواب
کہ مژگان کشودہ نیشتر ہے

کرے ہے روے روشن آفتابی
غبارِ خط رخ، گرد سحر ہے

ہوئی یک عمر صرفِ مشقِ نالہ
اثر موقوف بر عمرِ دگر ہے

اسد ہوں میں پر افشان رمیدن
سوادِ شعر در گردِ سفر ہے

(غزل نمبر ۲۴۹، تعدادِ اشعار ۷)

رباعیات فارسی

(غیر مطبوعہ)

(ورق ۶۱- الف)

اے رونقِ مدعائے تمکیں مددے
جان و دلِ خاتم النبییں مددے

اے قبلہ و قبلہ گاہ ایماں، نظرے
وے خانہ خدائے کعبۂ دیں مددے

(۲)

لیلیٰ، بہوا عناں سپرد افسوں را
زنگ است کہ بستہ در گرہ ہاموں را
از بسکہ بعجز می کشد بارِ وفا
دل در برِ ناقہ می طپد مجنوں را

(۳)

(ورق ۶۱-ب)

اے حسن مخور فریبِ رعنائی ہا
عشق است و ہزار کار فرمائی ہا
آئینہ نمد در آب دارد غافل
چیزے می خواہد ایں خود آرائی ہا

(۴)

ندرت کشیش بکارگاہِ تحریر
گر خواب زند نقش ببالد تعبیر
گردد ز تحیر فسوں پردازی
بالِ قلمش، نگہ بچشم تصویر

(۵)

ایں بادہ کہ از مے کدۂ جم آمد
پیمانۂ عشرت دو عالم آمد
بر چہرۂ نامِ خویش صادے کردم
یعنی ایں جا بچشم خواہم آمد

(۶)

گوئی کہ ہنوز جستجو خواہی کرد
عشق بتِ دیگر آرزو خواہی کرد

اے عمر چہ می فریبی از طولِ امل
با ما کہ وفا کرد کہ تو خواہی کرد

(۷)

آں را کہ دلے بہ بیکسی ہم خانہ است
گلزارِ زمانہ، سبزۂ بیگانہ است

با ہم چو منے کہ دوستی دشمنِ اوست
سگ نیز اگر وفا کند دیوانہ است

(۸)

ہر چند جنوں فسردہ ساماں نبود
بد مستی و ہوشیاری آساں نبود

گشتند نظر پرست نادانے چند
غافل کہ نظر پرست ناداں نبود

(۹)

(ورق ۶۲۔ الف)

مرد آں کہ بوہمِ خود ہراساں نبود
در بندِ طلسمِ نفع و نقصاں نبود

ہمواری وضع را، تغافل شرط است
اے مدعیاں، کریم ناداں نبود

(۱۰)

پیمانۂ بزمِ عیش ما، گوشِ خود است
صاف مئے ما، ترانۂ جوشِ خود است

ہر جا کہ قدیم نہیم، آغوشِ خوداست
آینہ مدام، خانہ بردوشِ خوداست

(۱۱)

انگور کز اوست انجمن پردازی
می ریزی وسبحۂ خودش می سازی
اے محتسب، آخر از خدا می ترسی؟
بازی بازی، بریشِ بابا بازی!

(۱۲)

گفتم کہ اسد؟ گفت: دل آشفتۂ من
گفتم نفسش؟ گفت: بجوں خفتۂ من
گفتم: "سخنش بایں نزاکت گفتن"؟
گفت: "ایں ہمہ مدعاے ناگفتۂ من"

رباعی اردو

(ورق ۶۳۔ الف)

گلخن شررِ اہتمام بستر ہے آج
یعنی تب عشق شعلہ پرور ہے آج
ہوں درد ہلاک نامہ برسے بیمار
قارورہ مرا خونِ کبوتر ہے آج

(اپریل ۱۹۶۹ء)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تاریخ چهاردهم رجب المرجب یوم سه شنبه سنه هجری وقت ظهر روز باتمام

فقیر سهیل ابراهیم خان عرف میرزا نوشته متخلص به آسه عفی الله عنه از تحریر دیوان

حسرت عنوان خود فراغت یافته به فکر کاوش نقد این دیگر رجوع بجناب ... میرزا علیه الرحمه

آورده

دیوانِ غالب۔ نسخۂ امروہہ کے بارے میں

نو دریافت دیوانِ غالب بخطِ غالب نسخۂ امروہہ کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند نے ایک اہم سوال پیش کیا تھا جس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اُنھوں نے لکھا تھا:

"شفیق الحسن نے اپنی ڈائری میں مخطوطے کو ۱۸۲۵ء کا مکتوبہ کیونکر لکھا، اس کی تاویل سے میں معذور ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مخطوطہ فروخت کرتے وقت شفیق الحسن کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ نسخہ ۱۸۲۵ء کا مکتوبہ ہے۔ یہ بات بعد میں معلوم ہوئی ہو گی"۔

("ہماری زبان" ۸ر دسمبر ۱۹۷۰ء)

یہ صحیح ہے کہ شفیق الحسن بھوپالی کو اُس کے زمانۂ کتابت کا علم نہ تھا۔ اس کی واقعی اہمیت اور قدر و قیمت معلوم تھی، لیکن وہ یہ ضرور جانتے تھے کہ یہ بخطِ غالب ہے مگر اُن کی ڈائری کا جو اقتباس ڈاکٹر ابو محمد سحر نے "ہماری زبان" میں چھپوایا تھا، اُس میں نسخہ ۱۸۲۵ء کا مکتوبہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دیوانِ غالب ایک شکستہ سی پُرانی گتّے کی جلد میں تھا، جس کی اَبری بھی ختم ہو چکی تھی۔ پہلے ورق سے ورق ۳۷ تک یہی نسخہ تھا اور ورق ۴۶ سے ایک "قصہ لیلیٰ مجنوں" فارسی نثر کا شروع ہو جاتا تھا جسے شفیق الحسن صاحب

نے غالبؔ کے مکتوباتِ فارسی سمجھا ہے اور اُس کا حوالہ اپنی ڈائری میں دیا ہے۔

اس قصّے کا خط شکستہ، عنوانات شنگرفی، مسطر دس سطری تھا اور یہ ۴۵ ورقوں پر لکھا ہوا تھا۔ ورق ۱۔الف سادہ تھا۔ جس پر بائیں طرف کونے میں لکھا تھا "بتاریخ بست و پنج اکتوبر شروع شد"۔ ورق ۱۔ب سے اصل قصّے کا آغاز تھا۔ "مجنونِ بیابانِ امکان راچہ امکان کہ لیلیِ شہرستانِ وجود را بسخن سراید"۔ حمد و نعت کے بعد ورق ۴۔ب پر سببِ تالیف این تصنیف" کے عنوان سے لکھا گیا تھا:

"حاتمِ زماں، خان خانانِ دوراں در سنہ یک ہزار و یک صد و شصت و ہفت کہ بعد واقعہ شہادتِ حاتمِ زمان خانخانان دوران مغفرت نشان جمال خان، وانقلابِ اوضاعِ زماں در حالتِ اضطراب اتّفاقِ سفرِ پنجاب اُفتاد و مکروہاتِ جانفرسا و وارداتِ آرام رُبا رُوداد۔ طبیعتِ وحشی را حالتِ مُوحش پیش آمد کہ با خود ربط مُوانستش نماند بانسِ دیگرے چہ رسد۔ دراں حالت شغلِ مطالعۂ کتب مُوجبِ رفعِ یک گونہ ملالت می شود۔ اتّفاقاً دراں وقتِ جنون افزا قصّۂ مجنوں و لیلیٰ و احوالِ آں دو پاکباز با صفا بنظر آمد و طبیعت را بمقتضائے مجانستِ وحشت ذوقِ تالیفش پیدا شد۔ عبارتے چوں احوالِ مجنوں بے سر و سامان و مضمونے مانندِ زلفِ لیلیٰ پریشان کہ فی الحقیقت نسخۂ خاطرِ نگران و ترجمۂ دلِ حیران بود بتکلیفِ وقت ترقیم نمود"۔

ورق ۵۔الف سے آغاز قصہ تھا:

"در ملکِ عرب بادشاہے بود والا قدر فرمانِدہے عالی فرؔ"۔

ورق ۴۲۔ب پر بعنوانِ خاتمہ لکھا تھا:

"ہزاران ہزار شکر...... باوجود توزّع خاطرِ نا تر و تفرقہ، سفر نمونۂ سقرایں ناظورۂ زیبا و مخدّرۂ رعنا درعرصۂ یک ہفتہ چون (ماہ) دو

ہفتہ حلیۂ جمال و پیرایۂ کمال پوشید..... من ابجد خوانِ لوحِ نادانی و تر انو نشینِ دبستانِ ہیچمدانی سُجان رائے پوری منشی جمال خانی آن قدر سرمایہ علم و ہنر و مایۂ نظم و نثر ندارم کہ گویم در تلاشِ مضمون و عبارت و ایجاد معانی و استعارت فکرِ دقیق بکار بُردم... اکثر اوقات ہنگامِ تحریر مکاتبات از زبانِ گہر افشان این ہیچمدان را مخاطب بمنشی می نمودند و نوشتہائے ناپسند موالید میفرمودند"...

ورق ۴۴ پر یہ ترقیمہ تھا:

"بتاریخ غرۂ شہر نومبر ۱۸۲۵ء مسیحی مطابق بستم شہر ربیع الاوّل ۱۲۴۱ ہجری روز سہ شنبہ بمقام گوڑگاواں در اسکول بوقت یک نیم پاس روز بر آمدہ بدستخط اضعف العباد فقیر حقیر محمد امیر اللہ اکبر آبادی صورتِ اتمام پذیرفت"۔

ورق ۴۵۔ب پر "مع الخیر بانجام رسید" خط نسخ میں لکھا تھا اور دو طغرے مستطیل شکل میں بنائے تھے جن سے "راقم ہذا محمد امیر اللہ" پڑھا جاتا ہے۔ ان طغروں کے نیچے لکھا تھا:

"ہر دو نام در مقام سعد آباد، در مکان جناب مرزا صاحب قبلہ مرزا محمد رحیم صاحب ناظر سررشتہ کلکٹری نوشتہ شد بتاریخ نوز دہم صفر المظفر ۱۲۴۷ ہجری نبوی مطابق بست و نہم ماہ جولائی ۱۸۳۱ء روز سہ شنبہ بوقت یک نیم پاس روز بر آمدہ....."

ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ قصّہ لیلیٰ مجنوں نثرِ فارسی جو دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ کے ساتھ مُجلّد تھا، جمال خاں کے ملازم منشی سُجان رائے پوری کی تصنیف ہے۔ اور اُس کی نقل محمد امیر اللہ اکبر آبادی نے ۱۸۲۵ء میں گوڑگاواں میں کی تھی۔ کارِ نقل ۲۵ اکتوبر کو شروع ہوا تھا۔ جیسا کہ پہلے ورق کے کونے میں تحریر ہے اور یکم نومبر کو تمام ہوا تھا۔

پھر یہ نسخہ جولائی ۱۸۳۱ء تک بہر حال محمد امیر اللہ اکبر آبادی کی ملکیت رہا ہے۔

اب یہ غور کرنا چاہیے کہ آیا دیوانِ غالب کا یہ مخطوطہ جو اس کتاب کے ساتھ مجلد

تھا، محمد امیر اللہ کے پاس رہا ہے یا یہ "قصہ لیلیٰ مجنوں" غالب کے ذخیرے میں رہ چکا ہے۔ اس کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ نہ دیوانِ غالب کے مخطوطے پر کوئی نشان یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے محمد امیر اللہ نے استعمال کیا ہے، نہ "قصۂ لیلیٰ مجنوں" پر غالب کے قلم سے کوئی حرف ملتا ہے۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ دونوں ہی مخطوطے امیر اللہ کے تھے تو ان کے پاس ۱۸۳۱ء/ ۱۲۴۷ھ تک ضرور رہے ہیں اور اگر غالب کے ذخیرے میں تھے تو قصہ لیلیٰ ۱۸۳۱ء کے بعد انھیں ملا ہوگا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ غالب نے اپنا یہ دیوان ۱۸۲۵ء سے پہلے اپنے پاس سے الگ کر دیا تھا۔ یہ پھر امیر اللہ کی ملکیت رہا ہے اور انھوں نے ۱۸۳۱ء کے بعد کسی وقت قصہ لیلیٰ مجنوں کے ساتھ اس کی جلد بندھوائی ہے...... شفیق الحسن بھوپالی نے اپنی ڈائری میں جو ۱۸۲۵ء لکھا ہے وہ اس مخطوطے کے آخری صفحے سے لکھ لیا ہے اور وہ اس نسخے کو غالب کا فارسی مخطوطہ سمجھ رہے تھے۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ امیر اللہ کون بزرگ تھے۔ مالک رام صاحب نے "تلامذۂ غالب" میں شیخ عبد اللہ کے بیٹے شیخ محمد امیر اللہ سرور اکبر آبادی کا نام لکھا ہے اور انھیں ۱۲۴۳ھ میں دلّی میں مقیم بتایا ہے۔ انھیں سرور کے حالات یا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ سخن شعرا سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے رحمت اللہ مجرم اکبر آبادی سے مشورۂ سخن کیا تھا۔ انھیں کے نام پنج آہنگ میں غالب کا ایک خط ملتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے مقدمۂ پنشن کے زمانے میں غالب سے اصلاحِ سخن کی درخواست کی تھی اور غالب نے اپنی ذہنی پریشانی کے سبب سے معذرت کر لی تھی۔ اس سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ غالب نے زمانۂ مابعد میں بھی اُن کے کلام پر اصلاح نہیں دی ہوگی۔ پنج آہنگ کے فارسی خط سے تو یہ ثابت ہے کہ ان سے غالب کی خط وکتابت رہی ہے اور چوں کہ یہ اکبر آباد کے رہنے والے تھے، اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ غالب سے اُن کی دیرینہ ملاقات ہوگی۔

پنج آہنگ میں اُن کا نام امیر اللہ ہی لکھا ہے اور انھیں اکبر آبادی بھی بتایا ہے اور یہ دونوں باتیں مخطوطۂ لیلیٰ مجنوں کے آخر میں بھی ملتی ہیں۔ مگر یہاں تخلص نہیں ہے،

تو یہ کس طرح مان لیا جائے کہ مخطوطے کی راقم وہی شخصیت امیر اللہ ہے جس کا تخلص سرور تھا۔ اس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ نسخۂ امروہہ کے آخری ورق یعنی (۶۳۔ب) پر لکھا ہوا مطلع ذیل انھیں سرور کا ہو سکتا ہے۔

وہ کون سی شے ہے جو یہاں ہے
دریا ہے کہ طبع سے رواں ہے

ممکن ہے کہ دوسرا شعر جس پر کوئی نام درج نہیں ہے، وہ بھی ان کا ہو۔

خوشی سے انجمن آراستہ گلوں نے کی
جو صحن (کذا) باغ پہ بدلی کا شامیانہ ہوا

مجھے بعض حضرات کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ آخری ورق پر الفاظ "گل ہمیشہ بہار است" وغیرہ غالب کے قلم سے نکلے ہیں جنھوں نے قصۂ لیلیٰ مجنوں کا مخطوطہ دیکھا ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ دیوانِ غالب کے حواشی پر جو اضافے بہ خطِ غیر ہوئے ہیں اور قصۂ لیلیٰ مجنوں کے ترقیمے نیز ورق (۶۳۔ب) پر لکھے ہوئے اشعار ایک ہی کاتب کے قلم سے لکھے گئے ہیں۔

اس نسخے کے زمانۂ کتابت کے بارے میں بھی اختلافات سامنے آئے ہیں۔ عام طور پر اسے ۱۲۳۱ھ یعنی ۱۸۱٦ء کا مکتوبہ تسلیم کیا گیا ہے اور راقم الحروف کا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن اس خیال کی بنیاد تقویم کے حساب کے علاوہ اس بات پر بھی ہے کہ غالب نے ۱۲۳۱ھ میں اپنی دو مہریں کندہ کرائی تھیں جن میں سے ایک پر ان کا تخلص "غالب" موجود ہے مگر مالک رام صاحب اس دلیل سے مطمئن نہیں ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ ۱۲۳۱ھ والی مُہر میں "اسد اللہ الغالب" بطورِ سجع آیا ہے، تخلص کے طور پر نہیں آیا۔ مولانا غلام رسول مہر کا کہنا ہے کہ نسخۂ امروہہ ۱۲۳٦ھ کا مکتوبہ ہے اور ان کا حساب بھی تقویم پر مبنی ہے۔ یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ غالب نے اپنا ایک دیوان کلکتہ کے دفتر میں پیش کیا تھا جس کے بارے میں اُن کا بیان ہے:

"نہفتہ نماناد کہ چوں کلکتہ مورد موکبۂ ادبارِ غالبِ خاکسار شد

نکوہیدہ سیرتے از ستمگرانِ وطن کہ پیش از من دران بقعہ (آمدہ بود) وبا رَبابِ دیوانِ دار آشنائی داشت آوازہ در افگند کہ این رنجور کہ تازہ از دہلی رسیدہ است ہم اسمِ خویش را تغیر دادہ وہم تخلّص را برگرداندہ است، اعیانِ بارگاہ را در اظہار اسم این ہیچ میرز بخداوندِ دفترکدہ تأمل رو داد۔ ناچار دیوانِ ریختہ کہ گرد آوردنِ آن را بیش از ہفت سال گذشتہ بود، معہٰذا مُہرے از مواہیرِ این روسیاہ کہ "اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ" نقشِ نگین وجلوۂ سالِ یک ہزار ودوصد وسی ودو ہجری طرازِ دامن و آستینش بود، بر خاتمۂ اوراق آن سفینہ رقم آخر زبان بندی اعداء داشت۔ بخدمتِ سرحلقۂ افرادِ دفترکدہ بشہادت فرستادم و سوزسینہ را بدستیاری نوکِ گیاہ بر صفحہ بدین رنگ جلوہ دادم..."

اس سے ظاہر ہے کہ جب ۱۸۲۸ء میں غالب اپنے مقدمہ پنشن کے سلسلے میں کلکتہ گئے ہیں تو وہاں اُن کے کسی مخالف نے حکام کو یہ چڑھا دیا کہ یہ شخص اپنا نام تبدیل کر چکا ہے۔ حکّام نے غالب سے مطالبہ کیا کہ وہ کوئی ایسی شہادت پیش کریں جس سے ثابت ہو کہ "اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ" اور اسد اللہ خاں غالب ایک ہی شخص ہے۔ کلکتہ نئی جگہ تھی۔ غالب گھبرائے کہ آخر کیا شہادت دے سکتے ہیں، مگر اس وقت اُن کے دیوان نے مشکل حل کر دی۔ ریختہ کا قلمی دیوان جو سات سال پہلے یعنی ۱۸۲۰ء میں لکھا گیا تھا، ان کے ساتھ تھا اور اس پر ایک مہر بھی ۱۲۳۱ھ کی ثبت تھی۔ جس پر "اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ" کُھدا ہوا تھا، اسے غالب نے بطورِ ثبوت پیش کر دیا۔ آخری جملہ سے یہ ظاہر ہے کہ اس کے ترقیمے کی عبارت میں غالب کے دونوں تخلص اور عرف بھی درج تھا، جس سے اعداء کی زبان بندی ہو گئی۔ گویا یہ نسخہ ۱۸۲۰ء میں کتابت ہوا تھا، جو مطابق ہے ۱۲۳۷ھ کے۔ نسخۂ امروہہ میں غالب تخلص ہر جگہ بعد میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ابتداءً تمام اشعار میں اسد تخلص ہی موزوں کیا گیا تھا۔ تبدیلِ تخلص کے بعد غالب جہاں موزوں ہو سکتا تھا وہاں مصرع

تبدیل کر دیا گیا۔ یہ عمل کب ہوا ہے، اس کا زمانہ کسی نے متعین کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ نسخۂ امروہہ ۱۲۳۱ھ میں لکھا گیا اور غالبؔ تخلص بھی اسی سال اختیار کیا گیا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مصرعوں میں تبدیلی ۱۲۳۱ھ میں ہوئی ہے۔ یہ بخوبی ممکن ہے کہ نسخۂ امروہہ کی تسوید کے بعد غالبؔ تخلص کے ساتھ جو غزلیں کہی گئیں، وہ اُنھوں نے علاحدہ کسی بیاض میں درج کی ہوں اور نسخۂ امروہہ میں تخلص کی تبدیلیاں ۱۸۲۰ء میں کی گئی ہوں۔ نسخۂ امروہہ میں کچھ مطلعوں میں تخلص بدل کر اور کچھ غزلوں کو حذف کر کے غالبؔ نے ایک اور نسخہ تیار کیا جس میں وہ غزلیں بھی موجود تھیں جو انھوں نے نسخۂ امروہہ کے بعد غالبؔ تخلص کے ساتھ کہی تھیں۔ اُنھیں نئے نسخے میں مناسب مقام پر درج کیا گیا اور اس کے ترقیمے میں یہ مذکور تھا کہ اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ المتخلص بغالب و اسد کا دیوان ہے۔ کلکتہ میں حکام کو یہی نسخہ پیش کیا گیا اور تاویل یہ کی گئی کہ غالبؔ چار حرفی ہے اور اسد سہ حرفی ہے، ہر بحر میں غالبؔ موزوں نہیں ہوتا اس لیے میں نام کے پہلے جُزو کو بھی بطورِ تخلص استعمال کر لیتا ہوں۔ دراں حالیکہ معاملہ برعکس تھا یعنی اُنھوں نے اسد تخلص چھوڑ کر غالبؔ اختیار کیا تھا اور یہ ہر بحر میں نہیں سماتا تھا۔ اِس لیے کبھی اسدؔ بھی موزوں کر دیتے تھے۔ کلکتہ میں پیش کیا جانے والا یہ نسخہ ۱۸۲۰ء میں تیار ہو گیا تو غالبؔ نے نسخۂ امروہہ محمد امیر اللہ اکبر آبادی کو دے دیا یا کسی طرح اُنھیں مل گیا۔ چوں کہ دیوانِ غالبؔ کے متعدد ترقی یافتہ قلمی اور مطبوعہ نسخے زمانۂ مابعد میں سامنے آتے رہے، اِس لیے یہ نسخہ کنجِ خمول میں پڑا رہا اور اُسے ظاہر یا شائع کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میرا اب یہ بھی خیال ہے کہ کلکتہ والا نسخہ غالبؔ نے ماہ رجب اور صفر ۱۲۳۵ھ کے آس پاس لکھا ہے اور نسخہ امروہہ کے ورق ۲۸۔ الف پر یادداشت "تا این جا نوشتہ ام و از این جا شروع" اُسی زمانے کی ہے اور نسخۂ کلکتہ کی تسوید سے متعلق ہے۔ اُس زمانہ میں اُنھوں نے لعل خاں نامی کسی شخص کو ملازم رکھا ہے اور اُس کی یادداشت دورانِ کتابت میں نسخۂ امروہہ کے ورق ۴۱۔ الف۔ پر

لکھ لی ہے۔

اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ غالبؔ نے نسخۂ کلکتہ کو دیوانِ دومی کہا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ نسخۂ امروہہ دیوانِ اوّل تھا، اندریں صورت یہ طے ہو جاتا ہے کہ نسخۂ امروہہ ۱۲۳۵ھ سے پہلے لکھا گیا اور جو حضرات اس کی کتابت ۱۲۳۶ھ میں ہونا بیان کرتے ہیں اُنھیں زیادہ قوی دلائل دینا ہوں گے۔

محمد امیر اللہ اکبر آبادی کے بارے میں تذکرہ نگار کہتے ہیں کہ اُنھوں نے ۱۲۴۳ھ یعنی ۱۸۲۷ء میں دلّی کو اپنا مسکن بنایا تھا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس سنہ سے پہلے دلّی آئے ہی نہ ہوں گے۔ قرینہ یہ ہے کہ غالبؔ سے اِن کی ملاقات آگرے کے زمانۂ قیام سے رہی ہوگی۔ پھر وہ دلّی میں بھی غالبؔ سے ملتے رہے ہوں گے۔ ہم اُنھیں ۱۸۲۵ء میں گوڑگانواں کے کسی اسکول میں پاتے ہیں اور ۳۱ء میں وہ سعد آباد میں مقیم ہیں۔ دیوانِ غالبؔ نسخۂ امروہہ کی اوریجنل جلد کو میں نے دیکھا تھا۔ اُس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ دیوان اور قصّہ لیلیٰ مجنوں ایک ساتھ ہی شیرازے میں مجلّد ہوا ہے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب جلد نومبر ۱۸۲۵ء کے بعد بندھوائی گئی ہو جو قصّہ لیلیٰ مجنوں کی تسوید کا سال ہے۔ اِس کا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ امیر اللہ کو یہ دیوان ۱۸۲۵ء سے پہلے ملا۔ مگر اُنھوں نے ایک عرصہ تک اُس کی جلد نہیں بندھوائی، اور جب اُنھوں نے قصّہ لیلیٰ مجنوں سے فراغت پائی تو ہر دو کتابوں کو یک جا کر لیا اور دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اُنھیں یہ نسخہ ۱۸۲۵ء کے بعد ہی ملا ہو۔

دوسرا ترقیمہ جو سعد آباد میں لکھا گیا ہے، وہ طغرے لکھنے کی یادداشت ہے اس سے ہمیں زمانے کے تعیّن میں کوئی خاص مدد نہیں مل سکے گی۔

نسخۂ امروہہ کے حواشی پر جو ۱۴ غزلیں کسی غیر کے خط میں لکھی گئی ہیں ان کے بارے میں بھی میرا خیال ہے کہ وہ اِنھیں محمد امیر اللہ اکبر آبادی کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ ان غزلوں کی طرزِ تحریر اور ورق ۶۳-ب کی عبارتیں نیز قصّہ لیلیٰ مجنوں

کے دونوں ترقیمے ایک ہی خط میں ہیں۔ یہ غزلیں انھوں نے غالب کی اس بیاض سے نقل کی ہوں گی جس میں نسخۂ امروہہ کی تکمیل کے بعد کہا جانے والا کلام جمع ہوا تھا۔

(مارچ ۱۹۷۲ء)

دیوانِ غالب بخطِ غالب

(رودادِ اشاعت)

اُلجھا ہے پانو یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

مارچ۔ اپریل ۱۹۸۹ء کے رسالہ "طلوعِ افکار" (کراچی) میں لطیف الزماں خاں صاحب کا مضمون "دیوانِ غالب بخطِ غالب: رودادِ اشاعت" شائع ہوا۔ اُسے دہلی کے ایک رسالے کے علاوہ "کوہسار" (بھاگلپور) نے بھی وہاں سے نقل کیا۔ اُسے پڑھ کر کچھ حاسدوں کے من میں تو لڈّو پھوٹے، اور دوستوں نے شرما حضوری میں مجھ سے تذکرہ نہیں کیا۔ بعض احباب نے کہا بھی تو میں نے اُسے نہ پڑھنا ہی مناسب سمجھا۔ دراصل میرے دوستوں کو جو مجھے جانتے ہیں میرے بیانِ صفائی کی ضرورت ہی نہیں، اور دشمنوں کو میری بات پر یقین کیوں آنے لگا! اِس لیے میں نے "گشندہ گُشندہ بود" پر عمل کرنا چاہا، اور یہ نیت کر لی کہ نہ اُس مضمون کو کھوج کر پڑھوں گا، نہ اُس پر کچھ لکھوں گا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ لطیف صاحب سے کئی برس تک دوستانہ مراسلت رہی ہے، اور جس زمانے میں دیوانِ غالب بخطِ غالب دریافت ہوا ہے، اُس وقت تو شاید ہر ماہ ۸۔۱۰ خطوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ جس شخص کو دس بارہ برس تک دوست سمجھا ہو، اُس کے خلاف دشمنی یا توہین و تحقیر کے الفاظ اب میرے قلم سے نہیں نکل سکتے۔ اِسی دیوانِ غالب کے سلسلے میں جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ نے میرے خلاف یہاں زبردست محاذ بنایا تھا، چھ ماہ

تک اردو اور انگریزی اخباروں میں فرضی ناموں سے مضامین، مراسلات اور خبریں شائع کراتے رہے اور حکومتِ ہند کے مختلف محکموں کو (جو جرائم کی تفتیش کرتے ہیں) میرے خلاف متعدد درخواستیں بھجوائیں۔ تین بار پارلیمنٹ میں سوال کرائے۔ رامپور کے اخبار "قومی جنگ" کا تین چار صفحات کا ضمیمہ میرے خلاف لکھوا دیا جس میں یہ تھا کہ میں اسمگلر ہوں، پاکستان کا جاسوس ہوں، وہاں میری لاکھوں کی جایداد بن گئی ہے وغیرہ۔ وہ زمانہ بنگلہ دیش کی تحریک کے شباب کا تھا، دونوں ملکوں کے تعلقات سخت کشیدہ تھے، اِس لیے مجھے مجبور ہو کر "قومی جنگ" پر مقدمہ دائر کرنا پڑا، جو ڈھائی سال تک چلتا رہا۔ اُس دور (۱۹۷۰-۱۹۷۱ء) میں ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مجھے جس ذہنی کرب اور اذیت سے گزرنا پڑا اُس کیفیت کو اب میں زندہ کرکے نہیں دکھا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے سوا کوئی اور ہوتا تو وہ ان تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ مگر میں نے کبھی اکبر علی خاں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں چھپوایا نہ کہیں اُن کی شکایت لکھ کر بھیجی (نجی خطوں میں کسی کو کچھ لکھا ہو تو اور بات ہے) میں آج بھی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے طرزِ عمل کا مجھے افسوس ضرور ہے مگر اُن سے نفرت یا کینہ میرے دل میں نہیں ہے (اِس پر میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں)۔

اِسی طرح اب میرے کرم فرما لطیف الزماں خاں صاحب نے محاذ بنایا تو مجھے بہت رنج ہوا مگر الحمد للہ نفرت یا کینہ اُن سے بھی نہیں ہے:

شد است سینہ ظہوری پُر از محبتِ یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

دو ماہ قبل محترم سید انیس شاہ جیلانی (محمد آباد پاکستان) نے اپنے خط میں اُس مضمون کا ذکر کیا تو میں نے اُنھیں لکھا کہ میں نے وہ مضمون نہیں پڑھا اور پڑھنا بھی نہیں چاہتا۔ میں نے لطیف صاحب کو معاف کیا اور میری دعا ہے کہ اللہ بھی اُن سے مواخذہ نہ کرے:

ہر کہ مارا یار نبود ایزد اورا یار باد   وانکہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد
ہر کہ او خارے نہد در راہِ ما از دشمنی   ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

(ترجمہ: جو ہمارا دوست نہیں اللہ اُس کا والی ہو، جو ہمیں رنج دے اُسے بہت سی راحتیں نصیب

ہوں۔ جو دشمنی سے ہمارے راستے میں کانٹے بچھائے اُس کے باغِ زندگی میں ایسے پھول کھلیں جن میں کانٹا نہ ہو)۔

انیس صاحب نے لکھا کہ مجھے یہ سادھو سنتوں کی سی باتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں اور حقائق کے اظہار میں کوئی دشواری بھی نہیں ہونی چاہیے۔ میں آپ کو اُس مضمون کا عکس بھیجوں گا۔" پھر اُنھوں نے اپنے ۳۰ ر اپریل ۱۹۹۰ء کے خط کے ساتھ "طلوعِ افکار" میں چھپے مضمون کی زیروکس کاپی ڈاک سے بھیج دی۔ میں نے وہ لفافہ کھولے بغیر میز کی دراز میں رکھ دیا اور اپنے دوسرے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ ۸ ر جون ۱۹۹۰ء کو یہ خیال آیا کہ ممکن ہے اُس لفافے میں انیس صاحب کا خط بھی ہو اور اُنھوں نے کوئی جواب طلب بات لکھی ہو۔ چنانچہ اُسے کھولا تو لامحالہ وہ مضمون بھی پڑھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جن لطیف الزماں خاں صاحب سے میں واقف تھا وہ کوئی اور صاحب تھے یہ کسی دوسری ہی شخصیت کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں اتنی اور ایسی غلط بیانیاں کی گئی ہیں کہ میں ششدر رہ گیا آخر کس کس بات کی تردید کروں؟ دیوانِ غالب بخطِ غالب کے بارے میں سب سے زیادہ مفصّل اور مستند معلومات خود لطیف صاحب ہی کو ہونی چاہیے تھیں مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُنھوں نے تعصّب، نفرت اور جذبۂ کردار کشی سے مجبور ہو کر اُن حقائق کا چہرہ بھی مسخ کر دیا ہے جن میں وہ خود ایک اہم کردار رہے ہیں۔

دیوانِ غالب بخطِ غالب میری کلاہِ افتخار کا طُرّہ نہیں ہے میرے پاس کام کرنے کے لیے دنیا کے بہت سے اہم موضوعات ہیں، جن پر ایک طائرانہ نگاہ بھی ڈالتا ہوں تو عمرِ گریزاں کی فرصت چشمکِ برق سے زیادہ نظر نہیں آتی۔ میں نے لطیف صاحب کو لکھا تھا کہ یہ دیوان آپ اپنے نام سے شائع کر لیں مجھے خوشی ہوگی' (اس کا حوالہ اُنھوں نے اپنے مضمون میں بھی دیا ہے) مگر اُس وقت اُنھوں نے کسرِ نفسی کا مظاہرہ کیا، اگر وہ ازراہِ دوستی مجھے یہ لکھتے کہ اسے طفیل صاحب کو دینے کا کریڈٹ وہ اپنے لیے رکھنا چاہتے ہیں تو دلوں کے بھید جاننے والا گواہ ہے کہ میں اُس کا کریڈٹ اُن کے لیے چھوڑ دیتا' انھیں حقائق کو توڑ مروڑ کر اتنے مضامین لکھنے اور اپنے دل کو نفرت و کدورت کا مزبلہ بنانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ کراچی میں بعض احباب نے مجھ سے ملنے کے لیے جلسہ کیا تو وہاں یہ خواہش بھی کی کہ میں دیوانِ غالب بخطِ غالب

کی کہانی بیان کروں۔ اس سارے قضیے میں میری کامیابی کے دو اہم نکتے ہیں ایک تو یہ کہ میں نے اِس سے مالی منفعت حاصل کرنے کا لالچ نہیں کیا۔ میں نے اس "دیوان" کے معاوضے یا رائلٹی کے نام پر محمد طفیل مرحوم سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا اور اُن سے یہ کہا تھا کہ جب کبھی توفیق احمد راہِ راست پر آجائیں اور اُن کا لاہور آنا ہو تو آپ جو مناسب سمجھیں اُنھیں دے دیجیے گا۔ اب ۳۱ مارچ ۱۹۹۰ء کو توفیق احمد پہلی بار لاہور گئے، میں نے عزیزم جاوید طفیل کو لکھا کہ میری طفیل صاحب سے یہ گفتگو ہوئی تھی اب آپ جس طرح سوچیں وہ کریں۔ جاوید میں خدا کے فضل سے محمد طفیل مرحوم کی ساری خوبیاں موجود ہیں، بلکہ ایک دو صفات زائد بھی ہیں، اُنھوں نے توفیق احمد سے ایسا سلوک کیا کہ وہ خوش ہو کر واپس آئے اور جاوید کی تعریف کرتے ہیں مگر لطیف صاحب اُنھیں اب تک یہی لکھ رہے ہیں کہ تمھیں سب سے پہلے نثار احمد فاروقی نے دھوکا دیا اور لوٹ لیا۔ توفیق احمد مجھ سے ہی نہیں میرے خاندان سے بھی واقف ہے، وہ اُن کی باتوں کا کیسے یقین کرلے؟

دوسرا نکتہ یہ کہ میں نے اس قضیے میں نہ کبھی جھوٹ بولا نہ بناوٹ سے کام لیا اور تفتیش کرنے والے سرکاری اداروں سے بھی وہی بات بیان کی جو سچی تھی۔ محکمۂ تفتیش کا ایک افسر تو مجھ سے یہ کہہ کر گیا کہ "فلاں شخص کتنا جھوٹا آدمی ہے میں اب ایسی رپورٹ لکھوں گا کہ یہ فائل ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے"۔ مجھے کبھی یہ وہم بھی نہ ہوا کہ ان سیدھی سچی باتوں کا کسی شخص پر کوئی منفی اثر ہو رہا ہے کراچی کے جلسوں میں بھی حسبِ عادت میں نے سیدھی سادی کہانی بغیر نمک مرچ لگائے بیان کردی۔ لطیف صاحب کو اس کی اطلاع اخباروں سے یا کسی اور ذریعے سے ملی تو اُنھوں نے کسی سے اپنے غم و غصّے کا اظہار کیا مگر مجھے کچھ نہیں لکھا جو میں آیندہ احتیاط کرتا۔ صرف ایک بار اتنا لکھا تھا کہ "مجھے کوئی جھوٹا ثابت نہیں کرسکتا"۔ اب جب کہ اس کہانی کے بعض اہم حصّے طاقِ نسیاں کا گلدستہ بن چکے اور کئی اہم کردار خصوصاً میرے دوست محمد طفیل ایڈیٹر "نقوش" اس دنیا میں نہیں رہے، تو لطیف صاحب نے ایک نئی داستان گھڑ کر اتنے وثوق اور اعتماد کے ساتھ سنائی ہے کہ غلط بیانی کے لیے اس سے زیادہ پُراعتماد اور مضبوط موقف اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ یہ سمجھ رہے ہیں:

دہرائی جا سکے گی نہ اب داستانِ عشق
کچھ وہ کہیں سے بھول چکے ہیں کہیں سے ہم

میں نے ابھی عرض کیا کہ دیوانِ غالب میرے لیے کوئی طرۂ افتخار نہیں ہے (ورنہ میں لطیف صاحب کو اُن کے نام سے چھاپ لینے کی پیش کش کیوں کرتا؟) وہ تو اُس وقت مقطع میں سخن گسترانہ بات آپڑی تھی اور وقار کا مسئلہ بن گیا تھا اس لیے میں نے اتنی دل چسپی لی تھی۔ اگر اکبر علی خاں صاحب کا رویہ دوستانہ رہتا تو شاید یہ دیوان وہی شائع کرتے مگر اُنھوں نے بھی مجھ پر اعتماد نہ کیا اور اپنی روشنیِ طبع پر ضرورت سے زیادہ بھروسا کر کے اپنا کام بگاڑ لیا۔ اس ساری روداد کا میں نے کوئی رکارڈ بھی محفوظ نہیں رکھا، کچھ تھا بھی تو وہ بعض ایسے دوستوں کو دے دیا جنھوں نے اس دیوان کی کہانی لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مجھ سے ایک آدھ بار لوگوں نے کچھ تفصیل معلوم کی تو میں اب بہت سی باتیں فراموش کر چکا تھا اور یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ وہ دیوان کیسے بھیجا گیا تھا۔ لطیف صاحب کا بہت ممنون ہوں کہ اُنھوں نے مجھے پھر کھوجنے پر لگا دیا اور میرا حافظہ تازہ کر دیا۔

لطیف صاحب کے مضمون میں اگر صرف اتنا ہی دعویٰ ہوتا کہ محمد طفیل مرحوم کو دیوانِ غالب بخطِ غالب کا عکس اُنھوں نے فراہم کر کے دیا تھا تو میں اب بھی اُن کی تردید میں قلم نہ اٹھاتا۔ میں اُن کی اُفتادِ طبع سے کسی حد تک واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ میں اگر غلافِ کعبہ اوڑھ کر اور عرش و کرسی کے سامنے کھڑے ہو کر قسم کھاؤں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ صحیح ہے تو وہ ہرگز تسلیم نہ کریں گے اور مزید تیکھے وار شروع کر دیں گے۔ اُنھوں نے میری کردار کُشی کے لیے اتنا صریح اور سفید جھوٹ بولا کہ میں ماضی کے کباڑ خانے کو کھنگالنے پر مجبور ہو گیا۔ اس میں ابھی بہت کچھ دفن پڑا ہے مگر جتنا مواد ہاتھ آیا وہ ایسا تھا کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے میں اپنے قلم سے اُن کے خلاف کچھ لکھنے کے تکلیف دہ اور مکروہ کام سے بچ گیا۔ اُنھوں نے خود ہی اپنی تردید ایسی کر دی کہ میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی نہ کر پاتا اور اُن کے طفیل میں دیوانِ غالب بخطِ غالب کی صحیح رودادِ اشاعت بھی سامنے آگئی جس کے لیے وہ ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں۔ اب یہاں جو کچھ لکھا جائے گا وہ سب لطیف الزماں

خاں صاحب ہی کے الفاظ ہیں مجھے کچھ عرض کرنا ہوگا تو حاشیے میں لکھوں گا۔

مناسب ہوگا کہ میری (بلکہ خود لطیف صاحب کی) یہ تحریریں پڑھنے سے پہلے اُن کا وہ طویل مضمون ایک بار پھر پڑھ لیا جائے جو پہلے "طلوعِ افکار" (کراچی) میں پھر "شانِ ہند" (دہلی) اور "کوہسار" (بھاگلپور) میں چھپا تھا۔ میں سارا مضمون یہاں نہیں دہرا سکتا۔ چند اہم نکتے انتخاب کر کے ابتدا میں درج کرتا ہوں، جس سے ظاہر ہو جائے کہ انھوں نے مجھ پر کیسے الزام تراشے ہیں جو کسی ایسے شخص کو زیب نہیں دیتے جس کا تعلق ایک تعلیم و تربیت کے ادارے سے رہا ہو۔ اگر یہ الزامات خود اُن کی تحریروں سے ہی غلط ثابت ہو جائیں تو جو باتیں رہ جائیں گی اُن کی صحت بھی خود بخود مشکوک ہو جاتی ہے۔ اگر لطیف صاحب نے کوئی نیا لطیفہ چھوڑا تو ابھی فقیر کی زنبیل خالی نہیں ہوئی ہے۔

(۲)

لطیف الزماں صاحب کے مضمون سے چند اہم تنقیحات:

(۱) میں نے خط پڑھ کر کہا: "یار طفیل صاحب..... ہٹائیے اِس خط کو میں آپ کو یہ دیوان فراہم کر دوں گا....."

میں نے طفیل صاحب سے پوچھا: "آپ نے نثار احمد فاروقی کو کیوں نہیں لکھا؟ وہ تو آپ کے زیادہ قریب ہیں۔" کہنے لگے: "وہ صرف روپے کے قریب ہے۔ اُسے صرف روپے سے پیار ہے نہ کسی انسان سے نہ کسی اور چیز سے۔ یہ طالب علم تھا کسی لائبریری میں کلرک تھا میں نے غریب جان کر اُس کی مالی مدد کی لیکن مجھے بہت بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ انتہائی حریص انسان ہے۔" [۱]

---

[۱] محمد طفیل مرحوم سے لطیف صاحب کا تعارف میں نے کرایا تھا اور یہ پہلی بار ۲۶ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کو اُن سے ملے تھے۔ لطیف صاحب نے "کلرک" تحقیر کے لیے کہا ہے میرے نزدیک یہ کوئی ننگ و عار والی بات نہیں۔ میں نے ۱۹۶۲ء میں اپنی ملازمت سے استعفا دے کر ایم۔ اے (عربی) میں داخلہ لیا تو محمد طفیل مرحوم نے میری طلب کے بغیر دو سال تک مجھے سو روپے ماہانہ بھجوائے میں اُن کا ممنون

(۲) میں نے اپنے ایک عزیز کو جو علی گڑھ میں مقیم تھے، لکھا کہ وہ میرے لیے دیوانِ غالب بخطِ غالب خرید لیں۔ میرے تاجر پیشہ عزیز نے سوچا کہ غالب کا دیوان تو چھ آنے میں ملتا ہے چھ ہزار میں کیوں خریدا جائے؟ انھوں نے نہیں خریدا اور وقت گزرتا رہا.... مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ میرے عزیز نے دیوانِ غالب بخطِ غالب نہیں خریدا تو میں نے انھیں نہایت سخت اور درشت لہجے میں خط لکھا۔ وہ دلّی گئے، تین دن کی تلاش و جستجو کے بعد وہ اُس شخص کے پاس پہنچ گئے جس سے اکبر علی خاں نے دیوانِ غالب کے فوٹو اسٹیٹ بنوائے تھے اور اُسے ایک پیسہ نہیں دیا تھا۔ فوٹو گرافر کو اخبارات سے یہ علم ہو گیا تھا کہ یہ قیمتی چیز ہے اُس نے تریسٹھ صفحات کے فوٹو اسٹیٹ رکھ لیے، اُن صفحات کو میرے عزیز نے مُنھ مانگے داموں خریدا اور ایک بڑی بی کے ہمراہ مجھے بھیج دیا۔

(۳) جب فوٹو اسٹیٹ ملے تو میں اُنھیں لے کر لاہور پہنچا لیکن طفیل صاحب کسی کام سے اسلام آباد گئے ہوئے تھے...... میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سیّد سجّاد باقر رضوی صاحب سے ملنے چلا گیا وہاں ڈاکٹر فرمان فتح پوری بھی تشریف فرما تھے...... میں نے دیوانِ غالب بخطِ غالب کی فوٹو اسٹیٹ کا پیہاں دکھلائیں..... اُن سے کہا کہ میں نے طفیل صاحب سے وعدہ کیا ہے کہ میں یہ دیوان فراہم کر دوں گا وہی اُسے شائع کریں گے۔

(۴) میں نے دوسرے دن طفیل صاحب کو ٹیلی فون کیا اور اطلاع دی کہ جس چیز کی آپ کو تلاش تھی وہ آ گئی..... طفیل صاحب تشریف لے آئے۔ میں نے بعض احباب کو

کرم تھا اسی لیے کبھی کسی مضمون یا کسی خدمت کے لیے اُن سے معاوضہ طلب کرنے کا مجھے خیال بھی نہیں آیا۔ بس اتنا ہوا کہ (دو بار کے سوا) میں پاکستان میں اُن کا مہمان ہوتا تھا اور وہ مرحوم میزبانی کا حق ادا کر دیتے تھے۔ طفیل صاحب نے لطیف صاحب کے سوا اور کسی سے ایسی رائے کبھی ظاہر نہیں کی کہ وہ مجھے انتہائی حریص انسان سمجھتے ہیں۔ اور میں یہ بھی کہوں گا کہ اُس مرحوم نے میری کسی فرمایش کو ردّ بھی نہیں کیا خواہ کسی دوسرے کے لیے ہو۔ اس کی متعدد مثالیں دے سکتا ہوں اُن کی اس محبت کا یہ اثر تھا کہ لوگ سمجھتے تھے "نقوش" میرا ہی رسالہ ہے۔ اور اس میں تو شک نہیں کہ ادبی دنیا میں سب سے پہلے مجھے "نقوش" نے روشناس کرایا۔

مدعو کیا..... چاروں حضرات کی موجودگی میں وہ لفافہ اُن کے سامنے رکھ دیا جس میں فوٹو اسٹیٹ تھے۔ تھوڑی دیر جب بغور دیکھ چکے تو بولے: "آپ دس ہزار روپے لے لیجیے"۔ میں نے کہا: "طفیل صاحب آپ نے میرا دل دکھایا ہے اگر دس ہزار روپے خرچ کرنا چاہتے ہیں تو پھر دلّی سے منگائیے اور اگر یاری ہے تو لے جائیے"۔

(۵) خط شکست پڑھے گا کون؟ طفیل صاحب نے پوچھا۔ میں نے کہا: اس کو میں خوشخط لکھ دوں گا آپ لاہور پہنچ کر اس کی اشاعت کا انتظام کیجیے۔

(۶) ایک دن طفیل صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ وہ "تلاشِ غالب" میں شامل دیوان غالب بخطِ غالب کی دریافت کی کہانی نقوش کے اِس شمارے میں چھاپنا چاہتے ہیں..... ظاہر ہے نثار احمد فاروقی نے یہ مشورہ اُنھیں دیا ہوگا ورنہ طفیل صاحب کے علم میں یہ بات نہ تھی کہ "تلاشِ غالب" میں چھپوا رہا تھا اور یہ کہ دریافت کی کہانی فاروقی بھیج چکے ہیں معلوم ہوا کہ فاروقی نے یہ درخواست کی ہے کہ اُن کا مضمون "نقوش" میں ضرور شامل کیا جائے نیز یہ کہ وہ پورے دیوان کے حواشی لکھ چکے ہیں وہ بھی شاملِ اشاعت ہوں.....

(۷) نثار احمد فاروقی صاحب بڑے باکمال انسان ہیں..... جب اُنھیں معلوم ہو گیا کہ دیوان..... کے فوٹو اسٹیٹ طفیل صاحب کو مل گئے ہیں تو ایک جانب سے اُنھوں نے اپنا مضمون "دیوانِ غالب بخطِ غالب نسخۂ امروہہ" اور حوالے و حواشی کی "نقوش" میں اشاعت کے لیے طفیل صاحب کو آمادہ کر لیا دوسری جانب مجھ پر بھی کرم فرمایا.....

(۸) میرا خیال ہے کہ جو سرمایہ کسی بھی شکل میں طفیل صاحب کے پاس اُس زمانے میں موجود تھا اگر وہ سب کا سب اکبر علی خاں کو دیتے تب بھی شرائط پوری نہیں کر سکتے تھے..... میں نے کہا آپ دیوانِ غالب بخطِ غالب شائع کیجیے تمام تر ذمّہ داری میری ہے۔

(۹) طفیل صاحب نقوش غالب نمبر حصہ دوم مع نو دریافت بیاضِ غالب بخطِ غالب شمارہ نمبر ۱۱۲ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں شائع کر چکے تھے۔ ایک روز نثار احمد فاروقی کے چچا ابرار احمد فاروقی صاحب کا خط پہنچا کہ لاہور آؤ۔ یہ اکتوبر ۱۹۶۹ء کا آخری ہفتہ تھا..... ابرار احمد فاروقی صاحب نے دیوانِ غالب بخطِ غالب کے فوٹو اسٹیٹ اور ایک فلاسک.....

میرے سپرد کیں۔ نثار احمد فاروقی نے لکھا تھا: "اسے آپ اپنے نام سے شائع کیجیے مجھے خوشی ہوگی"۔ جو جال وہ بچھا رہے تھے میں اُس سے بے خبر تھا۔

(۱۰) ۵ر جون ۱۹۷۰ء کو زندگی میں پہلی بار نثار احمد فاروقی سے طفیل صاحب کے گھر پر ملا..... حضرت فاروقی ثابت کر رہے تھے کہ اکبر علی خاں ایک سازشی انسان ہے اور یہ کہ اُنھوں نے توفیق احمد کو دھوکا دیا۔ اُنھوں نے یہ نہیں بتایا کہ خود اُنھوں نے جو فوٹو اسٹیٹ حاصل کیے کیا توفیق احمد کی اجازت تھی؟ یقیناً نثار احمد فاروقی نے توفیق احمد کو پہلے دھوکا دیا پھر اکبر علی خاں نے۔

(۱۱) ۲۲ر جولائی ۱۹۷۰ء کو طفیل صاحب نے تین سو شعرا، اُدبا اور اداروں کی ایک فہرست بنائی تب مجھے معلوم ہوا کہ "نقوش" کا شمارہ نمبر ۱۱۲ جس میں بیاضِ غالبؔ بخطِ غالبؔ شائع ہوئی، ہندوستان بھیج رہے ہیں..... طفیل صاحب نے فہرست حوالے کرتے ہوئے کہا: پچاس نسخے تمھارے ہیں اس فہرست میں جن دوستوں اور اداروں کے نام ہیں ایک ایک نسخہ اُنھیں پہنچا دینا.....

(۱۲) طفیل صاحب نے کہا: تم نے حواشی لکھے یہ پانچ ہزار تمھاری محنت اور مضمون کا معاوضہ ہے۔ توفیق احمد ایک غریب آدمی ہے اُس نے ابتدا میں دیوانِ غالبؔ کی قیمت چھ ہزار طلب کی تھی یہ چھ ہزار اُسے دے دینا۔ مجھے ایک قرض بھی ادا کرنا ہے جب میں خطوط نمبر شائع کر رہا تھا تو مالک رام صاحب نے مجھے خطوط بھیجے تھے مجھے اُنھیں کچھ رقم دینی ہے، گو اُنھوں نے طلب نہیں کی پھر بھی یہ آٹھ ہزار روپے مالک رام صاحب کو دے دینا۔ اُنیس ہزار روپے طفیل مرحوم نے میری اور بھابی جان کی موجودگی میں دیے۔ [۱]

---

[۱] لطیف صاحب نے جو بزم اپنے تخیل میں سجائی ہے اُس میں بلا وجہ بھابی جان کو شریک کر لیا اُن کے سامنے کبھی اُنیس پیسے کا بھی لین دین نہیں ہوا۔ اور طفیل صاحب بھی کیسی ادائیگی کر رہے تھے کہ نہ کسی دوسرے ذریعے سے توفیق احمد کو لکھا نہ مالک رام صاحب کو اطلاع دی۔ اب بیس برس کے بعد لطیف صاحب اُس کے عینی شاہد بن رہے ہیں۔ اس کے باوجود کہ لطیف صاحب نے دہلی میں اُنھیں یہ غلط اطلاع دی۔ مالک رام صاحب نے تقاضا کرنا تو کجا کبھی نہ مجھ سے پوچھا نہ کسی سے اس بے ایمانی

(۱۳) جمعہ ۲۴ جولائی ۱۹۷۵ء (کذا) کو میں طفیل صاحب اور نثار احمد فاروقی گنڈا سنگھ والا پہنچے..... بڑے بڑے کریٹس جن میں نقوش غالب نمبر ۲، کتابیں اور "تلاشِ غالب"

کی شکایت کی اِسی سے ظاہر ہے کہ اُنھوں نے لطیف صاحب کی باتوں کو لطیفے سے زیادہ نہیں سمجھا ورنہ آٹھ ہزار ایسی معمولی رقم نہ تھی کہ اُس پر خاموشی پر صبر کر لیا جاتا۔ ۱۹۷۰ء کے آٹھ ہزار تو آج کے اَسّی ہزار سے زیادہ تھے۔ "تلاشِ غالب" میں نے اشاعت کے لیے لطیف صاحب کو دی تھی مگر یہ اتنی پُر اغلاط چھپی کہ میرا اُسے دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا نہ کسی کو دکھائی۔ اس کے تین سو کیا تین نسخے بھی مجھے نہیں ملے، کتاب کو پریس کے چنگل سے محمد طفیل مرحوم نے نقد ادائیگی کر کے چھڑایا تھا۔ لطیف صاحب نے پوری کتاب بیچ لی اور ایک پیسہ مجھے رائلٹی کا نہیں دیا نہ میں نے طلب کیا۔ اب میری اطلاع کے مطابق اسی سال رمضان میں اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں کچھ کتابیں لاہور کے اداروں سے تحفۃً ملی تھیں کچھ میں نے دفتر "نقوش" کے انبار میں سے نکالی تھیں اور بہت ہی تھوڑی خریدی تھیں اُن کے چار کریٹ بنے تھے اور میں ڈر کے مارے صرف ایک کریٹ ساتھ لایا تقریباً تین سو کتابوں پر مشتمل تین کریٹ اردو بازار انارکلی لاہور کے ایک پُرانے سے مکان کی بالائی منزل پر لطیف صاحب کی تحویل میں چھوڑ آیا تھا پھر اُن میں سے ایک کتاب بھی مجھ تک نہ پہنچ سکی۔ رہا یہ کہ میں نے تین سو "نقوش" تین سو روپے فی جلد کے حساب سے بیچ کھائے تو لطیف صاحب "نقوش" کے دفتر سے وہ تین سو پتے فراہم کر دیں جنھیں "نقوش" بھیجا گیا تھا اور میں نے نہیں پہنچایا۔ اُن کے ہندوستانی عزیز اتنے مستعد ہیں کہ صرف تین دن کی تگ و دو سے ۸۵ لاکھ کی آبادی والی دلّی میں اُس فوٹو گرافر کا پتا نکال سکتے ہیں جس نے اکبر علی خاں کے لیے فوٹو اسٹیٹ تیار کیے تھے۔ میری گزارش ہے کہ انھیں کے ذریعے تین سو افراد اور اداروں میں سے تین کا سراغ لگوالیں جن کے ہاتھ میں نے "نقوش" غالب نمبر تین سو روپے میں بیچا ہو۔ یہ اطلاع بھی غلط ہے کہ میں نے رسول نمبر کے لیے دس ہزار طلب کیے تھے۔ کتابیں میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ ڈیڑھ دو ہزار سے زیادہ کی نہ تھیں۔ رسول نمبر میں میری تین کتابیں اور دو مضامین شامل ہیں۔ ایک بار حکومت پاکستان کا مہمان تھا اور لاہور ہلٹن میں ٹھہرایا گیا تھا مگر یہ قیام چند گھنٹے سے زیادہ نہ رہا۔ طفیل صاحب وہیں ملنے کے لیے آئے ڈیڑھ دو گھنٹے تک لاؤنج میں بیٹھے چائے پیتے رہے گپ کرتے رہے۔ چلتے وقت اُنھوں نے بڑے معصوم لہجے میں کہا: "بس اب گھر چلیے" میں نے اُسی وقت ہوٹل کی چابیاں کاونٹر کے حوالے کر دیں اور اُن کے ساتھ آگیا تھا۔

کے تین سو نسخے تھے نثار احمد فاروقی نے اتنی آسانی سے سرحد کے اُس پار بھجوا دیے کہ میں اور طفیل صاحب دیکھتے رہ گئے۔..... طفیل صاحب نے بڑی معنی خیز ہنسی کے ساتھ کہا: اگر دس گنا کتابیں ہوتیں اور انیس کروڑ روپے ہوں تب بھی نثار احمد فاروقی بلا کھٹکے لے جائے گا۔ تم اُسے نہیں جانتے۔

(۱۴) نثار احمد فاروقی نے ہندوستان پہنچ کر ایک نسخہ بھی کسی شخص یا ادارے کو نہیں دیا۔ تمام نسخے تین سو روپے فی نسخہ کے حساب سے فروخت کر دیے، مجھے نہیں معلوم توفیق احمد کو چھ ہزار روپے دیے یا نہیں البتہ مالک رام صاحب کو ایک پیسہ نہیں دیا۔ ۲۶ اگست ۱۹۸۲ء کو..... میں نے مالک رام صاحب سے پوچھا: "کیا آٹھ ہزار روپے نثار احمد فاروقی نے آپ کو ادا کر دیے؟ مالک رام صاحب نے کہا نہیں مجھے تو اُنھوں نے ایک پیسہ نہیں دیا۔"

(۱۵) میں نے ایک دن طفیل صاحب سے پوچھا: آپ نے بیاضِ غالب کے فوٹو اسٹیٹ نثار احمد فاروقی سے کیوں طلب نہیں کیے؟ کہنے لگے: "اکبر علی خاں کا شرائط نامہ تو تم حکیم صاحب کے گھر پڑھ چکے ہو اگر میں فاروقی کو لکھتا تو وہ اس سے سو گنا زیادہ قیمت طلب کرتا۔ میں تو اکبر علی خاں کی ہی شرائط پوری نہیں کر سکتا تھا، نثار احمد فاروقی کی شرائط کہاں سے پوری کرتا؟ تمھارے سامنے پچاس نسخے "نقوش" کے اور پانچ ہزار نقد دیے مگر وہ اس سے خوش نہ ہوا ہوگا یہ کسی اور وقت کام دکھائے گا۔"

(۱۶) جب طفیل صاحب رسول نمبر شائع کر رہے تھے تو اُنھوں نے ساڑھے چھ ہزار روپے کی کتابیں خرید کر ہوائی جہاز کے ذریعے سے دلّی بھجوائیں کرایہ بھی خود ادا کیا، جب کتابیں دلّی پہنچ گئیں تو نثار احمد فاروقی نے اُنھیں لکھا: "دس ہزار روپے اور بھیجو تو مضمون بھیجوں گا اور لکھواؤں گا۔" طفیل صاحب نے اس مطالبے کے بعد کبھی فاروقی صاحب سے بات کرنا بھی پسند نہ کیا۔ مرحوم کو آخری لمحے تک یہ افسوس رہا کہ نقوش..... اشخاص اور اداروں کو نہیں پہنچا۔ نثار احمد فاروقی لاہور آئے ضرور مگر قیام ہوٹل میں کیا۔"

(۱۷) گیلانی صاحب اگلے وقتوں کے محقّق ہیں اُنھوں نے سُنی سُنائی باتوں پر اعتبار کر لیا۔ تحقیق کرنا مناسب نہ سمجھا..... (ایک طویل فہرست دی ہے کہ نثار احمد فاروقی نے

وقارعظیم، حمید احمد خاں، شیخ محمد اکرام، سلیم اختر وغیرہ سے ملاقاتوں میں اس کا ذکر نہیں کیا کہ محمد طفیل کو فوٹو اسٹیٹ اُنھوں نے فراہم کیے ہیں۔ یہ عجیب دلیل ہے اور اس میں تو دنیا کی آبادی کے پانچ ارب انسانوں کا نام اضافہ کیا جا سکتا ہے جن سے میں نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ (گیلانی صاحب اگلے وقتوں کے ہوں گے مگر آپ تو ماڈرن محقّق ہیں آپ سے بھی کسی نے کہا ہوگا کہ رضا لائبریری میں بڑے بڑے تالے پڑے ہیں اور وہاں کے کتنے ہی مخطوطات غائب ہیں۔ آپ نے سُنی سُنائی بات پر اعتبار کر لیا؟)۔

(۱۸) کراچی میں حضرت کا قیام ایک بہت بڑے بیوروکریٹ کے ہاں ہوتا ہے۔ اہلِ غرض کو کسی نے سمجھا دیا کہ بیوروکریٹ صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے حضرت نثار احمد فاروقی کی دعوت کی جائے..... اہلِ غرض حضرت صاحب کی آڑ میں بیوروکریٹ صاحب کو رام کرنے کے لیے دعوتوں کا انتظام کرتے رہے۔" (یہ معلومات بھی ناقص ہیں۔ میں کراچی میں اپنے بھائی کا مہمان ہوتا ہوں۔ یہ اہلِ غرض کون ہیں جو اُن کو رام کرنے کے لیے میری دعوتوں کا انتظام کیا کرتے ہیں: ڈاکٹر جمیل جالبی، شان الحق حقی، ڈاکٹر اسلم فرخی، جناب مشفق خواجہ، جناب حمید الدین شاہد وغیرہ۔ لطیف صاحب نے ان حضرات کی اچھی عزت افزائی فرمائی)۔

(۱۹) جب اُنھیں یہ علم ہو گیا کہ طفیل صاحب کو فوٹو اسٹیٹ مل چکے ہیں تو اکبر علی خاں ہی کی طرح نثار احمد فاروقی کو بھی مایوسی ہوئی۔ (مایوسی کیوں ہوئی؟ ۱۹ ہزار تو نقد مارے، نوّے ہزار کے تین سو "نقوش" بیچے، پچاس نسخے غالب نمبر ۲ کے الگ لیے، ساڑھے چھ ہزار کی کتابیں منگوائیں۔ ایک لاکھ ساڑھے پندرہ ہزار تو یہی ہو گئے (وہ بھی ۱۹۷۰ء میں جب روپے کی قیمت آج سے دس گنی تھی) اور کیا کوہِ نور اور تختِ طاؤس طلب کرتا یا لاہور کا پٹّا لکھواتا؟)۔

اس مضمون کی اشاعت کے بعد جولائی، نومبر اور دسمبر ۱۹۸۹ء کے "طلوعِ افکار" میں لطیف صاحب اور بعض دوسرے حضرات کے خطوط چھپے ہیں اُن سے چند اقتباسات:

(۲۰) میں ایک کتاب شائع کرنا چاہتا ہوں " اردو کے تین دروغ گو" اس سلسلے کی ایک کڑی تو حضرت نثار احمد فاروقی ہیں دوسرے صاحب ہیں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ تیسرے دروغ گو آل احمد سرور صاحب ہیں۔" (اکتوبر ۱۹۸۹ء)۔ (اس مضمون کے چھپنے کے بعد تو شاید اس تعداد میں کچھ اضافہ ناگزیر ہو گا۔ ن ا ف)۔

"رشید نامی جلد ساز جب واپس جانے لگے تو مرحوم طفیل صاحب نے بیاضِ غالب بخطِ غالب کے پچاس نسخے اُسے دیے ..... ایک فہرست بھی بھیجی تھی طفیل صاحب نے۔ اُس میں کئی نام ایسے تھے جو کاٹ دیے مثلاً عصمت چغتائی۔ بھلا عصمت کو غالب سے کیا تعلق؟"

نثار فاروقی آتے ہیں تو ..... پاکستان میں وہ کہیں جائیں اُن کے لیے ہوائی جہاز سے آمد و رفت کا ٹکٹ منگاتے ہیں اور پھر اُن کی ہر فرمایش پوری کرتے ہیں۔ کتابیں تو اب بھی ڈھیروں کے حساب سے جاوید ساتھ کر دیتے ہیں۔

رشید والے قصّے کی وضاحت آگے نمبر (۲۷) پر آئے گی۔ نسخے (۵۰) نہیں (۲۹) بھیجے تھے۔ یہ میں نے نہیں کہا کہ عصمت کو غالب سے کیا تعلق؟ یہ کہا تھا کہ جتنے نسخے اُس نے لا کر دیے فہرست میں سے اتنے ہی لوگوں کو منتخب کر کے میں نے بھیج دیے تھے۔ پاکستان میں صرف ایک بار جاوید نے لاہور سے کراچی کا آمد و رفت کا نہیں صرف "رفت" کا ٹکٹ منگا کر دیا ہے۔ ایک بار میں حکومت پاکستان کا مہمان ہو کر گیا تھا، ایک اور بار سارے ٹکٹ ہندوستان سے خرید کر لے گیا تھا، تین بار ریل سے گیا ہوں اور واپسی کے ٹکٹ محمد طفیل صاحب نے فراہم کیے ہیں۔ کتابیں تو جاوید آپ کو تکلیف پہنچانے کے لیے ساتھ کر دیتے ہیں ورنہ میرا کتاب سے کیا علاقہ؟ ہندوستان لا کر میں وہ کتابیں بیچ کھاتا ہوں۔ واقعی انسان آخرت کی زندگی سے بے نیاز ہو جائے تو کچھ بھی کہہ سکتا ہے، کر سکتا ہے۔

یہ تو لطیف الزماں صاحب کے مطبوعہ مضمون اور اُس سے متعلق اُن کے خطوط

کا عطر مجموعہ تھا کئی باتیں طوالت کے خوف سے چھوڑ دی ہیں اگر لطیف صاحب کی تسلی نہیں ہو گی تو اسی مضمون کو " بہ نسخۂ کلاں" بھی لکھا جا سکتا ہے۔

(۳)

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے
جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

اب مندرجہ بالا الزامات کی تردید خود لطیف الزماں صاحب کے خامۂ حقیقت نگار سے ملاحظہ فرمایئے میری حیثیت صرف ناقل کی ہے۔ اقتباسات کے آخر میں قوسین کے اندر میری عبارت ہے۔ تو : چل مرے خامے بسم اللہ۔

(۲۱) " دید و دریافت" کو میں نے ابھی ختم نہیں کیا اس کی وجہ یہ کہ اچھی کتاب اگر جلد ختم ہو جائے تو پھر اُس کے لطف سے محروم ہونا پڑتا ہے ..... ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں اُمید ہے کہ آپ بُرا نہ مانیں گے۔ کتاب کو کسی شخص کے نام معنون کرنے کا معیار (کذا) کیا ہونا چاہیئے ؟ اُس کی خدمات ؟ ذاتی لگاؤ ؟ دوستی ؟ ذہنی رفاقت ؟"

(مکتوب ۲۵ فروری ۱۹۶۸ء)

(دید و دریافت میرے مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۶۴ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا اس کا انتساب محمد طفیل ایڈیٹر نقوش کے نام تھا۔)

(۲۲) ڈاکٹر سید عبداللہ نے تو یہ غضب ڈھایا کہ ایک جانب مرزا ادیب جیسے کمزور النسان سے مقدمہ لکھوایا، حالانکہ اُنھیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر جو باتیں وہ خود بربنائے مصلحت صاف صاف نہیں لکھنا چاہتے تھے اُس کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی کو منتخب کیا، وحید قریشی صاحب کی تنقید کا مرکزی نقطہ پیدائش اور موت ہے لیکن اس تحقیق کے بعد دوسرا کام وہ صرف یہ کرتے ہیں کہ اپنی انتہا پسند طبیعت سے مجبور ہو کر باپ دادا کو گالی دیتے ہیں ..... اگر ڈاکٹر صاحب سے پوچھا جائے تو وہ یہی کہیں گے کہ اُنھوں نے اپنی بات بڑے ہی اعتماد سے کہی ہے۔ لیکن اگر ایک شخص بڑے ہی پُر اعتماد لہجے میں دروغ گوئی کرے تو کیا اُس دروغ گوئی کا اعتراف ممکن ہے ؟ بعض حضرات بڑے ہی (Confidence)

کے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں۔" (مکتوب ۲۴ مارچ ۱۹۶۸ء)

(ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم کی کس کتاب پر تبصرہ ہو رہا ہے سرِدست بتانے سے قاصر ہوں مگر یہ عرض کرنا ہے کہ دروغ گوئی کا اعتراف شخصیت کو مدِ نظر رکھ کر ہوگا ـــــ اگر وہ دروغ وحید قریشی کا ہوگا تو ہرگز نہ مانا جائے گا مگر لطیف الزماں خاں کا ہو تو اللہ تعالیٰ کو بھی اعلان کر دینا چاہیے کہ جھوٹ بولنا حلال ہے۔)

(۲۳) ایک چیز جس سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی وہ نام و نمود کی نمائش ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ کہیں میرا نام آئے۔" (مکتوب ۱۸ اپریل ۱۹۶۹ء)

(۲۴) آپ کا وہ خط جس میں آپ نے دیوانِ غالب کے اُس نسخے کے بارے میں تحریر فرمایا تھا جو خود غالب کے قلم سے لکھا ہوا ہے، مجھے نہیں ملا۔ البتہ یہاں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ یہ نسخہ امروہہ میں دریافت ہوا ہے۔ اُمید ہے آپ دوبارہ اس کی تفصیل تحریر فرمائیں گے۔" (مکتوب ۲۹ اپریل ۱۹۶۹ء)

(۲۵) اللہ نے یہ کام آپ کے لیے رکھا تھا کہ غالب کا دیوان اور مکمل دیوان غالب کے قلم سے لکھا ہوا ملے اور آپ اُسے ترتیب دیں۔ آپ کے ہم وطن جنھیں یہ نسخہ ملا ہے خوش قسمت ترین انسان ہیں بلکہ یوں کہیے کہ اِس صدی کے وہ سب سے خوش نصیب انسان ہیں کہ غالب کا دیوان اُنھیں ملا..... یہ تو صحیح ہے کہ اس مخطوطہ کی جتنی بھی قیمت ملے وہ کم ہے مگر معلوم تو ہو کہ آپ کے ہم وطن کو اب تک کیا پیش کیا گیا ہے؟ آپ نے لکھا ہے: "میں آپ کے لیے اس کا عکس فراہم کر کے رکھ لوں گا۔" عکس مجھ تک پہنچے گا یا نہیں لیکن آپ نے یہ جملہ لکھ کر دل خوش کر دیا۔ اگر آپ واقعی یہ احسان عظیم کر سکیں تو دیر نہ کیجیے گا۔" (مکتوب ۲ مئی ۱۹۶۹ء)

(۲۶) "آپ کا آخری مضمون" دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ" اب تک نہیں پہنچا ہے اس مضمون کا شدید انتظار ہے..... آپ نے مقدمہ کے آخر میں میرا ذکر جس محبّت و خلوص سے کیا ہے اُس کے لیے شکر گزار ہوں لیکن خدا گواہ ہے میں اِس مرتبہ کا اہل نہیں جہاں آپ نے مجھے لے جا کر بٹھا دیا۔ یہ تو سوچیے کہ اتنی بلندی سے گر پڑا تو میری ایک ہڈی بھی سلامت نہ رہے گی..... طفیل صاحب "نقوش" کا غالب نمبر حصّہ دوم شائع کرنے والے ہیں اُس میں صرف

غالب کی تحریریں ہوں گی آپ نے جو خط اُنھیں لکھا تھا اُس کے حوالے سے اُنھوں نے یہ کہا ہے کہ اگر نسخۂ امروہہ کا مکمل عکس آپ اُنھیں بھیج دیں تو وہ اُسے اپنے غالب نمبر حصّۂ دوم میں شامل کر لیں گے نیز وہ الگ سے بھی مکمّل دیوان خوبصورت اور شاندار چھاپیں گے۔ اب یہ آپ کا اور اُن کا معاملہ ہے میں کچھ نہیں کہتا۔ جو آپ مناسب سمجھیں وہی کیجیے۔ میں نے آپ کو ایک کتاب بھیجی تھی "داستانِ مغلیہ"۔ اُس کتاب پر یہاں ناشر کو طباعت کا انعام ملا ہے، اگر آپ پسند کریں گے تو میں دیوانِ غالب کو آرٹ پیپر پر انتہائی شاندار اُس ادارے سے چھپواؤں گا اور ایسا کہ وہ برسوں یادگار رہے، اور پھر یہ کہ اُن سے رائلٹی بھی اسی حساب سے طے کروں گا۔ مگر اجازت تو آپ کی درکار ہے۔ اگر طفیل صاحب کو بھی آپ اجازت دے دیں گے تو کوئی حرج نہیں وہاں دوستی نبھائیے یہاں فن۔"

..... تھوڑا سا وقت نکال کر میں نے آج ریکارڈ آفس کا بھی چکر لگایا۔ جمعہ کی وجہ سے زیادہ وقت نہ مل سکا۔ چاہتا تھا کہ غالب کی عرضیاں ..... کچھ معلوم کروں۔ مگر معلوم یہ ہوا کہ افسرِ اعلا خود اپنے نام انھیں شائع کریں گے۔ انھیں ابھی محکمانہ اجازت نہیں ملی۔ ملتان میں "مہر نیمروز" کا مخطوطہ میں نے معلوم کیا تو قدرت نقوی صاحب نے دربانی کے فرائض چھوڑ کر ملکیت کا اعلان کر دیا۔ اُدھر آپ نے "تلاشِ غالب" کے مقدمہ میں خود مجھے بھی کچھ کرنے کا حکم دیا ہے۔ بتائیے اب کیا کروں؟

...... طفیل صاحب نے "نقوش" کے غالب نمبر کا ایک جلسہ کرایا میرا نام لیے بغیر اپنے مضمون میں میرا ذکر کر ڈالا کیوں کہ میں نے اُنھیں سختی سے منع کر دیا تھا کہ میرا نام نہ آئے۔ میں نے اس لیے منع کیا تھا کہ "نقوش" میں میرا ذکر نہ کر ڈالیں مگر اُنھوں نے مضمون میں ذکر اس طرح کیا کہ لوگوں نے بھانپ لیا۔" (۱۶۔۱۷ مئی ۱۹۶۹ء کی درمیانی شب از لاہور)

(اس سے ظاہر ہے کہ میں نے مئی ۱۹۶۹ء کے پہلے ہفتے میں یعنی دیوانِ غالب کی دریافت سے پندرہ دن کے اندر محمد طفیل صاحب کو یہ اشارہ دے دیا تھا کہ عکس نقوش کو مل جائیں گے۔ لطیف صاحب اسے ادارۂ کتابیات سے کتابی صورت میں چھپوانا چاہتے تھے۔ یہ ادارہ میاں افتخار الدین مرحوم کے صاحبزادے سہیل افتخار صاحب کا تھا۔ ن ا ف)

(۲۷) دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ کے سلسلے میں اب تک جو حماقت مجھ سے ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک دو حضرات سے میں یہ کہہ چکا ہوں کہ اُس کے عکس مجھے ضرور مل جائیں گے۔ لیکن یہ حضرات ایسے ہیں جنھیں غالب سے اُتنا ہی تعلق ہے جتنا اردو کے کسی عام شاعر سے۔ میں اپنی اس غلطی کے لیے آپ سے معافی خواہ ہوں۔ آیندہ سخت احتیاط برتوں گا۔..... آپ نے میرے لیے نسخۂ امروہہ کے عکس بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے اس کے لیے تہِ دل سے ممنون ہوں۔ یقیناً آپ اس نادر چیز کو ڈاک سے نہ بھیجیے بلکہ کسی صاحب کے توسط سے بھیجیے۔ آپ نے مجھ پر اعتبار کیا کہ آپ نسخۂ امروہہ میری نگرانی میں شائع کرانا چاہتے ہیں۔ یقین رکھیے کہ میں زندگی کے آخری سانس تک آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچاؤں گا۔ آپ جس قدر جلد ممکن ہو مسودہ کا عکس حواشی، مقدّمہ، فہرست اور اشاریہ غرض ہر چیز مکمّل بھیجیے۔" (مکتوب ۲۳ مئی ۱۹۶۹ء)

"طفیل صاحب نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ آپ نے اُنھیں نسخۂ امروہہ کے عکس دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی بلکہ وہ اُس کو حاصل کرنے کے لیے ممکن ہے دہلی کا سفر بھی کریں.... اگر چند قباحتوں کی وجہ سے آپ عکس اُنھیں نہیں دے سکتے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ آپ کا اور طفیل صاحب کا معاملہ ہے..... جب آپ کی کتاب "تلاشِ غالب" شائع ہوگی اور نسخۂ امروہہ تو اُنھیں یہ ضرور معلوم ہو جائے گا کہ ان دونوں کی طباعت میں میرا ہاتھ ہے تو وہ یقیناً آپ سے بھی اور مجھ سے بھی ناراض ہوں گے۔ میں تو خیر کہہ سکوں گا کہ آپ کا حکم تھا..... آپ اُنھیں یہ لکھ سکتے ہیں کہ اگر یہ دیوان چھپنے سے پہلے کہیں اور چھپ گیا تو پھر اس کی اہمیت وہ نہ رہے گی ..... آپ اوّلین فرصت میں "دیوانِ غالب بخطِّ غالب" مضمون بھیجیے۔" (مکتوب ۲۲ مئی ۱۹۶۹ء)

(۲۸) میں نے اب تک طفیل صاحب سے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا کہ ہاں میرے پاس بھی شاید اس نسخے کے عکس آجائیں گے لیکن اُن کی گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُنھیں یقین ہے کہ آپ اس نسخے کے عکس اُنھیں فراہم کر دیں گے یقیناً فراہم کر دیں گے اور یہاں اُس کی اشاعت کی اوّلیت نقوش کو حاصل ہوگی۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ صاف گوئی اچھی چیز ہے۔ آپ طفیل صاحب کو لکھ سکتے ہیں کہ اِس نسخے کی اہمیت

کیا ہو گی اگر اسے الگ شائع کر دیا جائے اور اُس کی حیثیت کیا رہ جائے گی اگر یہ صرف ان کے نمبر میں شامل کر دیا گیا۔" (مکتوب ۱۴ مئی ۱۹۶۹ء)

(۲۹) دیوانِ غالب بخطِ غالب کے سلسلہ میں ..... آپ کے احکامات کی سختی سے تعمیل ہو گی آپ اطمینانِ کلّی رکھیے کہ کسی کو یہ نہ معلوم ہو سکے گا کہ میرے توسط سے یہ دیوان چھپ رہا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اس کا مسوّدہ تیار کر لیا۔

ادارہ "نگارشات" کے مالکان سے میرے ذاتی تعلّقات ہیں وہ عرصہ سے مجھ سے تقاضا کرتے ہیں کہ غالبؔ پر کوئی کتاب انھیں شائع کرنے کو دوں۔ اب خدا نے یہ موقع دیا ہے کہ "دیوانِ غالب بخطِّ غالب" چھپوا سکوں گا ...... میں خود چاہتا ہوں کہ اس کی اشاعت میں دیر نہ ہو اور اوّلیّت کا سہرا آپ ہی کے سر رہے ..... آپ نے بار بار تاکید کی ہے مگر میں ایک ہی بار یہ عرض کر دوں کہ میرا سینہ بہت بڑا قبرستان ہے۔ اس میں سے کوئی بات کسی کو معلوم ہو یہ کیونکر ممکن ہے؟ جب آپ کا یہ حکم ہے کہ دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ کی طباعت صیغۂ راز میں رہے تو پھر ایسا ہی ہوگا۔ آپ کی ہدایات پر حرف بحرف عمل ہو گا۔ عکس آپ جون کے پہلے ہفتے میں بھیج رہے ہیں؟"

...... میں نے طفیل صاحب سے کچھ نہیں کہا سوائے اس کے کہ شاید عکس مجھے بھی مل جائیں البتّہ طفیل صاحب نے نہایت پُرجوش انداز میں فرمایا تھا کہ آپ نے اُنھیں عکس فراہم کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسے حاصل کرنے کے لیے شاید دتی پہنچیں۔ یہ بات تو اُن کے علم میں ہے کہ آپ کی اور میری خط وکتابت ہے، البتہ اُنھیں نہیں معلوم کہ غالب کے دیوان کے سلسلہ میں بھی کوئی خط وکتابت ہے ..... آپ خود یہ فیصلہ کیجیے کہ آپ طفیل صاحب کو عکس فراہم کریں گے یا نہیں۔ حالانکہ طفیل صاحب کی تحریر غالبؔ کا ایک شعر یاد دلاتی ہے:

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے اے غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

.... مالکِ نسخہ نے جتنی بھی رعایت آپ کو دی ہے وہ کچھ کم نہیں۔ ہم یہ بھی نہیں

چاہتے کہ اُن کا نقصان ہو اصل نسخے کی فروخت سے پہلے ہم دیوان چھپوا لینا چاہتے ہیں لیکن اُسے بازار میں اس وقت پیش کیا جائے گا جب اصل نسخہ فروخت ہو جائے گا..... طفیل صاحب کو یا کسی شخص کو یہ علم نہیں کہ نسخۂ امروہہ یہاں میرے توسط سے چھپے گا۔ (۲۰ مئی ۱۹۶۹ء)

(۳۰) دیوان کے عکس کا شدید انتظار ہے۔ آپ طفیل صاحب کو یا ترقی مجلس (کذا) کو کیا جواب دیں گے یہ آپ جانیں میں تو اتنی ہی بات جانتا ہوں کہ مجھ پر جو اعتماد آپ نے کیا ہے اُس کو کسی قیمت پر ٹھیس نہ پہنچے گی..... آپ یہ پورا مہینہ کوئی اور کام نہ کیجیے بس کسی طرح اُس کے حواشی اور مقدّمہ وغیرہ تحریر کر لیجیے اور جولائی کے پہلے ہفتے تک ہر چیز مکمل مجھے بھیج دیجیے.....۔ (۲ جون ۱۹۶۹ء)

(۳۱) "تلاشِ غالب کے لیے جو نو دریافت غزلیں آپ نے بھیج دی ہیں انھیں کتاب میں شامل رہنے دیجیے..... میں آپ سے جھوٹ نہ بولوں گا میں نے واقعی کچھ لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ نو دریافت دیوان کے عکس مجھے مل جائیں گے، جب آپ نے یہ خوش خبری دی تھی تو پابندی عائد نہ کی تھی ورنہ میری کیا مجال کہ آپ منع کریں اور میں تعمیلِ حکم نہ کروں اب تو جو حماقت ہو گئی ہے اُس سے درگزر کیجیے آیندہ کے لیے وعدہ ہے..... (۷ جون ۱۹۶۹ء)

(۳۲) فاروقی صاحب یقین کیجیے میں دوستی کے نام پر اپنی جان پر کھیلنے کو تیار ہوں، بڑے سے بڑا الزام اپنے سر لینے کو تیار ہوں..... مجھے اپنا جانیے۔ الفاظ نہیں میرا عمل ہی یہ بات طے کر سکے گا کہ جو اعتبار آپ نے مجھ پر کیا ہے اُسے اپنی زندگی کے آخری سانس تک ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا..... (۱۱ جون ۱۹۶۹ء)

(۳۳) دیوانِ غالب نسخہ امروہہ کے عکس حواشی مقدّمہ وغیرہ ہر چیز مکمل صورت میں چچا جان کے ہمراہ بھیج دیجیے۔ ڈاک سے ہرگز نہ بھیجیے..... دیوانِ غالب کی اشاعت یقیناً عمدہ طریقہ پر ہو گی میں کوشش کروں گا کہ اب تک جتنی شرائط آپ نے مختلف خطوط میں لکھی ہیں اُن کی پابندی ہو۔" (مکتوب ۱۶ جون ۱۹۶۹ء)

(۳۴) آپ مجھ پر کتنا کرم کرتے ہیں عجیب بات تو یہ ہے کہ دنیا والوں نے ہمیشہ مجھے حقارت سے ٹھکرایا، میں نے ہمیشہ خلوص برتا لیکن جواب میں ہمیشہ نفرت ہی ملی۔ میری

زندگی میں آپ سے نصف ملاقات اپنی نوعیت کا عجیب و غریب واقعہ ہے۔ خداوند کریم آپ کو اس کا اجر دے گا ..... دیوانِ غالب کے عکس ..... چچا جان کے ہمراہ بھیجیے گا اور انھیں سختی سے یہ ہدایت کر دیجیے کہ جب وہ لاہور پہنچ جائیں تو مجھے مطلع کر دیں میں خود جا کر ان سے سب چیزیں لے لوں گا۔ خدا سے ہمہ وقت دعا مانگتا ہوں کہ دیوان کی طباعت کا کام بخیر و خوبی ہو جائے۔ آپ نے اتنا بڑا بار میرے سر پر رکھ دیا ہے کہ میں جس کا اہل نہیں تھا....

(مکتوب ۲۰ جون ۱۹۶۹ء)

(۳۵) میں اکثر سوچتا ہوں کہ آپ مجھ جیسے نامعقول ناکارہ اور فضول شخص کو کس قدر محبت اور خلوص سے یاد کرتے ہیں اپنی نارسائی، حماقت اور جہالت کا خیال آتا ہے تو کانپ اُٹھتا ہوں۔ سوائے اس کے کیا کہوں کہ خداوند کریم ہی آپ کو اس خلوص اور محبت کا اجر دے گا۔ میں تو اب تک آپ کے لیے خواہش کے باوجود کچھ نہیں کر سکا ہوں۔

..... تلاشِ غالب کے آخری مضمون میں جو نو دریافت کلام موجود ہے اُس کی اہمیت کا مجھے بخوبی اندازہ ہے نیز یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مالک نسخہ سے آپ کا جو معاہدہ ہے اُسے بہر قیمت قائم رہنا چاہیے ..... اگست کے آخر اور ستمبر کے اوائل میں مخطوطہ فروخت ہو جائے تو بہت اچھا ہے کیونکہ انھیں ایام میں دونوں چیزیں یعنی تلاشِ غالب اور دیوانِ غالب چھپ کر تیار ہو جائے گا بشرطیکہ جولائی کے آخر تک عکس اور حواشی مع مقدمہ مجھے مل جائیں۔ آپ اطمینان رکھیے آپ نے مالکِ نسخہ سے جو وعدہ کیا ہے اُس کا پاس ہر حال میں رکھا جائے گا۔" (مکتوب ۲۱ جون ۱۹۶۹ء)

(۳۶) ..... دیوانِ غالب کا عکس ڈاک سے ہرگز نہ بھیجیے، اگر کوئی صاحب اکتوبر سے پہلے تشریف لائیں تو ٹھیک ہے ورنہ چچا جان کے ہمراہ ہی بھیجیے کوئی حرج نہیں .... میں دیوانِ غالب کی طباعت کا انتظام کسی نہ کسی طرح کر ہی لوں گا۔ (مکتوب ۲ جولائی ۱۹۶۹ء)

(۳۷) تلاشِ غالب کی طباعت میرے اندازے کے مطابق اکتوبر سے قبل نہیں ہو سکے گی۔ یقین ہے کہ اُس وقت تک مالکِ نسخہ فروخت کر چکے ہوں گے اور آپ پر جو پابندی ہے اُس سے آپ آزاد ہو جائیں گے ..... میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ڈاکٹریٹ کرنا چاہتا

ہوں. کام بھی غالب پر کرنا چاہتا ہوں۔ مکرمی وقار عظیم صاحب چیر سنبھالے ہوئے ہیں۔ اُن سے گفتگو ہوئی تھی اوّل تو وہ غالب پر ڈاکٹریٹ کے قائل ہی نہیں۔ میرے ساتھ پریشانی یہ کہ میں سوائے غالب کے کسی اور پر کام نہیں کرنا چاہتا (طرفدار جو ہوا) وقار صاحب اس پر آمادہ ہیں کہ موضوع اچھوتا، نیا اور معنی خیز ہو تو اجازت دے دیں گے۔ اب آپ ہی بتلائیے کیا کروں؟" (مکتوب ۸ جولائی ۱۹۶۹ء)

(۳۸) ..... طفیل صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے بتلایا کہ جلال الدین صاحب نے ایک بڑا لمبا چوڑا مضمون "دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ" کے متعلق لکھا ہے اور وہ اُسے غالب نمبر حصّہ دوم میں شائع کر رہے ہیں۔ وزیر الحسن عابدی صاحب بھی وہاں موجود تھے، اُنھوں نے اور طفیل صاحب نے بتلایا کہ مخطوطہ اب عرشی صاحب کے پاس پہنچ گیا ہے اور عابدی صاحب نے یہ رائے ظاہر کی کہ پہلا کام عرشی صاحب نے یہ کیا ہوگا کہ اُسے حرف بہ حرف نقل کر لیا ہوگا۔ یہ بات عابدی صاحب نے تجربہ کی بنا پر کہی ہے۔ اُن کا فرمانا تھا کہ "باغ دودر" جب عابدی صاحب نے عرشی صاحب کو دکھلائی تو انھوں نے اُسے نقل کر لیا تھا۔ اگر بات اکبر علی خاں کی ہوتی تو میں ایک لمحے کے توقّف کے بغیر یقین کر لیتا لیکن عرشی صاحب؟ لیکن وزیر الحسن عابدی صاحب نے جس انداز سے کہا اُس پر سوائے یقین کر لینے کے کوئی چارہ نہ تھا..... میں نے میاں سہیل صاحب سے دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ کی طباعت کی بات کر لی ہے وہ یہ فرماتے تھے کہ ٹائپ میں نہیں بلکہ وہ صرف اس طرح شائع کر سکیں گے جیسی داستان مغلیہ تھی۔ میں نے اس پر بھی رضامندی ظاہر کر دی ہے ..... دلّی کے دورانِ قیام یہ آپ سے ملیں گے ..... چچا جان جب تشریف لائیں تو جو کچھ غالب پر وہ لا سکیں اور آپ بھیج سکیں احسان ہوگا۔ ایگل کے فلاسک کا بھی منتظر رہوں گا۔"

(مکتوب ۴ اگست ۱۹۶۹ء)

(۳۹) اِس دور میں جلال الدین صاحب اور اکبر علی خاں صاحب جیسے حضرات ہی کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔ آپ نے تو توفیق صاحب سے وعدہ کر لیا تھا کہ جب تک نو دریافت مخطوطہ فروخت نہ ہو جائے آپ اپنی کتاب شائع نہ کریں گے مگر ہوا کیا؟ وہ آپ کے

سامنے ہے۔ اب توفیق صاحب سے ہی کہیے کہ وہ صحیح صورتِ حال سے غالبؔ کے پرستاروں پر (کذا) واضح کریں کہ یہ نسخہ کس نے دریافت کیا اور سب سے پہلے اُسے کس نے دیکھا۔ جلال الدین صاحب نے اپنے مضمون میں توفیق صاحب کا دہلی جانا تحریر کیا ہے (جہاں آپ دیوان دیکھ چکے تھے) مگر دریافت کا سہرا اُنھوں نے اپنے ہی سر پر باندھا ہے۔

نسخۂ امروہہ کی دریافت کے بعد جب آپ کا مضمون آگیا تھا تو میری بڑی زبردست خواہش تھی کہ "تلاشِ غالب" فوراً شائع ہو کر بازار میں آجائے۔ مگر پاسِ ادب اور آپ کے ایفائے وعدہ کے خیال نے مجھے اظہارِ خیال تک سے روکا۔ آج میں پچھتاتا ہوں کہ کیوں نہ میں نے خود یہ فیصلہ کر لیا کہ کتاب چھپ جائے۔..... اکبر علی خاں صاحب سے میں اگرچہ آج تک نہیں ملا مگر جو حرکات وہ کرتے رہے ہیں اُن سے میں بخوبی واقف ہوں۔ یہاں اس ملک میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ملے جو غالبؔ کو پڑھتا ہو اور اُس سے اکبر علی خاں صاحب نے یہاں کی مطبوعات منگا کر چُپ نہ سادھ لی ہو۔ پھر بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ نسخۂ امروہہ کا مخطوطہ اُن کے ہاتھ میں جائے بھی اور وہ اُس کا عکس نہ لے لیں۔ (۲۲ اگست ۱۹۶۹ء)

(۴۰) میں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ کلمۂ حق کو دوام حاصل ہوتا ہے لیکن پروپیگنڈا اپنے اثرات چھوڑے بغیر پروپیگنڈا کیا ہوا؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ توفیق صاحب صحیح صورتِ حال سے اِس نسخے کے بارے میں لکھیں؟

.... ایک بڑے مزے کی خبر سنیے: سیّد قدرت نقوی صاحب نے ملتان میں اسکول کی ملازمت ترک کر دی۔ وہاں اُنھیں ایک سو دس روپے ماہانہ ملتا تھا۔ حقّی صاحب نے حقِ دوستی یوں ادا کیا ہے کہ جوش صاحب کو ترقی بورڈ سے نکالا اور ساڑھے چھ سو روپے ماہانہ پر قدرت صاحب کا تقرّر کر لیا۔ جوش صاحب کا نعم بدل (کذا) کیا خوب تلاش کیا ہے۔ اب قدرت صاحب لغت نویسی پر مامور ہیں۔ ایک منشی فاضل پاس اور لغت نویسی۔ قَالُوٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (کذا)۔ (مکتوب ۳ ستمبر ۱۹۶۹ء)

(۴۱) مجھے یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ سہیل صاحب آپ سے ملنے پہنچے وہ بہت بڑے باپ کے بیٹے ہیں اور نہایت با اُصول انسان ہیں.... آپ سے چوک ہو گئی اگر آپ سہیل صاحب

سے دیوان کی طباعت کا ذکر کر دیتے تو بہت اچھا ہوتا۔ وہ اگر آپ سے وعدہ کر لیتے تو دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جاتی وہ شائع کرتے اور جلد کرتے۔ مجھ سے اُنھوں نے اس نو دریافت کلام کو شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا..... مسودہ اور عکس اگر آپ اُن کے حوالے کریں تو مجھے فوراً مطلع کیجیے گا تاکہ میں جا کر وصول کر لوں..... چچا جان کے ہمراہ اگر آپ روانہ کریں تو زیادہ مناسب ہے۔" (مکتوب ۸ ستمبر ۱۹۶۹ء)

(۴۲) پروفیسر احمد علی صاحب کی کتاب انگریزی میں اٹلی سے چھپ کر آئی ہے، بارہ روپے قیمت ہے مگر وہ میں آپ کو نہیں بھیجوں گا اُسے دیکھ کر جی جل گیا انگریزی میں ترجمہ بعض جگہ بالکل (کذا) گھاس کوڑا ہے۔ لفظی ترجمہ بھی نہیں۔ یہ پروفیسر احمد علی (ہماری گلی) اور دلّی کی شام کے مصنف ہیں۔ بڑے مشہور و معروف مگر غالب کا ترجمہ کیا تو بس علمیت ہی ختم کر ڈالی۔" (مکتوب ۸ ستمبر ۱۹۶۹ء)

(۴۳) میں ۱۱ ستمبر کو ملتان پہنچوں گا اور اوّلین فرصت میں لاہور جاؤں گا تاکہ تلاشِ غالب کے مکمل پروف حاصل کروں..... نہ میں اُس کا نام تبدیل کروں گا نہ مرتّب کی کی حیثیت سے اپنا نام لکھوں گا۔ دوسرے کی محنت کو اپنی جھولی میں ڈال کر فخر کرنا سیّد قدرت نقوی صاحب کو زیب دیتا ہے یا پھر جلال الدین صاحب کو۔ میں اُن کا ہم پلّہ نہیں بننا چاہتا..... یہاں کے رسائل میں تو یک طرفہ مضامین شائع ہوئے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جلال الدین صاحب نے اوّلیت کا تاج پہن لیا ہے اور یہ تاج اُن کی نجات کا باعث ہوگا۔ یہ بات تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ مالک مخطوطہ نے اُنھیں نو دریافت کلام شائع کرنے کی اجازت نہ دی ہوگی.....

آپ نے اچھا کیا کہ توفیق صاحب کے INTEREST کو ملحوظ رکھا، مدِّ نظر رکھا اور مخطوطہ کی فروخت تک اپنی کتاب کو روک لیا۔ لیکن میں تو سمجھ رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں گھپلا ہو جائے گا اور جب اکبر علی خاں کا نام درمیان میں آیا تو میرا خیال یقین میں تبدیل ہو گیا کہ اب نو دریافت کلام سامنے آجائے گا۔ معلوم ہوا کہ جلال الدین صاحب اُن سے بھی بڑے کاریگر ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے شرافت کے دامن کو ہاتھ سے نہیں جانے

دیا۔ ..... اگر آپ نے عکس کے ہمراہ حواشی روانہ نہ کیے تو میں صرف دیوان چھپوانے کی کوشش کروں گا۔
(مکتوب ۶ ستمبر ۱۹۶۹ء)

(۴۴) ..... کیا سہیل صاحب سے حیدر آباد میں ملاقات ہوئی ؟ واپسی سے قبل اگر وہ آپ کو دہلی میں مل جائیں تو دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ کی طباعت کے بارے میں ضرور اُن سے کھل کر بات کیجیے۔ میں اس نسخے کے عکس اور حواشی کا منتظر ہوں۔" (مکتوب ۱۹ ستمبر ۱۹۶۹ء)

(۴۵) ..... ۴ اکتوبر کو قبلہ چچا جان کا خط ملا کہ ۵ اکتوبر کو لاہور جا کر اُن سے نیاز حاصل کروں چنانچہ حکم کی تعمیل کی اور وہاں گیا۔ صبح کو ناشتہ اُن کے ساتھ کیا۔ مندرجۂ ذیل کتب و رسائل اُنھوں نے عنایت فرمائیں ..... ایک فلیگ جس پر غالب کے اشعار ہیں اور عکس۔ چچا جان کے ہاں سے واپس آیا تو دن بھر نہ کہیں گیا اور نہ کوئی کام کیا بس اس دولت کو دیکھتا رہا کہ جس کے مقابلے میں قارون کے خزانے کی بھی کوئی حیثیت نہیں شکریہ کا لفظ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ وہ میرے جذبات کی ترجمانی نہ ہوگی۔ اللہ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ ہی اس کا اجر آپ کو دے گا۔

..... سہیل صاحب دیوانِ غالب شائع کرنا تو چاہتے ہیں لیکن قطعیت کے ساتھ ابھی اُنھوں نے وعدہ نہیں کیا اُن کے اندازے کے مطابق جس قسم کا دیوان میں شائع کرانا چاہتا ہوں اُس پر کم از کم چالیس پینتالیس ہزار روپے کی لاگت آئے گی ..... میں طفیل صاحب سے بھی ملا۔ وہ نقوش کا ایک اور غالب نمبر شائع کر رہے ہیں یہ مصوّر ایڈیشن ہوگا اس میں غالب کی نایاب اور کمیاب تحریریں ہوں گی۔ "گلِ رعنا" کا اصل نسخہ لاہور میں ایک صاحب کے پاس ہے اور بارہ ہزار دینے والے موجود ہیں مگر وہ صاحب بیس ہزار مانگتے ہیں۔ طفیل صاحب اس کا عکس حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور امید ہے کہ عکس مل جائے گا پھر وہ مقیش صفحات پر اُسے شائع کریں گے .....

طفیل صاحب نے نسخۂ امروہہ کے عکس حاصل کرنے کے لیے پاسپورٹ اور ویزا حاصل کر لیا تھا مگر چوں کہ اُنھیں یقین نہ تھا کہ عکس مل سکیں گے۔ سفر ملتوی کیا ویزا کا وقت نکل گیا۔ دروغ مصلحت آمیز کے لیے پروردگار مجھے معاف کرے میں اُن سے

کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ہاں ایک بات یاد آئی کہ آپ نے میرے پیکٹ پر میرے نام کے بعد معرفت طفیل صاحب کیوں لکھا؟ میرے پہنچنے میں اگر دیر ہو جاتی تو یقیناً چچا جان تمام چیزوں کے ساتھ عکس بھی طفیل صاحب کو دے آتے وہ اُسے کھولتے دیکھتے، آپ کے بارے میں کیا خیال فرماتے اور میرے بارے میں کیا سوچتے؟

بہر کیف۔ اب آپ سے ایک بات ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ اجازت دیں تو عکس طفیل صاحب کو دوں تاکہ وہ نقوش کے غالب نمبر میں شامل کر لیں ..... مجھے آپ صاف صاف لکھیے کہ کیا آپ اجازت دیں گے؟ اگر آپ نے اجازت نہ دی تو پھر یہ اُس وقت تک میرے پاس محفوظ ہیں جب تک غالب کا دیوان شائع کرنے کے لیے کوئی تیّار نہیں ہو جاتا۔ (مکتوب ۸ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

(۴۶) میں نے تو آپ کو پہلے ہی لکھا تھا کہ جلال الدین صاحب نے نسخۂ امروہہ کی دریافت کا سہرا خود باندھ لیا ہے۔ مجھے یہ پڑھ کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے اس سطح پر آنا پسند نہ کیا..... یہ زمانہ تو پروپیگنڈے کا ہے اور جلال الدین صاحب اس سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کم از کم یہ تو کر ہی سکتے ہیں کہ وہاں کے اخبار اور رسائل میں صحیح حالات سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ اگر آپ، توفیق صاحب اور اپنا مضمون نقل کر کے (چھپا ہوا تو آوے گا نہیں) بھیج دیں تو پھر یہاں کے اخبارات و رسائل میں اُن کو (Re-produce) (2) 2: کرایا جا سکتا ہے......

یہاں آج اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ اکبر علی خاں نے وہی کیا جس کا اندیشہ وزیر الحسن عابدی صاحب نے کیا تھا یعنی نسخے کا عکس شائع کر دیا ہے۔ یہاں ابھی کسی اور کے پاس عکس نہیں پہنچے ہیں..... میں لاہور ۷ اکتوبر کی شام کو لاہور سے روانہ ہوا۔ طفیل صاحب کو اُس وقت تک آپ کا خط نہیں ملا تھا۔ آپ کا خط ملتے ہی پہلا کام میں نے یہ کیا کہ طفیل صاحب کو ٹرنک کال پر بتلایا کہ عکس پہنچ چکے ہیں۔ اب وہ پرسوں یعنی ۱۲ اکتوبر بروز اتوار تشریف لائیں گے اور میں آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے عکس انھیں دے دوں گا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی عرض کروں گا کہ آپ جلد از جلد اِس نسخے کے بارے میں مضمون

لکھ کر بھیجیے۔ بات کچھ یوں ہوگی کہ عکس بھیجنے کی ذمّہ داری اب بھی آپ پر نہیں آنی چاہیے تاکہ توفیق صاحب کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔ ہاں یہ بے حد ضروری ہے کہ یہاں کے قاری کو صحیح صورتِ حال معلوم ہو جائے ..... آپ مضمون قسط وار مجھے یا طفیل صاحب کو بھیج دیجیے یعنی اگر مکمل مضمون یکبارگی نہ آپائے تو خطوط کی شکل میں بھیجیے۔ "نقوش" دسمبر میں شائع ہوگا اگر کوئی صاحب آنے والے ہوں تو مضمون آسانی سے لا سکیں گے..... نقوش کے لیے مضمون جو عکس کے ساتھ شائع ہو سکے ضرور بھیجیے..... اگر آپ کا مضمون نہ آیا تو "تلاشِ غالب" میں نسخۂ امروہہ سے متعلق جو مضمون ہے اُسے شامل کرا دوں گا لیکن ضروری ہے کہ آپ توفیق صاحب کے حوالے سے دوسرا مضمون لکھیں تاکہ اصلیت معلوم ہو سکے۔

جلال الدین اور اکبر علی خاں اگر جھوٹ بول سکتے ہیں تو کیا آپ سچ نہیں بول سکتے؟

(مکتوب ۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۹ء)

(۴۷) جب ۹ر اکتوبر کو مجھے آپ کا خط ملا تو میں نے طفیل صاحب کو ٹیلیفون کیا اور وہ آج لاہور سے تشریف لے آئے۔ آپ کے حکم کی تعمیل کی اور عکس اُنھیں دے دیے۔ طفیل صاحب کو آپ کا خط مل چکا ہے.......... خیال اُن کا یہ تھا کہ نقوش غالب نمبر حصّہ دوم دسمبر میں شائع کریں لیکن اب وہ نومبر ہی میں شائع کریں گے..... اگر آپ نے نیا مضمون بھیج دیا تو ٹھیک ورنہ پھر تلاشِ غالب والا مضمون ہی شامل کر لیا جائے گا۔ طفیل صاحب چاہتے ہیں کہ میرا ذکر بھی آئے مگر مجھے نام و نمود سے نفرت ہے میں نے اُنھیں سختی سے منع کیا ہے..... طفیل صاحب نے بھی یہی فرمایا کہ عکس کی ذمّہ داری آپ نہ لیجیے بس مضمون آپ کا اور عکس کی ذمّہ داری میری یا کسی اور کی۔ اس سے یہ ہوگا کہ آپ کو توفیق کچھ کہہ نہ پائیں گے نیز آپ یہ کہہ سکیں گے کہ آپ نے صرف اپنی کتاب کے لیے مضمون لکھا تھا وہ شامل کر لیا گیا ہے یا اگر نیا مضمون بھی ہوگا تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ طفیل صاحب کی فرمائش پر لکھا ہے..... آج طفیل صاحب آئے بھی اور واپس بھی چلے گئے میں نے دوپہر کو کچھ اور لوگوں کو بھی کھانے پر مدعو کیا تھا..... ایک نہایت ضروری کام یہ ہے کہ اگر آپ نے نئے نسخے کی کتابت کرالی ہے تو اُس کی ایک نقل فوراً طفیل صاحب کو بھیج دیجیے

کیونکہ ممکن ہے غالب کا لکھا ہوا کاتب صحیح نہ پڑھ سکے کیونکہ پروگرام تو یہی ہے کہ ایک جانب غالب کا عکس اور دوسری جانب کتابت شدہ غزل ہوگی۔ آپ نے اسے صحیح صحیح پڑھ لیا ہوگا اس لیے کتابت شدہ کاپی میں غلطی میں (کذا) امکان نہ رہے گا اور طفیل صاحب کو آسانی ہو جائے گی۔ (مکتوب ۱۲ر اکتوبر ۱۹۶۹ء)

(۴۸) چچا جان نے مجھے ایک خط امروہہ سے ۲۷ر ستمبر کو لکھا تھا اور حکم یہ تھا کہ ۵ر اکتوبر کو لاہور پہنچوں۔ چنانچہ اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ اتوار ۵ر اکتوبر کو صبح ناشتا اُنھیں کے ساتھ کیا ..... اگر آپ کا خط میری روانگی سے قبل مل جاتا تو میں یقیناً عکس طفیل صاحب کو دے آتا لیکن آپ کا لفافہ جب مجھے لاہور سے واپسی پر ملا تو میں نے طفیل صاحب کو ٹیلیفون کیا وہ گزشتہ اتوار یعنی ۱۲ر اکتوبر کو تشریف لائے اور میں نے عکس اُن کے سپرد کر دیے۔ حق بحقدار رسید۔ طفیل صاحب فرماتے تھے کہ آپ کا خط انھیں مل چکا ہے ..... مخطوطہ کی (Release) نہیں بلکہ اُس کا تعارف زیادہ اہمیت کا حامل تھا اور یہ تعارف سب سے پہلے آپ نے کرایا۔ ثبوت تو موجود ہے کہ تلاشِ غالب میں یہ مضمون "دیوانِ غالب: نسخۂ امروہہ" موجود ہے اور اس میں مکمّل روداد ہے۔ میں نے ٹائپ شدہ جتنا مضمون میرے پاس تھا طفیل صاحب کو دے دیا تھا..... اگر آپ کا نیا مضمون نہ آسکا تو یہی مضمون شامل کر دیا جائے گا۔ میرا خیال اب یہ ہے کہ اسی مضمون کو نقوش غالب نمبر حصّہ دوم میں شامل ہونا چاہیے اس سے کئی فائدے ہیں۔ اوّل تو اُس مضمون سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ تعارف سب سے پہلے آپ نے کرایا لیکن چونکہ مالک مخطوطہ کو مالی نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا آپ نے کتاب کی اشاعت کو التوا میں ڈالا۔ دوسرے یہ کہ کتاب کو اُس سے شہرت ملے گی۔ تیسری بات یہ کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے گا اور بالخصوص توفیق صاحب کو اُن کے ساتھ زیادتی کس نے کی ہے؟

ہاں ایک بات یاد رکھیے نقوش غالب نمبر حصّہ دوم شائع ہونے کے بعد بھی یہ "الزام" آپ پر نہیں ہونا چاہیے کہ عکس آپ نے بھیجے ہیں۔ اس میں بعض پیچیدگیاں ہیں جن کا اظہار اس وقت درست نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ اکبر علی خاں صاحب توفیق صاحب کو بھڑکا دیں

کہ آپ نے عکس حاصل ہی اس لیے کیے تھے کہ نقوش کو بھیج دیں اور میں نہیں چاہتا کہ یہ یا اور کوئی الزام آپ پر آئے..... طفیل صاحب سے جو آپ کے مراسم ہیں اور میرے بھی اُن کے پیش نظر ان سے یہ کہنا کہ صاحب عکس کے بدلے چار نسخے دے دیجیے (یعنی عکس کی اُجرت چار سو روپے۔ نثار) معیوب معلوم ہوتا ہے حسابِ دوستاں در دل والا معاملہ ہی ٹھیک ہے۔ (مکتوب ۱۷؍ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

(۴۹) ..... ولید صاحب نے بہت پریشان کیا ہے۔ نسخۂ امروہہ والا مضمون اب تک فراہم نہیں ہو سکا ہے میں نے ٹیلیفون پر طفیل صاحب کو مطلع کیا کہ اگر ہفتہ ۲۵؍ اکتوبر تک مضمون نہ ملا تو میں خود لاہور پہنچوں گا چنانچہ میں ۲۵؍ اکتوبر کی شام کو طفیل صاحب کے پاس پہنچا... گھر لے گئے رات کو سوا گیارہ بجے اُن کے ہاں سے آیا اور ولید میر کے گھر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ حضرت فلم دیکھنے گئے تھے، تین بجے صبح آئے۔ جاگتا رہا، جب تین بجے وہ آئے تو مضمون کے بارے میں بتلایا کہ ۲۶؍ کو تو اتوار ہے اور پریس بند ہے مضمون نہیں مل سکتا ۲۷ یا ۲۸ اکتوبر تک انھوں نے مضمون دینے کا وعدہ کیا ہے..... طفیل صاحب اور میں نے یہ طے کیا ہے کہ نقوش غالب نمبر حصّہ دوم بھی دو حصّوں پر مشتمل ہو گا پہلے حصّے میں عکس اور دیوان اور صرف آپ کا مضمون "دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ" ہو گا دیوان پر "نسخۂ امروہہ" ہی لکھا جائے گا..... آپ دو کام فوراً کیجیے (۱) مسوّدہ جس قدر جلد ہو طفیل صاحب کو بھیج دیجیے کیونکہ بعض جگہ الفاظ کا پڑھنا کاتب کے لیے ممکن نہیں ہے اور عکس دوسروں کو دکھلائے نہیں جا سکتے۔ (۲) دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ کا آخری صفحہ یعنی جہاں سے غزلیات کے پہلے مصرعے نمبر وار آپ نے درج کیے ہیں یہ حصّہ اگر آپ کے پاس ہو تو نقل کر کے مسودے کے ہمراہ بھیج دیجیے کیوں کہ خدا نخواستہ کسی وجہ سے ولید صاحب مضمون دے سکے تو مضمون مکمل صورت میں تو شائع ہو سکے۔ مضمون کا پہلا حصّہ تو کمپوز ہو چکا تھا وہ میں نے طفیل صاحب کو دے دیا ہے۔

(مکتوب ۲۷؍ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

(۵۰) ..... میں نے آپ کو ۱۲؍ اکتوبر کو جو خط لکھا تھا اُس میں یہ عرض کیا تھا کہ طفیل صاحب حسبِ وعدہ آئے میں نے دیوان اُن کو دے دیا کیوں کہ اس کے متعلق آپ کی

ہدایت ۹ر اکتوبر کو مل چکی تھی..... اچھا اب ایک بات سنیئے، میں آج مسعود اشعر صاحب کے پاس گیا تھا اکبر علی خاں کا خط لے آیا ہوں۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیے :

"ایک اعلان حکیم نبی احمد خاں صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر صغیر احمد خاں کی طرف سے امروز میں شائع کرا دیجیے کہ :

"مخطوطہ دیوانِ غالب مکتوبہ سہ شنبہ ۱۴ر رجب (سنہ ندارد) کو پاکستان میں شائع کرنے کے جملہ حقوق میرے نام محفوظ ہیں بغیر تحریری اجازت کوئی صاحب اس نو دریافت کلام یا اختلافات اور اصلاحات اور اُس سے پتا چلنے والی نئی معلومات کو مضمون یا کتاب کی صورت میں شائع کرنے کے مجاز نہ ہوں گے خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی کی جائے گی۔ ڈاکٹر صغیر احمد خاں ایم بی بی ایس سمن آباد لاہور"۔

اس اعلان پر جو خرچ آئے وہ حکیم صاحب قبلہ سے لے لیجیے مگر اس اعلان کی اشاعت بھی ضروری ہے۔ اکبر علی خاں"

انگریزی میں جو تحریر ہے اُس کے حاشیے پر اکبر علی خاں نے لکھا ہے : "اسے کسی بڑی نیوز ایجنسی کو ریلیز کرنے کے لیے دے دیجیے تاکہ آپ کے یہاں تمام انگریزی اخبارات میں آجائے اور رام پور کا نام اُونچا ہو۔"

آئیے اب اس تحریر کا جائزہ لیں : سب سے پہلی بات تو یہ کہ اکبر علی خاں کو یہ یقین نہیں ہے کہ صغیر احمد خاں خود اشتہار دیں گے اس لیے مسعود اشعر کو لکھا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکبر علی خاں کو شاید یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ جلال الدین صاحب اپنے سر اس دریافت کا سہرا باندھتے تمام نو دریافت کلام اپنے مضامین میں درج کر چکے ہیں۔ نقوش کے گزشتہ شمارے میں جلال الدین صاحب کا مضمون دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں..... بلکہ "اختلافات اور اصلاحات اور اُس سے پتا ملنے والی نئی معلومات" کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ

"افکار" میں مضمون شائع ہو چکا ہے ..... آپ کا مضمون بھی "آج کل" میں شائع ہو چکا ہے بلکہ "افکار" میں وہ (Re-produce) (2) 2: بھی ہو چکا ہے۔ اصل چیز کو اکبر علی خاں چھوڑ ہی گئے ہیں یعنی عکس کی اشاعت و طباعت ..... یہاں اب تک اس قسم کا اشتہار کسی اخبار میں نہیں آیا ..... خط پر کوئی تاریخ نہیں ہے البتہ اردو کا جو اشتہار اُنھوں نے بھیجا ہے اُس پر یکم اکتوبر لکھا ہے ..... میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یہ اعلان یہاں شائع بھی ہو جائے تو اُس کا ہم پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟ کہ خود جو چاہیں کر لیں اور دوسرا مضمون یا کتاب میں اُسے نہیں لکھ سکتا۔ یہ خیال بے وقوفی کی انتہا ہے۔ جب غالب کا دیوان شائع ہو ہی گیا تو ہر شخص اُسے پڑھے گا بھی اور لکھے گا بھی ..... کیا یہ نسخۂ عرشی زادہ واقعی چھپ گیا ہے اور کیا یہ بازار میں فروخت ہو رہا ہے؟ ..... یہاں یہ دیوان "نقوش" کے حصّۂ دوم کے پہلے حصّے میں بالکل الگ شائع ہو گا اُس میں آپ کا مضمون بھی شامل ہو گا ..... آج ہی طفیل صاحب کا خط بھی آیا ہے، اُنھوں نے "ہماری زبان" کے وہ تمام شمارے پڑھ لیے ہیں جن میں توفیق صاحب، جلال الدین صاحب، اکبر علی خاں اور آپ کے خطوط شائع ہوئے ہیں۔ اُن کا یہ جملہ پڑھ لیجیے:

> "ظاہر ہے، ہمیں دلچسپی فاروقی صاحب سے ہے۔ پہلی بات یہ کہ دوستی ہے (دوسری بات نہیں لکھتا) تیسری بات یہ کہ اس قضیے میں فاروقی صاحب کا کردار زیادہ معقول رہا۔ چوتھے یہ کہ فاروقی صاحب ہی توفیق صاحب کے سپورٹر ہیں ..... میں تو فاروقی صاحب کے لیے بہت کچھ کرتا مگر وہ خود ہی بھاگ رہے ہیں کہ سوائے مضمون کی اشاعت کے میرا نام ظاہر نہ کیا جائے۔" (محمد طفیل)

میں آج ہی، میرا مطلب ہے اس خط کے بعد اُنھیں کو خط لکھوں گا اور بتلاؤں گا کہ آپ نے ایسا فیصلہ کیوں کیا؟

میں دیوان پر اپنا نام کیوں کر دے سکتا ہوں؟ دوسرے کی محنت اپنی جھولی میں نہیں ڈال سکتا۔ میرے لیے یہی اعزاز کچھ کم نہیں کہ آپ نے ایسا لکھا اور طفیل صاحب نے

ایسا سوچا..... دیوان کا مسوّدہ (تاکہ کتابت میں غلطی نہ رہ جائے) حواشی (تاکہ دیوان کو آرٹ پیپر پر سہیل صاحب شائع کر سکیں) اور دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ والے مضمون کی نقل (کہ اگر ولید صاحب نامعقولیت برت لیں تو نقوش کی اشاعت میں دیر نہ ہو) یہ سب چیزیں جلد بھیجیے۔ (مکتوب ۲۸ر اکتوبر ۱۹۶۹ء)

(۵۱) ازراہِ کرم کسی بھی صورت حواشی فوراً بھجوائیے نیز دیوان کے مسوّدے کی کاپی بھی۔ اگر ضرورت پڑی تو دیوان کے دیباچے میں اس کا ذکر کر دیا جائے گا کہ دیباچہ اور حواشی لکھوائے گئے ہیں فراہمیِ دیوان سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حواشی اور مقدمہ کا آنا یوں بھی ضروری ہے کہ آپ کا مضمون "نسخۂ امروہہ" "تلاشِ غالب" کے علاوہ اب نقوش میں شامل ہوگا اس لیے اُسے دیوان کے ساتھ شائع کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ (مکتوب ۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۹ء)

(۵۲) آج اکبر علی خاں کا خط میرے پاس آیا ہے ذیل میں اُسے نقل کرتا ہوں:

> "جی ہاں نو دریافت دیوانِ غالب "نسخۂ عرشی زادہ" کے نام سے چھپ گیا ہے مگر ابھی تک دہلی ہی میں پڑا ہے پریس میں۔ پریس کی ادائیگی بعض مجبوریوں سے رکی ہوئی ہے۔ دو تین جلدیں لایا تھا وہ تبصرہ وغیرہ پر تقسیم ہو گئیں۔
>
> آپ سے پہلے ہی کی مدّات کافی ہیں اُسے دور کر لوں تو آیندہ کسی کتاب کی فرمایش کروں۔ وہاں جن جن اخبارات میں اس کتاب کے چھپنے کی خبر آئی ہے مطلع کیجیے۔ انگریزی اردو دونوں اگر تراشے مل سکیں تو کیا کہنا۔ سنا ہے ایک دو اخباروں میں پروفیسر آلِ احمد سرور کا تعارف بھی اس کتاب کے بارے میں چھپا ہے ان کے نام بھی لکھیے اور ممکن ہو تو آیندہ تراشے بھی بھیجیے۔ یہ کتاب ڈی لکس ایڈیشن پر چھپی ہے اور -/۱۲۵ ایک سو پچیس روپے قیمت ہے آپ کو چند دن انتظار کرنا پڑے گا۔ یوں بھی صرف سو کاپیاں چھاپی گئی ہیں۔"

طفیل صاحب کو جو خط اکبر علی خاں صاحب نے لکھا تھا وہ میں نے پڑھا ہے اُس میں تو یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل گئی اور مجھے وہ لکھ رہے ہیں کہ پریس کی ادائیگی کی وجہ سے یہ کتاب رکی ہوئی ہے۔ دو تین جلدوں کا تبصرہ کے لیے بھیجا جانا قطعی غلط ہے۔ اکبر علی خاں تو کبھی کسی کو روپے دو روپے کی کتاب نہیں بھیج سکے ۱۲۵ روپے کی کتاب کیا بھیجی ہوگی ؟

میرا اندازہ ہے کہ یا تو ابھی یہ دیوان شائع ہی نہیں ہوا۔ یہ خبر اس لیے مشتہر کی گئی ہے کہ کوئی اور شخص شائع کر سکے مگر مخطوطہ تو اُن کی ملکیت نہیں ہے اور اگر وہ اُن کی ملکیت بھی ہوتا تو غالبؔ کے شعر پر اکبر علی خاں یا عرشی صاحب کا حق کیوں کر ہو گیا ؟ یہ سب لغو باتیں ہیں۔ حیرت ہے کہ توفیق صاحب کیسے شخص کے پھندے میں آئے ہیں۔ یہ تو اکبر علی خاں کا کرم ہے جو اُنھیں یہ یاد ہے کہ "آپ سے پہلے ہی کی مدّات کافی ہیں" مجھ ہی پر موقوف نہیں اِس ملک میں غالبؔ سے محبت کرنے والے ہر شخص کی جیب پر اکبر علی خاں کی نظر رہی ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ قیامت تک مجھے یہ دیوان نہیں بھیجیں گے۔

یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ یہاں کے رسائل اور اخبارات میں مضامین اور خبریں اس اشاعت کے بارے میں ہر روز شائع ہو رہی ہیں۔ واضح رہے کہ خبر اس دیوان کے شائع ہونے کی تو ضرور چھپی ہے لیکن اور کوئی چیز نہیں چھپی ہے۔"

(مکتوب ۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۹ء)

(۵۲) طفیل صاحب نے اب تک اطلاع نہیں دی ہے کہ انھیں مضمون "دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ" مل گیا یا نہیں۔ کیا آپ اپنا ایک فوٹوگراف اُن صاحب کے ساتھ نہ بھیج دیں گے جو عن قریب آئیں گے۔ غالبؔ کے دیوان کا مسوّدہ لائیں گے، حواشی لائیں گے... یہ تصویر اس لیے بھی ضروری ہے کہ ممکن ہے طفیل صاحب مضمون سے قبل تصویر شائع کریں ورنہ دیوان جب چھپے گا اُس میں تو لازماً شائع کراؤں گا۔ مضمون کی نقل آپ کے پاس ہو تو ضرور طفیل صاحب کو فوراً بھجوا دیجیے۔" (مکتوب ۳۱ر اکتوبر ۱۹۶۹ء)

(۵۴) یکم نومبر کو طفیل صاحب نے مجھے ٹیلیفون کیا اور حکم یہ کہ فوراً پہنچو ..... جو پہلی ٹرین ملی اُس سے میں لاہور چلا گیا اور چھ گھنٹے کے سفر کی تکان کافور ہو گئی۔ جب طفیل صاحب کو ہمہ تن منتظر پایا۔

بعد مغرب ہم دونوں جناب حکیم صاحب کے پاس سمن آباد پہنچے۔ حکیم صاحب عرشی صاحب کے ہم جماعت اور دوست ہیں اور اکبر صاحب نے اُنھی کے صاحبزادے ڈاکٹر صغیر کو یہاں کے لیے مختار کُل بنایا ہے۔ اُنھوں نے ایک رقعہ اکبر صاحب کا طفیل صاحب کو بھی دے دیا جو معلوم نہیں کیا تھا۔ بہر کیف میری نظر اُس خط پر تھی جو حکیم صاحب کو لکھا گیا ہے۔ شرائط یہ تھیں کہ مرتب کو پچیس فی صد رائلٹی ملے پچاس فی صد منافع ملے اور نسخہ کم از کم پانچ ہزار شائع ہو۔ میں بمشکل ہنسی ضبط کر سکا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بھوکا بھکاری ہو اور جیسے پلاؤ کی قاب مل گئی ہو جسے وہ ایک ساتھ نگل جانا چاہتا ہو۔ ہم دونوں وہاں سے چلے آئے البتہ اُنھیں یہ بتلا دیا کہ وہاں تو "اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں" والا معاملہ پیش آچکا ہے اور ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ مالک کون ہے؟ اس لیے حکیم صاحب کا اعلان بے معنی ہو گا۔

..... میں شب کو گیارہ بجے اس تمام کام کو دیکھ کر آیا جو اب تک ہو چکا ہے اور آپ کو ایک تار بھی دیا کہ ولید صاحب سے مضمون نہیں مل پاتا اس لیے فوراً مضمون بھیجیے ..... صبح کو پانچ بجے ولید صاحب کے گھر جا پہنچا۔ اُنھوں نے بہانے تو بہت کیے مگر میں کسی طرح آمادہ نہ ہوا اور نو بجے پریس جا کر مضمون لے آیا۔ اُس کے شروع کے دو صفحات نہ ملے، اِس کا غم نہیں کیا کیونکہ وہ چھپے ہوئے میرے پاس موجود تھے اور جو میں پہلے ہی طفیل صاحب کو دے چکا تھا۔ رات کو آپ کو دوسرا تار دیا کہ مضمون مل گیا ہے۔ ..... تلاشِ غالب تو مئی میں تیار ہو چکی تھی لیکن آپ نے پابند کر دیا تھا کہ جب تک آپ کا تار نہ ملے کتاب (Release) نہ کی جائے ..... مئی ۱۹۶۹ء میں اگر آپ نے اجازت دے دی ہوتی تو کتاب اب تک ختم ہو چکی ہوتی اور دوسرا ایڈیشن آتا۔" (۴ر نومبر ۱۹۶۹ء)

(۵۵) میں نے تو خود حالات کے پیشِ نظر آپ سے استدعا کی تھی کہ اس سلسلے

میں آپ کا نام نہیں آنا چاہیے اور آپ کا نام نہیں آئے گا۔ حصول کی بات کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر آیندہ کبھی ضرورت پڑی تو میں خود اس ذمہ داری کو قبول کر لوں گا۔ آپ کو اپنے احباب پر مکمّل اعتبار ہونا چاہیے۔ آپ کی کوئی تحریر، آپ کا کوئی کارڈ یا رقعہ تو بڑی بات ہے کوئی شخص اگر صرف وہ لفافہ بھی لینا چاہے جس پر آپ کے قلم سے پتا لکھا ہے تو وہ میری لاش پر سے گزر کر ہی اُسے حاصل کر سکتا ہے۔ امید کرنا چاہیے کہ طفیل صاحب بھی آپ کے جذبات کا پورا پورا خیال کریں گے..... کام اشاعت کا نہایت تیزی سے ہو رہا ہے۔ ۲۶ر نومبر ۱۹۶۹ء کو رسمِ اجرا ہو گی۔ ممکن ہے دو تین یوم قبل ہی ہو جائے۔ اصل میں جن صاحب کو اس اجتماع کی صدارت کے لیے منتخب کیا گیا ہے وہ غالب ہی کے خاندان سے ہیں۔ بہت بڑے آدمی ہیں، اُن کی مصروفیت کے پیشِ نظر ۲۴ر نومبر سے ۲۶ر نومبر تک کسی دن یہ رسمِ اجرا ہو سکے گی.....

اس نسخے کے سلسلے میں مکمل روداد آپ کے اس خط سے معلوم ہو گئی تھی جو طفیل صاحب نے پڑھنے کو دیا تھا لیکن ہم لوگوں نے دیدہ و دانستہ اس خبر کو کچھ وقت کے لیے التوا میں ڈال دیا ہے۔ ۲۶ر نومبر کے بعد وہ خبر بھی اخبارات کی زینت بنے گی۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اکبر صاحب دروغ گوئی میں باکمال انسان ہیں۔ حکیم صاحب کو لکھا کہ ایک نسخہ پریس سے لایا ہوں۔ مجھے تعداد تین لکھی اور طفیل صاحب کو لکھا کہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ قیمت مجھے ایک سو پچیس روپے بتلائی ہے، آپ کہتے ہیں کہ تین سو روپے ہے۔ عجیب معاملہ ہے۔ اگر وہ قیمت جو مجھے لکھی ہے وہ بھی صحیح ہو تب بھی اتنی مہنگی کتاب کون خرید سکتا ہے؟ اور اگر یہ حماقت بھی کی گئی ہے کہ دوسرے صفحہ پر غزلیات کی کتابت نہیں کرائی گئی تو خطِ شکست اس زمانے میں کتنے لوگ جانتے ہیں؟ ..... توفیق احمد نے آپ سے ایک معاہدہ کیا اور اُسے فسخ کر دیا ظاہر ہے کہ آپ کو نقصان پہنچایا۔ آپ کو واقعی انصاف کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے..... سہیل صاحب نے آمادگی ظاہر کر دی ہے کہ وہ دیوان چھاپیں گے اور اسی نہج پر..... (مکتوب ۶ر نومبر ۱۹۶۹ء)

(۵۶) آپ نے جو یہ لکھا کہ اس دیوان کو آپ کے نام سے کیوں نہ چھپوا دیا جائے؟

کہاں چھپوادیا جائے؟ یہاں یا وہاں؟ پہلی بات تو یہ کہ میں کسی کی محنت کو اپنی جھولی میں نہیں ڈال سکتا۔ دوسری بات یہ کہ ابھی آپ ایسا کیوں سوچیں؟ اگر حالات و معاملات کی نزاکت ایسی رہی کہ اسے میرے نام سے شائع ہونا چاہیے تو میں یہ ذمّہ داری قبول کرلوں گا لیکن ابھی ایسا سوچنا قبل از وقت ہے...... اچھا ہوا کہ اکبر صاحب سے آپ کی گفتگو ہوئی اور (توفیق) سے بھی۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ اس گفتگو کا ٹیپ رکارڈ کرلیا جاتا.... آپ نے اچھا کیا جو اِتمام حجّت بھی کردی۔ یہ تو درست ہے کہ آپ کو اس چیز کے استعمال کرنے کا حق حاصل ہے مگر جب تک قانونی صورت نہ ہو کیا ہوسکتا ہے...... یہ بات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے طے سمجھیے کہ آپ نے جو اعتماد مجھ پر کیا ہے اُس اعتماد کو زندگی کے آخری سانس تک ٹھیس نہیں پہنچے گی.....“ (مکتوب ۱۲؍ نومبر ۱۹۶۹ء)

(۵۷) جو الزام اور جس نوعیت کا الزام وہ (اکبر علی خاں) کسی شریف انسان پر عائد کرسکتے تھے وہ خود اب اُن پر عائد ہو رہا ہے۔ اُنھوں نے نسخۂ عرشی زادہ کے پروف طفیل صاحب کو بھیجے ہیں اور چاہتے ہیں یہ کہ اُن کی شرائط بتوسط حکیم نبی احمد خاں صاحب طے کرلیں یعنی وہ چاہتے ہیں کہ محض یہ پروف دے کر روپے بٹوریں مقدمہ بازی کریں اور توفیق احمد صاحب کو کچھ نہ دیں.....“ میں یہ سب باتیں طفیل صاحب سے کہہ تو سکتا ہوں مگر میرے اور اُن کے درمیان ابھی بے تکلفی کی وہ فضا پیدا نہیں ہوسکی ہے جہاں انسان ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر دوستی نبھانے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ آپ اُن سے کہہ سکتے ہیں..... انگریزی میں کہاوت ہے کہ محبّت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہوتی ہے۔ یہاں تو دونوں چیزیں یک جا ہیں۔ غالب سے محبّت بھی اور بد معاہدہ لوگوں سے جنگ بھی۔ پھر آپ کیوں ڈریں؟ یا یہ کہ وہ (توفیق احمد) کیوں ڈرے کہ جسے اتنی عقل نہیں ہے کہ معاہدہ کیا ہونا چاہیے تھا۔“ (مکتوب ۱۶؍ نومبر ۱۹۶۹ء)

(۵۸) آج اکبر علی خاں کا خط میرے نام بھی آیا ہے۔ جتنی باتیں میں نے پوچھی تھیں وہ تو گول کر گئے۔ لکھا ہے کہ:

”..... نسخۂ عرشی زادہ کے لیے آپ کا اشتیاق بجا ہے ادھر

LIBRARY
ARE-ADBIYAT-E-URDU
No. ۳۳۵۷۵

آپ سے شرمندہ ہوں کہ تا حال کوئی خاص فرمایش پوری نہیں
کر سکا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی قیمت سوا سو روپے رکھی جائے
اگرچہ یہ بھی بہت تھی مگر چونکہ   کے
طور پر بڑے اہتمام سے طباعت ہوئی اور لاگت اندازے
سے بہت زیادہ ہوگئی اس لیے اور بھی کہ مالک مخطوطہ سو کاپیوں
سے زیادہ طبع کرانے پر آمادہ نہیں ہوئے اس لیے تین سو روپے
فی کاپی قیمت قرار پائی اور اس کی لاٹ دہلی کے ایک
بک سیلر نے خرید لی اُن کا پتا یہ ہے :

پاپولر بکس ۹۹۲ بازار چتلی قبر دہلی-۶

معلوم ہوا کہ ہاتھوں ہاتھ نکل گئی اُن کے پاس سے۔ آپ کا اشتیاق
بہت ہے اس لیے پروف کا ایک ورق پڑا ہوا تھا میرے پاس
وہ ملفوف کرتا ہوں۔ زیرِ نظر لیٹر پیڈ کی زمین پر دیباچہ اور حواشی
چھاپ دیے ہیں۔" (مکتوب اکبر علی خاں)

..... میں رہ رہ کر ہاتھ ملتا اور پچھتاتا ہوں کہ مئی ۱۹۶۹ء میں جب کتاب کمپوز ہوگئی تھی تو اُسے اُسی وقت بازار میں آنا چاہیے تھا ..... بعض اوقات جی چاہا ہے کہ بغیر آپ سے اجازت لیے قدم اُٹھالوں مگر آپ سے ڈرتا ہوں۔ آپ کی تحریروں سے جو میں نے آپ کے مزاج کی کیفیت تلاش کی ہے وہ یہ کہ آپ یقیناً زود رنج ہوں گے اور میں کسی قیمت پر آبگینوں کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا ..... آپ کی کسی بات کو ٹالتے ہوئے یا حکم کے بغیر خود کوئی فیصلہ کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ خوف آیا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو یقین کیجیے یہ کتاب کب کی فروخت ہو چکی ہوتی اور آج جن مصائب کا سامنا ہے اُن سے ہم لوگ بچ جاتے ....."

(مکتوب ۱۷؍ نومبر ۱۹۶۹ء)

(۵۹) طفیل صاحب گفتگو میں بھی اور تحریر میں بھی بہت محتاط انسان ہیں میرا معاملہ دوسرا ہے میرا دوستی کے بارے میں خیال ہی دوسرا ہے، جب دوستی ہے تو پھر

تادمِ مرگ بہر قیمت اُسے نبھانا ہے اور اس نباہنے میں بڑے سے بڑا الزام بھی آتا ہے تو اُس کا غم بیکار ہے ..... (مکتوب ۲۰ نومبر)

(۶۰) ..... آپ جس قدر جلد ممکن ہو بھوپالی صاحب سے مضمون حاصل کیجیے کیونکہ طفیل بھائی کا تقاضا سخت ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ تحریر ایسی ہو کہ اُس میں سقم باقی نہ رہے مضمون سے طباعت واشاعت کے حقوق خواہ آپ کے نام ہوں یا کسی اور کے جو طفیل صاحب یا میرے نام منتقل ہو جائیں۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اگر اکبر صاحب یہاں کوئی گڑبڑ مچائیں تو ہم لوگ اپنا دفاع تو کر سکیں گے کیوں کہ یہ تو قطعی یقینی امر ہے کہ نقوش کی اشاعت کے بعد جو دھماکا ہو گا اُس کی گرج چمک سے سب سے زیادہ تکلیف تو اکبر علی خاں اینڈ کو کو ہی ہو گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ جلد از جلد مضمون ہاتھ آجائے۔ یہ بھی خیال رہے کہ اُنھیں یہ کُرید ہو گی کہ نقوش کا ذریعہ حصول کیا ہے؟ اب یہ ہمارا اخلاقی فریضہ بھی ہے کہ طفیل صاحب پر آنچ نہ آئے ..... (توفیق احمد) سے کہلو لیجیے کہ جو شخص، جو ادارہ اس مخطوطہ کو خریدے گا تو کیا اُسے وہ شہد لگا کر چاٹے گا؟ جب تک اس کو شائع کرنے کے حقوق نہ ہوں گے' اس لیے اس کا معاہدہ جب تک باقی ہے اُسے خریدے گا کون؟ ضروری ہوا کہ اس معاہدے کی تنسیخ ہو تا کہ ان کا مخطوطہ فروخت ہو سکے۔

طفیل صاحب نے بتلایا کہ نقوش تیار ہو چکا' جلد بندی ہو رہی ہے آج کل ژنانہ بیچارے رات کو بارہ بجے تک بیٹھے رہتے ہیں اور کام کی تکمیل کرا رہے ہیں۔ افسوس کہ آپ کا فوٹو دیر سے پہنچا ورنہ ضرور شامل ہوتا ..... مجھ سے یہاں اُن احباب نے جو دعوت پر جمع تھے (جب طفیل بھائی آئے تھے) پوچھا تو میں نے کہا کہ جس فوٹو گرافر نے فوٹو تیار کیا اُسے معقول معاوضہ نہ ملا اُس نے نگیٹیو رکھ لیا اور فروخت کرتا رہا۔ میرے بھی ایک عزیز کو معلوم تھا کہ مجھے کس قدر دلچسپی ہے اُنھوں نے فوٹو گرافر سے خرید کر بھیجا ہے۔ (۲۴ نومبر ۱۹۶۹ء)

(۶۱) اکبر صاحب نے OFF PRINTS کے ساتھ جو شرائط لکھی ہیں اُن پر کوئی

ذی ہوش انسان عمل نہیں کر سکتا۔ طفیل صاحب اگر اپنا مکان اور پریس سب ہی کچھ فروخت کر دیں تب بھی اکبر صاحب کے مطالبات پورے نہیں کر سکتے۔ طفیل صاحب نے میری معلومات کی حد تک اکبر صاحب کو جواب ہی نہیں دیا۔

اب جو آپ یہ لکھ رہے ہیں کہ میں طفیل بھائی کو مطمئن کر دوں تو صاحب میں انھیں کچھ نہیں لکھنا چاہتا۔ آپ کے ہر حکم کی تعمیل بسر و چشم کروں گا، مگر طفیل صاحب سے کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ اس سلسلے میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں براہِ راست اُنھیں کو لکھیے۔ مجھے اپنی کم عقلی اور حماقت کا پہلے بھی اعتراف تھا اب بھی ہے۔ اُنھوں نے جو کچھ گزشتہ خط میں مجھے لکھا ہے میرا دل دکھانے کے لیے وہی کافی تھا جو کثر (کذا) رہ گئی تھی وہ آج اُن کے پرچے کو دیکھ کر پوری ہو گئی۔ اُنھوں نے جو کچھ لکھا وہ میں نہ آپ کو بتلاؤں گا اور نہ آپ مجھ سے پوچھیں گے..... آپ نے تو اُن سے پرچے کی پچاس کاپیوں کے لیے لکھا لیکن میں اُن سے ایک بھی نسخہ نہیں لینا چاہتا.....

نقوش غالب نمبر ۲ حسنِ طباعت کا اعلیٰ نمونہ ہے، اُس کا گرد پوش اس قدر خوبصورت ہے کہ میں نے کسی کتاب کا اتنا عمدہ ڈسٹ کور نہیں دیکھا مجھے جس چیز سے دُکھ پہنچا ہے وہ یہ کہ سب سے پہلے تو اُنھوں نے آپ کے مضمون کا عنوان ہی بدل دیا اُس مضمون کا عنوان اب "بیاضِ غالب" ہے اور اس کی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے کہ یہ مضمون پہلے تلاشِ غالب میں چھپ چکا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں نے اُن سے بارہا درخواست کی تھی کہ ایک پورے صفحے پر صرف یہ الفاظ ہوں: "دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ"۔ اُنھوں نے لکھا ہے: "نو دریافت بیاضِ غالب بخطِ غالب" پھر انھوں نے اپنے "طلوع" میں لکھا ہے: "چونکہ یہ بیاض سب سے پہلے لاہور میں چھپی ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ اسے "نسخۂ لاہور" کے نام سے یاد کیا جائے۔ غالباً یہ آیندہ نسلوں کے لیے وصیت ہے۔"

اگر طفیل صاحب پہلے سے یہ سب باتیں بتلا دیتے تو دل نہ کڑھتا۔ انھوں نے تو مجھے یہ بھی کہا تھا کہ سوائے نسخۂ امروہہ کے وہ اس میں کچھ شامل نہیں کریں گے لیکن

آپ کے مضمون "بیاضِ غالب" کے علاوہ مندرجۂ ذیل مضامین اور ہیں..... سفید کاغذ نہایت عمدہ استعمال کیا گیا ہے۔ بیاضِ غالب کی زمین ہلکے سبز رنگ کی ہے حاشیے پر اُلٹی جانب دو رنگ میں خوشنما بیل ہے۔ قیمت اس کی تیس روپے ہے۔ صفحہ ۲۷۲ جو اس نمبر کا آخری صفحہ ہے اس پر آپ کی کتاب "تلاشِ غالب" کا اشتہار ہے۔ میں شاید دو چار دن میں طفیل بھائی کو خط مبارک باد کا لکھوں گا۔ خط تو آج ہی لکھتا لیکن کیا کروں دل بے حد اُداس ہے..... (یکم دسمبر ۱۹۶۹ء)

(۶۲) ..... میں آپ کو لکھ چکا ہوں کہ نقش دوم نقوش کا جو شائع ہوا ہے اس کی رسمِ اجرا پنڈی میں ہوئی۔ ۵ دسمبر کو لاہور میں بھی شاندار تقریب ہوئی۔ تمام اخبارات میں طفیل صاحب کا اور آپ کا نام آرہا ہے۔ نقوش غالب نمبر ۲ کی اشاعت سے عجیب قسم کا CONFUSION کا یہاں پھیلا ہوا ہے اور ساتھ ہی اخبارات میں یہ خبر بھی آئی ہے کہ آپ کے دیس میں ملکیت کا حق ثابت ہونے کے لیے مقدمہ دائر ہوا ہے اور یہ کہ ذریعۂ حصول ایک سربستہ راز ہے لیکن طفیل صاحب کی اس سے بڑی شہرت ہوئی ہے..... (مکتوب ۸ دسمبر ۱۹۶۹ء)

(۶۳) طفیل بھائی نے اگرچہ آپ کے مضمون کا عنوان بدل دیا ہے مگر مضمون میں تبدیلی نہیں کی۔ اگر انھوں نے "نسخۂ لاہور" اس کا نام تجویز کیا تو شاید اُس دوستی کی بنا پر جو آپ دونوں کے درمیان ہے لہٰذا اگر کوئی بات اس موضوع پر ہو سکتی ہے تو آپ دونوں حضرات ہی کسی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔ میں نے اُنھیں ایک نہایت طویل خط لکھا ہے اور اُنھیں یہ تسلّی دی ہے کہ شفیق صاحب کا مضمون بہر حال اُنھیں مل جائے گا، ذمہ داری میری ہے۔ چنانچہ اب آپ سے یہ درخواست ہے کہ بلا تاخیر اُس سے مضمون حاصل کیجیے اور کسی طرح بھیج دیجیے تاکہ طفیل بھائی کے تمام خدشات دور ہو جائیں.....

اکبر علی خاں کا ایک خط کل آیا ہے اس کا ایک طویل اقتباس یہ ہے:

"مالک مخطوطہ ایک جاہل محض ہے، اُسے یہ ڈر تھا کہ اگر زیادہ تعداد میں کتاب طبع ہو گی تو اس کی قیمت فروخت پر اثر پڑے گا۔ چونکہ میں اسے بہر صورت و بہر قیمت مرتّب اور شائع

کرنا چاہتا تھا اس لیے مالک کی ہر جائز و ناجائز بات ماننی پڑی اگر اس کتاب کی قیمت کم ہوتی یعنی سوا سو بھی ہوتی تو یقیناً اس کی مقبولیت اور بھی بڑھ جاتی۔ ادارۂ یادگار غالب نے اسے شائع کیا اور پاپولر پبلی کیشنز ۹۹۳ بازار چتلی قبر، دہلی نے خرید لیا۔ شاید (یقین سے نہیں کہہ سکتا) غالب اکیڈمی نظام الدین نئی دہلی کے پاس بھی برلائے فروخت کچھ جلدیں دو چار موجود ہیں۔ ایک صاحب نے وہیں سے خرید کر بھیجی ہے اپنے ایک دوست کو۔ ارادہ یہ ہے کہ اسے آپ کے دیس میں بھی طبع کرایا جائے وہاں انشاءاللہ ناشر سے درخواست کروں گا کہ قیمت کم رکھی جائے۔ اس ایڈیشن میں تو برابر ادارے کو نقصان رہا ہے صرف لاگت واپس آئی ہے اور وہ بھی کھینچ تان سے۔ آیندہ ایڈیشن کی نوبت اب مخطوطے کی فروخت کے بعد ہی آسکے گی۔

شروع میں ایک صاحب کے (ساتھ) چار جلدیں پروفیسر حمید احمد خاں، محمد طفیل صاحب اور مولانا مہر کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے سپرد کی تھیں مگر انھوں نے ابھی تک ان حضرات کو نہیں پہنچائیں۔ اُن صاحب کا وہاں کا پتا معلوم نہیں کہ تقاضا کروں۔ رسم اجرا کا ارادہ تھا پھر سوچا کہ سرگشتۂ خمارِ رسم و قیود ہونا کیا ضروری ہے۔ اس لیے اس خیال کو ترک کر دیا......" (اقتباس مکتوب اکبر علی خاں) (مکتوب ۴ دسمبر ۱۹۶۹ء)

(۶۴) آپ کا خیال درست ہے کہ میری اور اُن (محمد طفیل صاحب) کی ملاقات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ میں چونکہ نام و نمود کا قائل نہیں ہوں اور چھپنا چھپانا بھی کبھی پسند نہیں کیا اس لیے میرے اور اُن کے خیالات کا ٹکراؤ کبھی نہیں ہوا۔ لیکن میرا ماتھا اُس روز ٹھنکا تھا (یہ بات نومبر ۱۹۶۹ء کی ہے) جب آپ کی ہدایت کے بموجب میں نے

وہ خط جو آپ نے انھیں لکھا تھا اپنے پاس محفوظ کرنے کو طلب کیا اور اُنھوں نے نہیں دیا۔ گو ملائمت اور نرمی اُن کے لہجے میں تھی تاہم جب آپ کی واضح ہدایت موجود تھی کہ وہ خط میرے پاس رہے، میرے حوالے کیا جائے تو انھیں دے دینا چاہیے تھا۔ بہر کیف اب جس طرح بھی ہو اس سلسلے کو چلنے دیجیے۔ اِس وقت ایسا مرحلہ ہے کہ خاموشی ہی زیادہ مناسب ہے......

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چچا جان نے ۵ ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کی صبح کو مجھے عکس دیے تھے۔ میں ۷ ر اکتوبر کی شب کو واپس آیا اور جس وقت لاہور سے روانہ ہوا تو طفیل صاحب کے دفتر سے۔ میری اٹیچی میں عکس موجود تھے مگر میں نے اُن سے ذکر تک نہیں کیا صرف اس لیے کہ آپ کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ میں نے ۸ ر اکتوبر کو جو خط آپ کو لکھا اُس میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ نے امانت کو اُن کی معرفت کیوں بھیجا؟ اگر چچا جان اُن کو دے آتے اور وہ دیکھتے تو بدگمان ہوتے کہ آپ نے مجھے بھیجے براہِ راست اُنھیں کیوں نہ بھیجے؟ ۹ ر اکتوبر کو آپ کا خط ملا تھا اور آپ کا حکم تھا، آپ کی اجازت تھی کہ اُنھیں یہ امانت دے دوں، چنانچہ اُسی روز میں نے اُنھیں ٹیلیفون کیا اور وہ ۱۲ ر اکتوبر کو آئے اور امانت لے گئے۔ اِس میں شک نہیں کہ میری خواہش تھی کہ وہ شائع ہو لیکن میں نے اس وقت تک اُن سے ذکر نہیں کیا جب تک آپ کی اجازت نہ آگئی۔

میں جس چیز سے کبیدہ خاطر ہوا وہ اُن کی ۲۴ ر نومبر کی تحریر تھی۔ اس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ جب وہ اتنی طویل کتاب دے رہے ہیں جس کے صفحات دو ہزار ہیں تو اس لیے کہ اُنھیں جملہ پریشانیوں سے نجات ملے اور وہ اسے آیندہ بھی دھڑلے کے ساتھ شائع کر سکیں۔ اگر یہ بات پوری نہیں ہوتی ہے تو پھر مزید صفحات کو لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ صرف درازیِ زلفِ جاناں والی قسط ہی کافی ہے، مجھے یہ بھی ہدایت تھی کہ یہ باتیں آپ پر واضح کر دوں۔ ایک جملہ اور بڑھایا کہ پہلی قسط کتاب کی جس مقصد کے لیے دی ہے وہ بہر حال پورا ہونا چاہیے...... براہِ راست وہ اس لیے نہیں لکھ رہے تھے کہ آپ نے براہِ راست اُن سے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ آخر میں پھر ایک چرکا لگا

کہ آپ کو لکھوں کہ کتاب کا پہلا باب اسی لیے کہ معاملہ لٹکے اور مزید صفحات اس لیے دیں گے کہ اُنھیں حقوقِ اشاعت ملیں۔ اسی تحریر کا جب آخری جملہ پڑھا تو دل پر یوں لگا جیسے کسی نے منوں وزنی برف کی سل رکھ دی ہے: "آپ جس حد تک دل چسپی لے رہے ہیں وہ مرعوب کن ہے۔"

میری اس دل چسپی کا قصّہ بھی سُن لیجیے: میں اُنھیں مسلسل یہ لکھتا رہا تھا کہ صفحہ اوّل پر نمایاں طور پر درج ہونا چاہیے۔ "دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ" جتنی مرتبہ لکھا اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر میں نے لکھا کہ اس پر تحریر ہو کہ اس کے حقوقِ اشاعت محفوظ ہیں۔ اُنھوں نے ایک سطر لکھی تو ضرور ہے مگر وہ الفاظ نہیں لکھے جو میں چاہتا تھا۔ اُن کی ۲۴ نومبر کی تحریر سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے میں نے خود اُن سے یہ کتاب طلب کر لی تھی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے لکھا نہ میں نے کہا۔ اُنھوں نے خود ہی کہا تھا کہ وہ ایک طویل کتاب لکھ دیں گے۔ قسط اوّل کے لیے آپ کا حکم تھا سو اُن سے کہہ دیا تھا۔ پھر مجھے یہ بھی رنج تھا اور ہے کہ دوستوں میں ایسی معمولی باتوں کے لیے شرائط نہیں لگائی جاتی ہیں.... [1]

میں نے اُن کے تین خطوط کا جواب نہیں دیا۔ چوتھا خط جو ۳۰ نومبر کا لکھا ہوا تھا اس میں لکھا ہے: "کیا میری کسی بات سے ناراض ہو گئے؟ اگر یہ بات ہے تو پھر میں یہ کہوں گا "پہلے مجھے پڑھ لیجیے" جب تک یہ نہ ہو گا میرے خطوں کا مفہوم آپ کی سمجھ میں

---

[1] اس خط میں کچھ باتیں رمزیہ انداز میں کہی گئی ہیں اُن کی وضاحت ضروری ہے۔ طفیل صاحب چاہتے تھے کہ جس شخص نے نسخہ توفیق احمد کے ہاتھ گیارہ روپے میں فروخت کیا تھا اُسے دو ہزار روپے دے دیں بشرطیکہ وہ تحریر لکھ کر دے کہ اس نے نسخہ فروخت کرنے سے پہلے فلاں شخص کو عکس لینے اور چھاپنے کی اجازت دے دی تھی۔ دو ہزار صفحات کی کتاب سے مراد دو ہزار روپے ہیں۔ اس کی پہلی قسط پانچ سو روپے اُنھوں نے کسی مقصد سے بھیجی تھی جو پورا کیا گیا مگر اس کا سب سے زیادہ نقصان غریب توفیق احمد کو ہوا جس کے کئی ہزار روپے مقدمہ بازی میں خرچ ہوئے اور نتیجہ ڈھاک کے تین پات رہا۔

ہے..... اس میں تو شک نہیں کہ کام ہوا اور زود اثر ہوا مگر بھائی جب آپ ملیں گے تو باتیں ہوں گی کہ دل کس قدر خون کرنا پڑا ہے۔ میری طبیعت کچھ ضرورت سے زیادہ ہی حساس ہے۔ میرے سوچنے سمجھنے کی قوت ہی نہیں میرا سارا وجود صرف ایک نکتے پر مرکوز ہو جاتا ہے اور میں عضوِ معطل ہو جاتا ہوں۔ اس کیفیت سے گزشتہ مہینوں میں کئی بار گزرنا پڑا ہے۔" (مکتوب ۲۲ جنوری ۱۹۷۰ء)

(۷۰) میں نے طفیل صاحب کو ٹیلیفون کر کے معلوم کر لیا کہ انھیں توفیق صاحب کا خط مل گیا ہے لیکن اُن کا کہنا یہ ہے کہ اس سے کام کب چلے گا۔ اب اگر کوئی پبلشر اسے شائع کرے تو قانونی طور پر وہ اُسے کیوں کر روک سکتے ہیں؟ حکیم صاحب اس نقطہ (کذا) کو سمجھ گئے تھے کہ قانونی طور پر وہ کچھ نہیں کر سکتے لیکن اُنھوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا تمام بڑے ادیبوں سے اخلاقی اپیل کر رہے ہیں اور یہ اخلاقی دباؤ بہت سخت ہے۔ اب لوگوں کو تو اصل حالات کا علم نہیں ہے۔ اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ اس پر ایک کتاب شائع ہو تو لوگوں کو اصلیت کا علم ہو..... آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں نام و نمود سے گھبراتا ہوں۔ معین الرحمٰن صاحب نے اشاریۂ غالب میں میرا شکریہ ادا کیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اُن سے صرف ایک بار ملا ہوں اور غالب کے سلسلے میں اُن کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔ اب جو کتاب آئی اور میں نے نام دیکھا تو پریشان ہوا اُنھیں خط لکھا وہ شدید ناراض ہی ہو گئے ہیں اس لیے آپ اُنھیں لکھ دیجیے کہ میں ہر خدمت کو حاضر ہوں مگر ضروری نہیں کہ میرا نام بھی آئے۔ تلاشِ غالب پر میں نے لطیف عارف چھپوایا ہے آپ کی محبت اور خلوص کا پاس نہ ہوتا تو میں ہرگز اس کی اجازت نہ دیتا کیوں کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ ایک بار اور لاہور ہو آؤں۔ شیخ مبارک علی کے شیخ صاحبان سے میرے بھی مراسم ہیں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا..... اگر سہیل صاحب یا کوئی اور صاحب آمادہ ہو گئے تو طفیل صاحب کو تو اعتراض بہر کیف رہے گا۔ نقوش میں جس طرح دیوان شائع ہوا ہے اُس میں بہت سی اغلاط ہیں اگرچہ جن بقراط صاحب نے تصحیح فرمائی اُن کا فرمانا یہ تھا کہ آپ نے اس دیوان کے پڑھنے میں غچہ کھایا ہے..... یہ تو درست ہے کہ آپ اُن

نہ آئے گا....." (محمد طفیل)

دو دسمبر کو میں نے انھیں چار صفحات کا طویل خط لکھا اب وہ یہ لکھ رہے ہیں کہ میرا خط ہی اُنھیں نہیں ملا۔ حالانکہ یہ خط اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں بعض باتیں ایسی ہیں جو کسی اور کو نہ جاننی چاہییں..... آج بھی اُن کا خط آیا ہے لکھا ہے کہ اس نمبر کے بکنے کی رفتار مایوس کن ہے۔ اب کے اتنی وی پی واپس آئی ہیں کہ زندگی میں اور کسی نمبر کی نہیں آئی تھیں۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا ایک کتاب شائع ہوئی تھی "دبستانِ غالب"۔ اس کی قیمت پچیس روپے ہے اور وہ فروخت ہو رہی ہے لیکن نقوش کا غالب نمبر ۲ جس کی قیمت صرف تیس روپے ہے اور جس میں غالب کا مکمل دیوان خود اُس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہو، فروخت نہیں ہو رہا۔ کیا کہا جا سکتا ہے۔ نقوش غالب نمبر ۱ آپ دیکھ ہی چکے ہیں اس کی اوّل اشاعت ختم ہوگئی تھی اور اُسے دوبارہ شائع کرنا پڑا تھا۔ میں نے انھیں لکھ دیا ہے کہ وہ جس مضمون کے طلب گار ہیں وہ اُنھیں مل جائے گا اور اُس کا بہم پہنچانا میری ذمّہ داری ہے۔ اوّل تو اُنھیں ذریعۂ حصول کے بارے میں لب کشائی کی ضرورت ہی نہیں ہے لیکن بالفرض کوئی ایسی پریشانی لاحق ہو ہی جاتی ہے تو وہ میرا نام لے دیں..... جس طرح بن پڑے اُن کا مطلوبہ مضمون کسی کے ہمراہ بھیج دیجیے جب سب سے قیمتی متاع ہی سپرد کر دی تو اب اس ذرا سی چیز کے لیے کیوں کوئی الزام آئے! (مکتوب ۱۲؍ دسمبر ۱۹۶۹ء)

(۶۵) یہاں اخبارات میں نسخۂ امروہہ کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ایک بھی اخبار نے نسخۂ لاہور نہیں لکھا "نسخۂ امروہہ" ہی لکھا ہے اور ہر شخص آپ کو جاننا چاہتا ہے۔ مجھ سے بھی بعض لوگوں نے استفسار کیا مگر میں نے چُپ سادھ لی۔ (۱۹؍ دسمبر ۱۹۶۹ء)

(۶۶) سہیل صاحب لندن نہیں گئے، مگر وہ جس طرح پچھتائے ہیں وہ دیکھنے والی چیز تھی۔ میں نے اُن سے کہا کہ اُن کی تساہلی کا نتیجہ ہے کہ بازی کوئی اور مار لے گیا خیر اب سہی ــــ آپ بلا تامل حواشی لکھیے اور جو کچھ کام اُس کے متعلق ہو لکھ کر بھیج دیجیے وہ جب ملتے ہیں یہی کہتے ہیں کہ صاحب آپ زبانی جمع خرچ کرتے ہیں تحریر آپ کے پاس نہیں ہے، بات کیا طے کریں؟ آپ حواشی اور مقدمہ لکھ دیجیے اُن کی یہ شکایت

بھی دور ہو جائے گی لے۔ (مکتوب ۴ر جنوری ۱۹۷۰ء)

(۶۷) بھائی میرے اُن (اکبر علی خاں) کے مختار کار حکیم صاحب جو لاہور میں ہیں وہ سخت پریشان کر رہے ہیں۔ قانونی حیثیت اگرچہ کچھ نہیں ہے لیکن وہ اخلاقی دباؤ بہت سخت ڈال رہے ہیں۔ وقار عظیم صاحب وغیرہ کو درمیان میں ڈالا ہے۔ طفیل صاحب کے پاس جزوی و کلّی حقوق موجود ہیں یہی انھوں نے پرچے پر چھاپا ہے۔ حکیم صاحب یہ چاہتے ہیں کہ وہ حقوق سے دست بردار ہو جائیں۔ یہی نہیں بلکہ اکبر علی خاں کی روانہ کردہ تمام شرائط کو تسلیم کرلیں ..... (مکتوب ۱۶ر جنوری ۱۹۷۰ء)

(۶۸) سہیل صاحب بہت نفیس اور نازک مزاج انسان ہیں۔ وہ ان معنوں میں پبلشر نہیں ہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ کتابوں کی طباعت اُن کے لیے پیشہ نہیں شوق کا درجہ رکھتی ہے۔ کتابوں کی طباعت پر وہ اس لیے خرچ نہیں کرتے کہ کمائیں۔ انھیں اللہ نے بہت دے رکھا ہے۔ اُنھیں بے حد ملال ہے کہ جو کام اُن کی معرفت ہونا تھا وہ نہ ہو سکا۔" (مکتوب ۲۰ر جنوری ۱۹۷۰ء)

(۶۹) آج آپ کے خط سے جب معلوم ہوا کہ پرچہ مل گیا تو دل کو خوشی ہوئی بے اندازہ۔ اس میں شک نہیں کہ نقوش کا ایسا شمارہ کوئی اور نہ چھپا ہے اور نہ آیندہ امکان ہے اگرچہ کہ نقوش غالب نمبر ۲ کتابت شدہ پڑا ہے مگر مولوی مدن کی سی بات کہاں؟ آپ کا خیال درست ہے کہ عکس اور زیادہ صاف ہو سکتے تھے لیکن طفیل صاحب کو غالباً پریشانی یہ لاحق تھی کہ عرشی زادے چال نہ چل جائیں اور کوئی دوسرا بازی نہ لے جائے۔ متن میں جو غلطیاں ہوئی ہیں اُن کے بارے میں کبھی زبانی ہی عرض کروں گا لکھنا مناسب نہیں

لے ابتدا میں میرا اور لطیف صاحب کا یہی ارادہ تھا کہ اسے کسی اچھے ناشر سے کتابی صورت میں اعلیٰ پیمانے پر شائع کرایا جائے۔ لطیف صاحب نے اشاعت کے لیے سہیل افتخار صاحب کو آمادہ کرلیا تھا۔ محمد طفیل مرحوم سے میرے تعلقات کی نوعیت ایسی تھی کہ نسخہ اُن کے حوالے کرنے کے بعد میں نے یہ خیال دل سے نکال دیا تھا مگر لطیف صاحب نقوش میں چھپنے کے بعد بھی دوسرے ادارے سے اُس کی اشاعت کے لیے کوشاں رہے۔

(محمد طفیل) سے غافل نہیں ہیں لیکن اگر اُن کی حسبِ منشا کام نہ ہو تو وہ بے حد زود رنج ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ تو اُنھوں نے مجھے لکھا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے وہ مجھے حکیم صاحب کے پیدا کردہ حالات سے مطلع نہیں کریں گے۔ اور بات اتنی تھی کہ جو مضمون آپ اُنھیں بھجوا سکے وہ مضمون مجھ سے چاہتے تھے اور میں مضمون اُنھیں لکھ بھی دیتا۔ میں نے اُنھیں لکھا بھی کہ صاف صاف لکھیں کیا چاہتے ہیں لیکن وہ تو بے حد محتاط انسان ہیں ایسی بات کیوں لکھتے؟ ...... یہ آپ کو معلوم ہے کہ جب تک کوئی قانونی چیز موجود نہ ہو کسی پبلشر کو روکنا مشکل ہو گا۔ اب اگر اُنھیں یہ معلوم ہو بھی جائے کہ توفیق اور اکبر پُرانا معاہدہ منسوخ کر رہے ہیں تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ معاہدہ منسوخ ہو گا تب ہو گا۔ اُس وقت تک اکبر حکیم صاحب کے توسط سے روپیہ بٹور چلے ہوں گے ..... یہ درست ہے کہ غلام علی والے اسے چھاپیں گے تو یہ ناجائز ہو گا مگر ستا کون ہے؟ (مکتوب ۱۰ فروری ۱۹۷۰ء)

(۷۱) ..... غالب کی قسمت دیکھیے خبطیوں میں پھنس گیا۔ بھوپالی صاحب خبطی، (توفیق) اُن سے بھی نمبر لے گئے لیکن خیر۔ اب میں ایک اور وجہ سے پریشان ہوں۔ طفیل صاحب تو مجھ سے ناراض ہیں اب وہ مجھ سے نہ کچھ پوچھتے ہیں اور اس موضوع پر کیا خط کا جواب ہی نہیں دیتے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ اگر بھوپالی صاحب مضمون نہیں دیتے تو وہ ذمہ داری میری ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میں خود اُنھیں مضمون لکھ کر دینے کو تیار ہوں اور وہ چاہتے بھی یہی ہیں لیکن پریشانی یہ ہے کہ وہ یہ نہیں لکھتے کہ مضمون کی نوعیت کیا ہو؟ اور وہ خود اپنی تحریر میں اس قدر محتاط ہیں جیسے کہ میں اُن کے خطوط کا مجموعہ شائع کر دوں گا اور اُن پر کوئی الزام آجائے گا۔

حکیم صاحب تو قطعی سمجھ گئے ہیں کہ اُن کی دسترس میں کچھ نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اپنی کتاب کسی پبلشر سے شائع کرالیں لیکن ہمارے دوست کی ناراضگی کو دور کیسے کیا جائے؟ حکیم صاحب جس قدر اخلاقی دباؤ ڈال سکتے تھے وہ بھی ختم ہوا......

آپ سے ایک گزارش یہ ہے کہ اس کی تمام تر روداد لکھ ڈالیے۔ ابھی نہ سہی پانچ برس بعد سہی یہ کتاب چھپے گی تو لاجواب ہو گی۔ ڈی ایچ لارنس کی ناول "لیڈی چیٹرلیز لوَر"

شاید اتنی نہ فروخت ہوئی ہوگی جتنی "ٹرایل اوف لیڈی چیٹر لیز لور" فروخت ہوئی — یہ رودادِ غالب نہایت دلچسپ ہوگی اور آپ سے بہتر کون لکھے گا؟ (مکتوب ۱۵ر فروری ۱۹۷۰ء)

(۷۲) (توفیق احمد) کا خط طفیل کو مل گیا ہے۔ مجھے یہ اُنھوں نے استفسار پر ٹیلیفون پر بتلایا تھا لیکن مجھ سے تو وہ خفا ہیں خط ہی نہیں لکھتے۔ میں کئی خطوط لکھ چکا ہوں مگر وہ چپ ہیں میں اب اس سلسلے میں اُنھیں کچھ نہیں لکھوں گا۔ آپ بھی کچھ نہ لکھیے۔ AVOID کرنا ہی بہتر ہے ٹھیک ہے۔ میں شاید مارچ کے شروع میں لاہور جاؤں گا تو اُن سے باتیں ہوں گی آپ نے جو اُنھیں تفصیل سے خط لکھنے کا ارادہ کیا ہے تو ضرور لکھیے لیکن اس طرح کہ بارِ ودنہ لگ جائے وہ تو یوں بھی بہت نازک مزاج ہیں زود رنج ہیں، چپ سادھ لیتے ہیں اور ناراض ہو جاتے ہیں ...... اکبر علی خاں کا خط اُن کے پاس آیا ہے جو شکایات سے پُر ہے اور بہت سی باتیں پوچھی ہیں ...... (مکتوب ۲۴ر فروری ۷۰ء ۱۹)

(۷۳) آپ کا ۲۳ر فروری کا مکتوب آج ملا ہے۔ پہلا ہی فقرہ "آج کل بہت پریشان ہوں" میرے لیے پریشانی ہی کا نہیں بلکہ دُکھ کا باعث بنا۔ میں آپ سے اس قدر دور ہوں کہ آپ کی پریشانی میں ڈھارس بھی نہیں بندھا سکتا۔ اگر آپ پریشانی کا سبب بھی تحریر فرما دیتے تو احسان ہوتا ...... میں تو ایک بات اچھی طرح سمجھے ہوئے ہوں کہ بیچارے حکیم صاحب کچھ نہیں کر سکتے اگر وہ کچھ کرنے کی اہلیت رکھتے ہوتے تو اب تک کر چکے ہوتے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی گرفت جو پہلے بھی مضبوط نہ تھی بالکل ہی ڈھیلی پڑ چکی ہے، اب پریشانی یہ ہے کہ طفیل صاحب جس زاویے سے چیزوں کو دیکھتے ہیں اُن کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ ہر شخص اُسی زاویے سے اُن چیزوں کو دیکھے اور سمجھے اور اگر ذرا دوسرے شخص نے دوسرے زاویے سے دیکھا اور وہ چُپ سادھ لیتے ہیں اور اُس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ناراض ہیں۔ آپ کو یہ جان کر شاید حیرت ہوگی کہ میں نے اُنھیں یہ لکھا تھا کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں مجھے لکھ بھیجیں میں اُسے بعینہٖ اپنے قلم سے نقل کر کے روانہ کر دوں گا۔ چپ ہو گئے۔ خود وہ اِس قدر محتاط ہیں کہ اپنے قلم سے ایک لفظ نہیں لکھنا چاہتے مبادا کوئی پڑھ لے اور کہے کہ اچھا حقیقت یہ ہے حالاں کہ اُنھیں سوچنا چاہیے کہ

دوستوں کے درمیان اس قدر احتیاط بد گمانی کا باعث ہو سکتی ہے..... مثلاً اُنھوں نے مجھے ایک بار لکھا کہ حکیم صاحب سخت اخلاقی دباؤ ڈال رہے ہیں تو اُنھوں نے حکیم صاحب سے کہہ دیا کہ صاحب آٹھ ہزار اوراق کی کتاب دے چکا ہوں"۔ اور مجھے وہ عبارت نہ لکھی جو میں نقل کر دیتا۔ میں نے اُنھیں لکھا بھی کہ آپ نمونہ بنا کر بھیجیے باقی میں کام کر دوں گا مگر احتیاط نے اُنھیں باز رکھا اور اب تو خط ہی نہیں آتا۔

..... طفیل صاحب کا خیال صحیح تھا کہ عبدالرشید جاہل ہے اور گڑ بڑ کر دے گا۔ اُن کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ البتہ ایک بات میں قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب ۲۹ حضرات کے لیے اُنھوں نے پرچے بھجوائے تو اس کا انتظام بھی کیا ہو گا کہ اِس طرف اُسے کوئی تنگ نہ کرے۔ اور یہ بات سمجھ ہی میں نہیں آتی کہ اُس طرف حرکت کسی نے کی ہو گی۔ آپ اُس سے سختی سے معلوم کیجیے۔ اگر وہاں کوئی حرکت ہوئی ہے تو آپ خود اس معاملے کو ختم نہ سمجھتے ہوئے صحیح حالات معلوم کریں اور اگر اِدھر کوئی بات ہوئی ہے تو دیکھیے حلق سے نکلوا لیا جائے گا۔ انتخاب غالب صرف پچاس پیسے کی کتاب ہے اور ظاہر ہے وہ یرغمال نہیں ہو سکتی اسی طرح" ہمدرد صحت" "گلفشاں" غالب نمبر قیمتی چیزیں نہیں ہیں کہ یرغمال کرنے والا اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکے..... یہ جو ۲۹ حضرات کی فہرست آپ کو ملی بھائی یہ جو بٹن بٹ رہا ہے وہ کس خوشی میں؟ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ بٹن بٹتے دیکھا تھا اور حیران تھا۔ اب ایک جانب تو مالی بحران اور پھر یہ سخاوت۔ قابلِ داد بات ہے۔ آپ نے بھی ایک خط میں اُنھیں آف پرنٹ اور پچاس نسخوں کے لیے لکھا تھا۔ بہتر ہوتا وہ یہ انتظام بھی کر دیتے.....

طفیل صاحب ہی نے مجھے یہ مژدہ سنایا تھا کہ "تلاشِ غالب" کی مانگ بہت زبردست ہے۔ اُن کی اطلاع کے مطابق کتاب کی جلد بندی ہو رہی تھی مجھے ذاتی طور پر کچھ علم نہیں.....

میرے خیال میں مبارک علی کو توفیق سے خط نہیں لکھوانا چاہیے تھا۔ ہمارے دوست کے ہاتھ اتنے کمزور نہیں کہ دوسرا شخص ڈاکا ڈال دیتا۔ لیکن اس خط سے اگر شیخ مبارک علی کے صاحبزادے (مبارک صاحب کا انتقال ہو چکا ہے) ضرور یہ سمجھیں گے کہ یہاں کسی کے پاس حقوق نہیں ہیں۔ واضح رہے کہ ہمارے دوست نے مجھ سے یہی کہا ہے کہ ہم لوگ جس

طرح چاہیں اور جس سے چاہیں طباعت کا معاملہ کریں لیکن کسی اور کے ہاتھ میں یہ معاملہ نہ جانا چاہیے۔ یہ انھیں معلوم ہے کہ میں سہیل صاحب سے اس کی طباعت کے سلسلے میں گفتگو کر تا رہا ہوں ..... جن بقراطنے مسودہ میں تبدیلی کی اُن کا نام میں معلوم کر کے لکھ دوں گا۔" (مکتوب ۲ر مارچ ۷۰ ۱۹ء)

(۷۴) عبدالرشید نے جو لغو حرکت کی ہے اُس سے بہت افسوس ہوا۔ کوشش کیجیے کہ وہ صحیح بات بتلا دے۔ میں یقین کے ساتھ ایک بات کہہ سکتا ہوں کہ جب طفیل صاحب نے اتنے حضرات کے لیے پرچے بھجوائے تھے تو انھوں نے اس کا انتظام بھی کیا ہوگا۔ ایسے غیر ذمہ دار شخص سے آیندہ اجتناب ہی بہتر ہے۔

طفیل صاحب نے بالکل چپ سادھ لی ہے۔ میں حیران ہوں کہ میرا قصور بتلائے بغیر وہ ناراض ہو گئے ہیں۔ شاید آپ کو خط لکھا ہو۔ میرا لاہور جانا بوجوہ ٹل رہا ہے لیکن جاؤں گا ضرور۔ سو چتا ہوں اگر انھوں نے ملنے ہی سے انکار کر دیا تو ؟ (۷ر مارچ ۷۰ ۱۹ء)

(۷۵) تلاشِ غالب کی (Demand) حد سے زیادہ ہے مگر افسوس کہ ولید میر کی نالائقی کی وجہ سے شاید کتاب اب تک مارکیٹ میں نہیں آئی۔ میں ایسا انتظام کر رہا ہوں کہ حتی الامکان اُس کے تمام واجبات ادا کر دوں ..... عبدالرشید نے سخت زیادتی کی ہے۔ واقعہ کے سخت ہونے میں کیا کلام ہے لیکن ضروری ہے کہ اس کی تحقیقات ہو۔ "راوی" کا غالب نمبر تو میں اور بھیج دوں گا آپ کے لیے بھی اور دسنوی صاحب کے لیے بھی لیکن باقی کتابوں کا تو افسوس ہے ہی۔

..... دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ کی روداد حد درجہ دل چسپ کتاب ہوگی۔ آپ یادداشت مرتّب کرتے رہیے۔ جب یہ بادل چھٹ جائیں گے تو یہ دھماکا بھی زور دار ہوگا....

(مکتوب ۱۲ر مارچ ۷۰ ۱۹ء)

(۷۶) آج میں نے اکبر علی خاں صاحب کو جواب لکھا ہے اپنے خط سے کچھ اقتباسات درج کرتا ہوں :

"آپ نے دریافت فرمایا تھا کہ مئی ۱۹۶۹ء میں نو دریافت کلام

کہاں شائع ہوا؟ نثار صاحب کی کتاب مئی ۱۹۶۹ء میں چھپ چکی تھی بلکہ یوں کہیے کہ اپریل میں چھپ گئی تھی کہ اُن کا آخری مضمون "دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ" اس میں شامل کرنے کے لیے آیا اس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور یہ کتاب میں مئی ۱۹۶۹ء میں ہی لے آیا تھا میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ ہاں مارکیٹ میں نہ ملتی ہو تو اس کی اور بھی وجوہ ہو سکتی ہیں۔

اس کے بعد اگست ۱۹۶۹ء میں نقوش شمارہ ۲۱۲ (کذا) شائع ہوا تھا اس میں جلال الدین صاحب کا مضمون "قدیم ترین نسخۂ دیوانِ غالب کی دریافت" یہ مضمون نقوش کے صفحہ ۲۵ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۹ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس مضمون میں تقریباً تمام نودریافت کلام موجود ہے۔ مجھے یاد نہیں آرہا اسی زمانے میں میں کراچی گیا تھا غالباً افکار میں بھی ایک مضمون میں نے پڑھا تھا۔ لہذا یہ بات کہ نودریافت کلام لوگوں نے نہیں پڑھا تھا غلط معلوم ہوتی ہے۔ آپ کے نسخے کے چھپنے سے قبل ہی تمام نودریافت کلام سامنے آچکا تھا۔ آپ نے یہ تحریر فرمایا کہ آپ نے نسخۂ عرشی زادہ کو ستمبر میں (شائع ؟) کیا لیکن یہاں مئی ۱۹۶۹ء میں تلاشِ غالب اور پھر اگست ۶۹ء میں جلال الدین صاحب کا مضمون شائع ہو چکا تھا۔ آپ پسند فرمائیں تو یہ کتاب اور نقوش کا یہ نمبر آپ کو بھیج دوں؟ آپ خود ملاحظہ فرما لیجیے۔

آپ کا خط پڑھ کر مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ نے تلاشِ غالب کی تلاش میں کسی صاحب کو بھیجا وہ اسے تلاش نہ کر سکے اور آپ کو یہ لکھ دیا کہ وہ ابھی چھپی ہی نہیں۔ چلیے یہ بھی تسلیم، لیکن نقوش کا شمارہ ۱۱۲ تو اُن صاحب کو مل سکتا ہے ذرا اُن صاحب سے

کہیے کہ اس نمبر کو تو آپ کو بھیج دیں۔

مالک مخطوطہ کے بارے میں جو رائے آپ نے ظاہر کی ہے وہ صحیح ہی ہوگی کیوں کہ اوّل تو اُس نے جلال الدین صاحب کو پھر نثار صاحب کو دیوان نقل کرنے کی اجازت دے دی۔ یہاں اخبارات سے مقدمہ کی صحیح صورتِ حال سامنے نہیں آتی بس اتنا معلوم ہوسکتا ہے کہ مقدمہ چل رہا ہے۔ اب یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اس میں ملوّث نہیں ہیں، ظاہر ہے کہ شرفاء کا یہ کام نہیں ہے۔ لیکن ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے امید کرتا ہوں کہ آپ اس پر روشنی ڈالیں گے۔ ایک جانب تو آپ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ "میرا اُس سے کوئی مقدمہ نہیں" دوسری جانب آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ نقوش میں دیوان بغیر میری اجازت کے چھاپ ڈالا۔ اگر بھوپال والے صاحب اور موجودہ مالک مخطوطہ اس کی ملکیت کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ اصل مالک مخطوطہ کون ہے۔ اور جب یہ طے نہیں ہوسکا تو آپ کی اجازت کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟ کیا آپ نے مخطوطہ خرید فرما لیا ہے؟ یہ باتیں آپ کے خط سے واضح نہیں، از راہِ کرم اس پر ضرور روشنی ڈالیے کہ وہ کون سی وجوہ ہیں کہ جن کی بنا پر جلال الدّین صاحب کو یا طفیل صاحب کو آپ سے اجازت لینی ضروری تھی"۔

طفیل صاحب نے قطعی خاموشی اختیار کرلی ہے مگر میں ایک اور وجہ سے پریشان ہوں۔ وقار عظیم صاحب، ۷ مارچ کو یہاں تشریف لائے تھے تو اُنھوں نے دورانِ گفتگو مجھ سے دریافت فرمایا تھا کہ "کیا آپ طفیل صاحب کے ہمراہ حکیم صاحب کے ہاں گئے تھے؟" میں نے عرض کیا جی ہاں، ایک بار گیا ہوں۔ اکبر علی خاں نے لکھا ہے کہ "طفیل صاحب نے یہ بھی مشہور کیا ہے کہ اُنھوں نے عکس ملتان کے کسی صاحب سے خریدے تھے۔ خود طفیل صاحب

نے مجھے یہی لکھا تھا کہ اُنھوں نے آٹھ ہزار قیمت دے کر خریدے ہیں"۔ اب یہ سراسر زیادتی ہے۔ وقار صاحب ہی کو سب سے زیادہ حکیم صاحب نے استعمال کیا کہ وہ اخلاقی دباؤ ڈالیں اور بقول وقار صاحب طفیل صاحب نے نہایت معقول جواب دے کر حکیم صاحب کو لاجواب کر دیا کہ صاحب مقدمہ کا فیصلہ تو ہو جائے اگر اکبر علی خاں کے حق میں ہوا تو جو حکیم صاحب کہیں گے نذر کر دیا جائے گا۔ اس پر حکیم صاحب راضی ہو گئے۔ لیکن ذرا غور کیجیے وقار صاحب نے میرے بارے میں کیا سوچا ہو گا۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی تھی لیکن طفیل صاحب کی اس گفتگو سے کہ جس میں خرید و فروخت کا ذکر ہے، مجھ پر بڑا حرف آتا ہے۔ بھائی میں تو غریب آدمی ہوں میں اس کا اہل نہیں ہوں کہ مجھے درمیان میں گھسیٹ لیا جائے۔ میں نے طفیل صاحب کو اُسی روز خط لکھا تھا مگر وہ تو چپ ہیں!

(مکتوب ۷ ارمارچ ۱۹۷۰ء)

(۷۷) میں ۴ جولائی کو راولپنڈی گیا ایک روز کے لیے مری۔ واپسی میں چار یوم تک لاہور میں طفیل بھائی کے ہاں قیام کیا۔ طفیل صاحب کا حکم تھا کہ خواجہ محمد حسن صاحب سے "گلِ رعنا" میں خود حاصل کروں۔ دو روز ضائع کیے مگر خواجہ صاحب قابو میں نہ آئے۔ ان کا خیال ہے کہ غالب کی اس تحریر کی قیمت کم از کم پچیس ہزار روپے تو ملے۔ اب وہ ان کے داماد کے قبضے میں ہے اور اُن کا ارادہ یہ ہے کہ برٹش میوزیم لندن یا امریکہ کی کسی نوادرات خریدنے والی فرم کے ہاتھ اُسے فروخت کریں گے.....

طفیل صاحب کا خط آیا ہے کہ آپ کا لکھا ہوا کوئی کارڈ تلاش کروں جس سے یہ ثابت ہو کہ نسخۂ امروہہ سے متعلق آپ کا مضمون جو "تلاشِ غالب" میں چھپا ہے اور جسے بعد میں طفیل صاحب نے نقوش غالب نمبر۲ میں شامل کیا ہے اپریل ۶۸ء (کذا) میں لکھا گیا۔ آپ کا یہ مضمون اپریل کے اواخر میں ولید میر کے پاس لاہور پہنچا تھا۔ خطوط تو آپ نے اس زمانے میں مجھے کئی لکھے لیکن خدا کرے کوئی کارڈ مل جائے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ ڈاکٹر گیان چند کا ایک مضمون نقوش غالب نمبر۲ میں شائع ہو گا۔ دوسرے مباحث کے علاوہ وہ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ تصریحات اکبر علی خاں نے پہلے لکھی ہیں اور آپ نے

وہاں سے نقل کی ہیں جو بعد میں نقوشِ غالب نمبر ۲ میں شامل کی گئیں۔ حالانکہ ڈاکٹر گیان چند کا یہ خیال قطعی غلط ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے مضمون لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ آپ کا مضمون اور نقوش پہلے چھپے ہیں ..... زادہ کا نسخہ بعد میں۔ مالک رام صاحب کے دو خط طفیل صاحب کے نام ایسے ہیں جو اس بات کا بیّن ثبوت ہیں، وہ خطوط بھی اشاعت میں شامل ہوں گے۔ اب طفیل صاحب جو کارڈ مجھ سے تلاش کرا رہے ہیں وہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے خدا کرے ایسا کارڈ مل جائے۔

"درماندہ محقق" نے "گل رعنا" کا وہ نسخہ ایڈٹ کیا ہے جو مشفق خواجہ کو وصی احمد بلگرامی نے دیا۔ طویل مقدمہ میں وہی پُرانی رٹ کہ نو دریافت کلام کا فلاں حصّہ میں نے دریافت کیا ہے وغیرہ۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ مشفق خواجہ صاحب کو اور کوئی شخص نہ ملا جو ایڈٹ کرتا۔

..... توفیق صاحب کے مقدّمہ کا کیا بنا؟ اکبر علی خاں صاحب نے جس طرح مخطوطہ غائب کر دیا ہے کیا توفیق نے اُسے خاموشی سے گوارا کر لیا؟ سو کی جگہ ہزار نسخے چھاپے تھے اس کا ثبوت پریس سے مل سکتا تھا کیا اس پر بھی وہ خاموش ہے؟ .....

(مکتوب ۱۹ جولائی ۱۹۷۱ء)

(۴)

آخر میں مجھے محترم جناب لطیف الزماں خاں صاحب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ اُن کی تحریک سے "دیوانِ غالب بخطِّ غالب نسخۂ امروہہ" کی وہ داستان جو نقش ونگار طاقِ نسیاں بن چکی تھی پھر مرتب ہو کر سامنے آگئی۔ میں تو مدت سے دوسرے کوچوں میں بھٹک رہا تھا، اگر لطیف صاحب آمادہ نہ کرتے تو شاید یہ افسانہ نانوشتہ ہی رہ جاتا۔ لطیف صاحب کا اس لیے بھی ممنون ہوں کہ اُن کی اپنی ہی تحریروں سے بہت سی باتیں روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئیں اور جو الزام اُنھوں نے میری کردار کشی کے لیے تراشے تھے وہ خود اُن کے ہی بیانات سے غلط ثابت ہو گئے۔ پھر بھی چند نکتے رہ گئے اگرچہ اب از روئے منطق اُن کی صحت وصداقت کا بھی کوئی اعتبار نہیں رہا پھر بھی مختصراً

عرض کردوں :

(۱) لطیف الزماں صاحب کا محمد طفیل مرحوم سے تعارف میں نے کرایا تھا اور یہ پہلی بار اُن سے ۲۶ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کو ملے تھے تعلقات میں کسی قدر استواری بہت بعد میں پیدا ہوئی۔ محمد طفیل مرحوم اُن کے رویّے سے ناخوش بھی رہے اور مجھ سے دبے الفاظ میں کئی بار شکایت بھی کی۔ میں دیوانِ غالب چھپ جانے کے بعد اس سارے قضیے کو قطعاً بھول چکا تھا۔ دنیا میں اور بھی ہزاروں کام ہیں ہزاروں غم ہیں ایک بیاض کے پیچھے۔ خواہ وہ غالب ہی کی کیوں نہ ہو۔ ساری زندگی تو نہیں بتائی جاسکتی۔ وہ مجھ سے بعض تفصیلات پوچھا کرتے تھے تو بھی یاد نہ آتا تھا کہ کیا ہوا کیونکر ہوا؟ اب لطیف صاحب نے ٹھوکے دے کر حافظے کو بیدار کیا اور سارا سرو سامان بھی خود ہی فراہم کر دیا۔

(۲) لطیف صاحب کا یہ فرمانا کہ اُن کے اور بیگم طفیل کے سامنے محمد طفیل مرحوم نے مجھے پانچ ہزار روپے بطور معاوضہ، چھ ہزار روپے برائے توفیق احمد اور آٹھ ہزار روپے برائے مالک رام صاحب (کُل اُنیس ہزار روپے) دیے تھے، ایسا جھوٹ ہے جو وہی شخص بول سکتا ہے جو خدا کے وجود اور آخرت کے حساب کتاب کو ایک ڈھکوسلا سمجھتا ہو۔ اُنھوں نے اپنے عالم خیال میں ایک محفل سجائی اور اُس میں بھابی صاحبہ کو بھی شریک کر لیا۔ مادی دنیا میں اور خارجی وجود میں تو کبھی طفیل صاحب نے اتنی بڑی رقم مجھے دی نہیں۔ اُس وقت (۱۹۷۰ء) کے ۱۹ (اُنیس) ہزار روپے آج کل کے ڈیڑھ لاکھ روپے کے برابر تھے اگر یہ رقم میرے ہاتھ لگتی تو ایسی فقیرانہ شان سے کیوں رہتا جیسے اب زندہ ہوں۔ مالک رام صاحب کو اب بیس سال بعد اس پر یقین کرنے کے لیے آمادہ کر رہے ہیں مگر اُنھوں نے کبھی مجھ سے یا کسی دوسرے شخص سے کنایۃً بھی اس امانت کے نہ ملنے کی شکایت نہیں کی جب کہ یہ روپیہ دینے کے بعد محمد طفیل مرحوم ۱۵-۱۶ سال تک زندہ رہے اور میں نے تین بار لاہور کا سفر بھی کر لیا۔ ایسا جھوٹ بولنے سے کیا حاصل جو چلنا تو کجا رینگ بھی نہ سکے۔ لطیف صاحب کو شاید میرے اور محمد طفیل مرحوم کے تعلقات کی نوعیت بھی معلوم نہیں میرے دل میں اُن کی طرف سے اگر کوئی رنجش پیدا ہوئی تو صرف لطیف صاحب کی وجہ سے۔

اور میں اُن سے کہتا تھا کہ اِنھیں سمجھاتے کیوں نہیں ؟

(۳) لطیف صاحب نے لکھا ہے کہ میں نے نقوش کے تین سو نسخے تین سو روپیہ فی نسخہ کے حساب سے ہندوستان میں بیچ لیے جو ۹۰ ہزار کے ہوئے (یعنی آج کے ۷۔۸ لاکھ روپے)۔ اگر اکبر علی خاں صاحب اور لطیف صاحب کے تخمینوں کو باور کر لیا جائے تو اِس وقت مجھے کروڑ پتی ہونا چاہیے جس کی بھاری جایداد ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں موجود ہو۔ میں لطیف صاحب کے تمام مصارف برداشت کرنے کو آمادہ ہوں وہ ہندوستان آئیں اور جس طرح چاہیں میرے احوال اور اَموال کی تحقیق و تفتیش کر لیں۔ اگر میں ۱۹۷۰ء سے اب تک ہر زمانے میں مقروض پایا جاؤں تو جتنا قرض ہو وہ ادا کر دیں اور جو وہ کہتے ہیں وہ دولت میرے پاس ثابت ہو جائے تو سب اُن کی ملکیت ہو گی۔

(۴) لطیف صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے رسول نمبر کے لیے محمد طفیل مرحوم سے دس ہزار روپے طلب کیے تھے' اس سے وہ مرحوم اتنے آزردہ ہوئے کہ پھر مجھ سے بات بھی نہ کی۔ اگر بالفرض طلب بھی کیے ہوں تو اس میں عیب کیا ہے؟ آپ مہتر کو، سقے کو، موچی کو، قلی کو بھی مزدوری دیے بغیر کام نہیں لے سکتے، ایک اہلِ قلم اگر اپنی محنت کا معاوضہ طلب کرے تو یہ باعثِ ننگ و عار کیوں ہو؟ واقعہ یہ ہے کہ میرے بیشتر مضامین "نقوش" میں چھپے ہیں اور میں نے کبھی مضمون کے معاوضے کے نام پر مرحوم سے ایک پیسا بھی نہیں لیا۔ حساب دوستاں در دل والا معاملہ تھا۔ لطیف صاحب کو وہ عکس کا معاوضہ دس ہزار روپے پیش کر رہے تھے تو کیا یہ رقم اُن سے میں نہیں مانگ سکتا تھا؟ رسول نمبر میں میری تین کتابیں اور دو مضامین شامل ہیں۔

(۵) لطیف صاحب ایک طویل فہرس درج کر کے فرماتے ہیں کہ میں نے ان حضرات سے عکس فراہم کرنے کا تذکرہ نہیں کیا۔ میں ایسا کم ظرف اور چھچھورا نہیں ہوں کہ جو بھی ملتا اُس سے لازماً اس کا تذکرہ کرتا۔ یہ معاملہ میرے اور طفیل صاحب کے درمیان تھا' دنیا کو گواہ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟

میرے لیے یہ بہت ہی ناگوار اور بوجھل کام تھا کہ لطیف صاحب کی مخالفت یا

تردید میں قلم اُٹھاؤں۔ مجھے سید انیس شاہ جیلانی صاحب نے مجبور کیا اور خود لطیف صاحب میری مدد کے لیے اُٹھے۔

آخر میں قارئین سے دو گزارشیں ہیں: میرے سامنے بہت سے کام ہیں جو ہنوز ادھورے پڑے ہیں اور رخشِ عمر اپنی رَو میں ہے اس لیے آیندہ اگر لطیف صاحب کوئی اُشقلا چھوڑیں تو مجھے جواب دینے کے لیے مکلّف نہ سمجھا جائے۔

دوسری التجا یہ ہے کہ آیندہ جو حضرات دیوانِ غالب کے اس قضیے پر قلم اٹھائیں وہ میرے کرم فرما لطیف الزماں صاحب کو کسی نامناسب لفظ سے یاد نہ کریں۔ یہ مجھ پر کرم ہوگا۔

کچھ غالب کے بارے میں

مجھے دیوانِ غالب اردو کا ایک مطبوعہ نسخہ ملا، جو دسمبر ۱۸۸۳ء (مطابق صفر ۱۳۰۱ھ) میں منشی نول کشور کے مطبع سے چھپا تھا۔ یہ صفحہ ۱۰۳ پر تمام ہو جاتا ہے۔ اس میں کسی شخص نے یہ اہتمام کیا ہے کہ غالب کے جو اشعار متداول دیوان میں نہیں ہیں، وہ حاشیے پر نقل کر دیے ہیں۔ مگر کہاں سے نقل کیے، اس کا حوالہ نہیں دیا۔ مثلاً آخر میں سادہ صفحے پر وہ قصیدہ نقل ہوا ہے، جو غالب نے شیونارائن آرام کو لکھ کر بھیجا تھا:

ملاذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ
جنابِ عالی ایلن برون والاجاہ

اس کے آخر میں لکھا ہے: "اصل قصیدہ تصنیفِ غالب است از نارم شیونارائن" اولاد حسن ۲۳ مارچ ۱۸۸۶ء" لیکن ظاہر ہے کہ یہ اردوے معلّیٰ سے نقل ہوا ہوگا۔

اسی طرح کچھ اور غزلیں اور اشعار ہیں، جو اب دیوانِ غالب نسخہ عرشی میں آگئے ہیں اس لیے اُن کا تذکرہ یا تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ لیکن صفحہ ۱۰۰ پر ایک غزل نقل ہوئی ہے جس میں چھ شعر ہیں۔ اس کا پانچواں شعر آب زدگی کے باعث پڑھا نہیں جاتا۔ بعض اور لفظ بھی مغشوش ہیں۔ چونکہ ناقل نے حواشی میں غالب کا کلام نقل کرنے کا التزام کیا ہے اس لیے یہ غزل بھی (جس کے مقطع میں تخلّص اسد آیا ہے) اُس نے غالب ہی کی

سمجھ کر نقل کی ہے۔ یہ نسخۂ عرشی میں بھی نہیں ہے۔ قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ غالب کی زائیدۂ فکر ہے، تاوقتیکہ قدیم تر سند نہ ملے۔

رفوئے زخم میں حارج ہوا گھلنا مرے تن کا
سمجھتا ہے مجھے جرّاح آنسو چشمِ سوزن کا

پہنچتے ہی مرے غل ہو شکستِ رنگِ دشمن کا
بنا دے گردشِ قسمت مجھے گولا فلاخن کا

وہ میکش ہوں کہ اک مینائے بادہ ہے مرا قامت
شبیہِ موج مے ہے جو شکن ہے میرے دامن کا

دیا ہوگا ترے خنجر کو میری ناتوانی نے
کہ ہر تار گریباں پر گماں ہے میری گردن کا

کھٹک جائے جو آنکھوں میں اسد میری شبِ غم کے
سحر خورشید لے آکر سپیدہ صبحِ روشن کا

مگر مجھے یہ غالب کا رنگِ سخن نہیں، اُس کی پیروڈی معلوم ہوتی ہے۔

(۲)

غالب کی وفات پر بہت سی تاریخیں کہی گئیں۔ دیبی پرشاد سحر بدایونی کا دیوان مطبع منشی نول کشور سے جون ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں بھی صفحہ ۱۱۱ پر رجب علی بیگ سرور کی تاریخِ وفات اور غالب کی تین تاریخیں ملتی ہیں۔ پہلا قطعہ فارسی میں ہے جس کا عنوان ہے:

قطعۂ تاریخِ وفات نواب اسد اللہ خاں بہادر دہلوی

مُرد چوں او، این ہمہ بے جان شدند
شعر و سخن نثر و ہنر علم و فضل (۱۲۸۵ھ)

دوسرا قطعۂ تاریخ اردو میں ہے:

تھا شاعر نامی یہی اب دنیا میں
افسوس یہ ہے کہ مر گیا غالب بھی

ہے سحر یہ مصرع مرے لب پر جاری
"دنیا سے آج چل بسا غالب بھی"

تیسرا قطعہ بھی اردو میں ہے جس کے چوتھے مندرجہ ذیل مصرع سے تاریخ برآمد ہوتی ہے:

واۓ واویلا دریغ

(۳)

غالب کا رنگِ سخن اپنے زمانے میں بہت کم مقبول ہوا، پہلے شاہ نصیر اور ناسخ کا سکّہ رواں تھا۔ پھر ذوق کی گرم بازاری رہی اور اس کے بعد داغ اور ان کے تلامذہ کا رنگ جما۔ غالب کے ہم عصروں میں ضلع بجنور کے ایک شاعر احمد حسن رسوا تھے جو اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُن کا فکر معمولی ہے اور فنی اعتبار سے بھی کلام بلند نہیں۔ اُن کا دیوانِ اردو طبع ہو چکا ہے اور فارسی کا دیوان بھی مطبع نول کشور نے شائع کیا تھا۔ اس میں انھوں نے غالب کی متعدد زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے اور کئی جگہ غالب سے خوشہ چینی بلکہ اس سے بہتر کہنے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔

اُن کا نام احمد حسن تخلّص رسوا ہے۔ والد کا نام مولوی محمد حسن بجنوری۔ انبالے میں ملازم تھے اور غالباً محکمۂ بندوبست سے تعلق تھا۔ ان کے دیوان میں ایک قصیدہ کولڈ اسٹریم Coldstream کی مدح میں بھی ہے جس کا عنوان ہے "اشعار چند در مدح صاحب والا شان مسٹر کولڈ اسٹریم صاحب بہادر اسسٹنٹ کمشنر درجۂ اوّل ضلع انبالہ حال ڈپٹی کمشنر" چند شعر یہ ہیں:

ظلِ ہما کنوں بہ سرم سایہ گستر است
رسوا بہ بختِ خویش بنازم کہ یاور است

یعنی کہ باریافتہ ام در حضورِ آنک
فرمانروائے عصر و بہ شوکت سکندر است

ذی جاہ صاحبے کہ بہ انگلینڈ و انڈیا
مانندِ او، بہ مرتبہ و جاہ کمتر است

نام شریف مسٹر کولڈ اسٹریم است
فرماں دہے کہ غیرتِ فغفور و قیصر است

یہ کولڈ اسٹریم کون تھے ؟ ان کے بارے میں ہفت روزہ "ہماری زبان" (یکم مئی ۱۹۶۰ء) میں لکھ چکا ہوں۔ یہاں اتنی صراحت کر دینا کافی ہے کہ غالب سے اُن کے مراسم تھے، سرسید سے بھی دوستی تھی۔ غالباً ۱۸۶۸ء تک یہ دہلی میں جج عدالت خفیفہ رہے۔

اس دیوان کی ترتیب ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔ لیکن ورق اوّل پر لکھا ہے :

" دیوانِ رسوا ..... حسب فرمایش ..... نواب علاء الدین
خاں بہادر فرماں روائے لوہارو ..... بہ ماہ جنوری ۱۸۹۹ء
مطابق ماہ رمضان ۱۳۱۶ھ "

دیوان کے آخر میں چھنی لال مائل کا قطعۂ تاریخ ہے۔ اس میں مصرعِ ذیل سے تاریخ ترتیب ۱۲۹۲ھ نکلتی ہے :

گفت : بویا گلِ بُستانِ سخن

اس میں صفحہ ۱ سے صفحہ ۶۱ تک قصائد فارسی ہیں۔ صفحہ ۶۲ سے غزلیات شروع ہوتی ہیں اور صفحہ ۱۴۲ تک ہیں۔ صفحہ ۱۴۳ سے تقریظات ہیں۔ اکثر غزلوں کے عنوان میں "در زمین غالب" لکھا ہوا ہے۔ بعض شعروں میں غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ مثلاً :

(ص ۷۶) ندانستم کہ رسوا یکہ تازِ عرصۂ معنی ست
که در میدان غالب اسپ فکرت راندہ است امشب

(ص ۱۲۲) رسوا تمام فیض تصانیف غالب است
گویا ازو است آنچہ کہ خود ما نوشتہ ایم

(ص ۱۲۸) چوں غالب خوش لہجہ چساں نغمہ سرائی
اے بلبل ایراں نہ چو رسوا ہوس است ایں

(ص ۱۳۴) جز نظم و نثر غالب ذیشاں ندیدہ ایم
رسوا توفیض یاب ز انشائے کیستی ؟

(ص ۱۳۶) رسوا بنمایم بکہ این قافیہ سنجی
ہیہات کجا غالب سنجیدہ بیاں ہائے

(ص ۱۳۷) کہ می گوید غزل بر گفتۂ غالب، وگر گوید
وحیدِ عصرِ خود، جادو بیاں رسوا ست پنداری

(ص ۱۳۰) ہائے از مُردن صہبائی و غالب رسوا
لحظۂ فارغ و آزاد نیم از غمِ شاں

(ص ۱۱۵) ہمی گویم چو غالب نغز، رسوا
چہ غم گر ہست گفتارِ من اندک

(ص ۱۱۳) دقیقہ سنج چو غالب چساں شوم رسوا
ندادہ اند مرا در ازل خیالِ دقیق

(۴)

دہلی سے ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ منشی قربان علی بسمل ایک رسالہ اردوئے معلیٰ کے نام سے نکالتے تھے۔ اس کے کچھ شمارے نذیریہ لائبریری دہلی میں محفوظ ہیں۔ نومبر ۱۹۲۷ء کے شمارہ (جلد ۵ شمارہ ۸) میں ایک مضمون نثار علی شہرت کا "نیچرل شاعری" کے عنوان سے ہے جس میں غالب اور ذوق کا موازنہ کیا گیا ہے۔ اسی میں ایک مختصر سا مضمون منشی عبدالصمد فوق میرٹھی کے بارے میں محمد جمیل نکودری کا لکھا ہوا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"..... یہ صاحب میرٹھ کے رئیس زادوں میں سے تھے۔ پہلے تو استاد ذوق کے شاگرد ہوئے تھے۔ پھر مرزا غالب کو اپنی غزل دکھانے لگے تھے۔"

تلامذۂ غالب مرتبہ مالک رام میں اُن کا تذکرہ شامل نہیں ہے۔ مزید حالات بھی دریافت نہ ہو سکے۔ تلامذۂ غالب میں اور جن شاگردوں کے تذکرے شامل نہ ہو سکے اُن میں الکزنڈر ہیدر لی آزاد بھی ہیں۔ اِن کے حالات تذکرۂ یورپین وانڈو

یورپین شعرائے اردو مرتبہ رام بابو سکسینہ، نیز مقالاتِ ماجد (غالب کا ایک فرنگی شاگرد) میں ملیں گے۔ آزاد کا دیوان طبع ہوچکا ہے۔ دوسرے شاگرد منشی سخاوت حسین مدہوش بدایونی ہیں جن کے حالات پر ایک مضمون جناب فرخ جلالی کا، "آجکل فروری ۱۹۶۰ء" اور دوسرا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا اردوئے معلیٰ، دہلی یونی ورسٹی (شمارۂ اول) میں شائع ہوچکا ہے۔ تیسرے شاگرد اشرف الاخبار دہلی کے مالک و مدیر اشرف دہلوی ہیں جن کا حال تلامذۂ غالب میں نہیں۔ ان پر جناب محمد عتیق صدیقی کا مضمون رسالہ پگڈنڈی (سالنامہ ۱۹۵۹ء) میں ملاحظہ طلب ہے۔

(۵)

قاطع برہان کے مباحثے میں لکھنؤ کے آغا علی شمس اور اُن کے دو شاگردوں (قمرن جان مشتری اور اُمراؤ جان زہرہ) نے بھی حصّہ لیا تھا۔ اس کا حال ذکرِ غالب (طبع سوم، ص ۱۸) میں موجود ہے۔ اُن کے بارے میں ایک مضمون نادم سیتاپوری کا حال ہی میں شائع ہوا ہے (آج کل فروری ۱۹۶۰ء) بہ عنوان "غالب کی حریف زہرہ و مشتری"۔ اس سلسلے میں انھوں نے درگا پرشاد نادر کے تذکرۃ النساء سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ یہ ۱۸۸۳ء میں مطبع اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا:

> "..... زہرہ تخلص امراؤجان نام ہے بی چھٹن جس کا عرف اور شہر لکھنؤ میں بیچ بازار چوک مقام ہے۔ میرزا آغا علی شمس (کذا) کی شاگرد خاص ہے ..... امیراللہ تسلیم کے دیوان کلیات میں ایک خط فارسی بنام زہرہ مشتری شائع ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں منہ پھٹ اپنے ایسے شفیق استاد سے منحرف بھی ہوگئیں۔ چنانچہ وہ رقعہ بجنسہ نذرِ احباب ہے....."

عطارد رقم زہرہ و مشتری
باورِ سخن نوری و انوری

زآغا علی شمس برہم شدید
بنوعے پریشان و پُرغم شدید

شمارا بدین پایہ و اعتبار
رسانید شمسِ فلک افتخار

وگرنہ بسے قحبہ در لکھنؤ ست
کرا این قدر عزت و آبروست

بنازید بر خود کہ اندر زمن
شمارِ شما ہست در اہلِ فن

بہرکیف یہ رنڈیاں نہایت منہ زور مشہور ہیں۔ اکثر اردو زبان کے اخباروں میں ان کے مباحثے مسطور ہیں۔ اچھے اچھے استادوں پر طعن کرتی ہیں..... دیکھو ایک جھگڑا ان کا اشرف الاخبار دہلی مطبوعہ ۱۰ر جولائی ۱۸۶۷ء میں یہ ہے:

"مشفق مہربان محمد میرزا خاں صاحب اشرف الاخبار دہلی زاد عنایتہ، بعد اشتیاقِ ملاقات کے یہ عرض ہے کہ آغا علی شمس جو منطق میں آج کل اپنے سے بہتر کسی کو نہیں جانتے، اور ادب اور ریاضی و نجوم میں کسی کو نہیں مانتے، انھوں نے لکھنؤ میں زہرہ و مشتری دو رنڈیوں کو علمِ موسیقی و عروض و قافیہ تعلیم کیا ہے اور ان کو خدمتِ اساتذہ میں گستاخ کر دیا ہے۔ چنانچہ آپ نے اودھ اخبار نمبر ۲۶ میں اُن کی غزلیں اور باتیں استادی منشی حبیب الدین صاحب سوزاں کے جواب میں دیکھیں، اور زیارت غزلِ آغا صاحب کی بھی، جو جوابِ استاد مرزا اسد اللہ خاں غالب صاحب میں لکھی ہے، کی ہوگی۔ اور یقین ہے کہ طبعِ حق پسند و حق شناس پر حقیقت اُن کی شرافت و اہلیت اور علم و فضل اور سخن فہمی کی کھل گئی ہوگی اور حسرتِ مناظرہ دل سے نکل گئی ہوگی۔ ہر چند میں جانتا ہوں کہ آپ کا مذہب صلحِ کل ہے اور مجادلہ و مناقشہ و مباحثہ سے آپ کو نفرت بالکل ہے، لیکن اگر ان سب باتوں سے قطع نظر فرما کے

میری خاطر سے صرف اِن غزلوں کو اپنے اخبار میں طبع فرما دیجیے تو سخن ورانِ حق پسند کو سخن دانیِ آغا معلوم ہو۔ اور حقیقت ان کی سخن فہمی کی مفہوم۔ فقط۔ اور ہاں حضرت کو (یعنی غالب کو) زہرہ و مشتری کی تقریر اور آغا شمس کی تحریر سنائی اور دکھائی تھی۔ اُنھوں نے ہنس کر یہ قطعہ انوری کا پڑھا، اور یہ بات فرمائی، "بھائی کیا کروں مجھ کو فلکِ بے مہر اور کواکبِ سپہر سے لہنا نہیں ہے مجھ سے اُن کا کیا کہنا۔" قطعہ انوری: ؎

نے مرا ہست از کواکب فیض

نے مرا ہست از فلک بہرہ

(اس کا دوسرا شعر فحش ہے اس واسطے درج کتاب نہیں ہوا۔)

راقم نور محمد خاں عُطارد

(چمن انداز حصہ ۲ تذکرۃ النسا، نادری، ص ۹۷-۹۸)

میرا خیال ہے کہ مراسلہ نگار کا یہ نام "نور محمد خاں عطارد" فرضی ہے۔ عجب نہیں کہ یہ خط خود غالب نے لکھ کر بھیجا ہو یا اپنے کسی شاگرد سے بھجوایا ہو۔

(ستمبر ۱۹۶۰ء)

کلامِ غالب کا ایک ہم عصر شارح

(درگا پرشاد نادر دہلوی)

شعرائے اردو میں بشمول اقبال، کسی شاعر کے کلام کی اتنی شرحیں نہیں لکھی گئیں جتنی غالب کے اردو دیوان کی لکھی گئی ہیں۔ ان کے عہد سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ کلام غالب کے سب سے پہلے شارح تو خود مرزا غالب ہی ہیں، جنھوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو وقتاً فوقتاً اپنے اشعار کے معانی اور مطالب خود لکھ کر بھیجے ہیں اور ان کے خطوط میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کے حواشی میں ایسی تقریباً کل عبارتیں فراہم کر دی ہیں، جو غالب نے اپنے ہی شعروں کی تفسیر و تاویل کے سلسلے میں لکھی تھیں۔

غالب کے ہم عصروں میں ان کے کلام کی شرح جزوی طور پر مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) نے بھی لکھی ہے۔ یعنی یادگار غالب میں، جہاں انھوں نے کلام غالب کی لفظی و معنوی خوبیوں اور خصوصیتوں سے بحث کی ہے، مثال میں ان کے اشعار پیش کیے ہیں اور ان اشعار کے دروبست یا معنوی نزاکت کو بہت دل نشیں پیرائے میں سمجھایا ہے۔ بعض اشعار کا وہ مفہوم جو آج سمجھا جاتا ہے سب سے پہلے مولانا حالی ہی نے بیان کیا تھا، مثلاً:

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

حالی نے اس بیان کی خوبی اور ندرت کی طرف اشارہ کر دیا ہے تو اب خواہ ہر شخص اسے سمجھتا ہو اور سامنے کی بات کہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اگر حالی اس شعر کی وضاحت نہ کرتے تو شاید ہی کسی کا ذہن ادھر منتقل ہوتا، یعنی دوسرے مصرعے میں لفظ "مکرر" شعر کے معنوں کی کلید ہے، کہ پہلا مصرع ایک بار بطور صلائے عام پڑھا جائے اور اسی کو دوبارہ اعتراف کے طور پر پڑھیں کہ فی الواقع کوئی نہیں ہو سکتا! اسی طرح کی اور بھی مثالیں ہیں جنھیں مولانا حالی نے اس طرح پیش کیا ہے کہ غالب کے فن کی عظمت کا گہرا نقش دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ مولانا حالی کے بیان کردہ مطالب کو پڑھ کر ہی عام طور پر یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ غالب کا کلام شرح و تفسیر کا محتاج ہے اور پھر مختلف شارحین نے بقدرِ حوصلہ اس کی معنوی تہوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔

غالب کے دوسرے ہم عصر شارح خواجہ قمر الدین راقم[1] (۱۸۳۲ـ۱۹۱۰ء) ہیں۔ انھوں نے بھی دیوانِ غالب کی ایک شرح لکھی تھی، لیکن یہ اب دستیاب نہیں ہوتی[2]۔ تیسری معاصر شخصیت درگا پرشاد نادر دہلوی[3] کی ہے، جسے اس مضمون میں پہلی بار شارح کلامِ غالب کی حیثیت سے روشناس کرایا جا رہا ہے۔ غالب کی وفات کے بعد دیوانِ غالب کی شرحیں مختلف مدارج کی لکھی گئیں۔ کچھ علمی انداز کی، کچھ درس و تدریس کے مقصد کو پورا کرنے والی اور بعض محض چربہ اور نری نقالی۔ پھر ان کی حیثیتیں ہیں۔ بعض شارحین کا مقصود ہی کلامِ غالب کی شرح لکھنا تھا۔ انھوں نے دیوانِ غالب کے آغاز سے اختتام تک ہر شعر کا مطلب بیان کیا اور وضاحت کی خواہ وہ شعر صاف اور سہل ہی کیوں نہ ہو۔ بعض نے ضمناً اور جزوی شرح لکھی اور ان کا مقصد یا تو محض مشکل اشعار

---

[1] راقم کے حالات کے لیے رجوع کریں: احوالِ غالب، مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد، ص ۲۹۰ـ۲۹۴۔

[2] اس مضمون کی اشاعت کے بعد مجھ سے پروفیسر سید احتشام حسین نے بیان کیا کہ اس شرح کا مسودہ انھیں دستیاب ہو گیا ہے۔ یہ بہت بوسیدہ اور آب زدہ ہے اس لیے جا بجا عبارتیں مغشوش ہو گئی ہیں۔ بہر حال یہ شرح قابلِ قدر ہے اور اس لائق ہے کہ اسے شائع کیا جائے۔

[3] نادر دہلوی کے حالات کے لیے، دہلی کالج میگزین (دلی نمبر ۱۹۵۹ء)، ص ۳۷۷ـ۳۸۳۔

کا مطلب بیان کرنا تھا یا غالب کے فکر و فن کا جائزہ پیش کرنا تھا۔ اس ضمن میں جن شارحین کے نام لیے جاسکتے ہیں، وہ یہ ہیں:

احمد حسین شوکت میرٹھی، علی حیدر نظم طباطبائی، مولانا حسرت موہانی، بے خود موہانی، بے خود دہلوی، مولانا عبدالباری آسی، جوش ملسیانی، آغا محمد باقر، نیاز فتح پوری، خلیفہ عبدالحکیم، مولانا سہا مجددی، اثر لکھنوی، وغیرہ۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ چنانچہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی "تفہیم غالب" کے عنوان سے اشعارِ غالب کی شرح لکھ رہے ہیں، جو رسالہ 'شب خون' الٰہ آباد میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے اور ڈاکٹر گیان چند نے دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ کی شرح لکھ لی ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے[۱]

(۲)

کلامِ غالب کی جزوی شرح کرنے والوں میں مرزا غالب کے ہم عصر منشی درگا پرشاد نادر دہلوی بھی ہیں۔ یہ کپل منی کی اولاد گیلش گوت کے کھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پر دادا منشی ہردے رام بھی شاعر تھے، دادا منشی لکھپت رائے اور والد منشی منشا رام ناتواں بھی شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے۔ اصل وطن سرہند تھا لیکن نادر شاہ کے حملے میں وہاں سے اجڑ کر دہلی میں آباد ہو گئے تھے۔ یہیں ۱۲؍ جمادی الاول ۱۲۴۹ھ مطابق ۲۱؍ستمبر ۱۸۳۳ء کو بدھ کے دن درگا پرشاد پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے ۱۸۵۲ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں منشی ذکاءاللہ، مولانا امام بخش صہبائی اور ماسٹر رام چندر دہلوی سے تعلیم حاصل کی اور ۱۸۵۷ء کے واقعات سے قبل ہی ضلع رہتک میں محرر کے پاس ہو گئے۔ ۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۳ء تک ضلع گڑگانواں میں فارسی کے مدرس رہے اور ۱۸۶۴ء میں دہلی کے محلہ تیلی واڑہ کے اسکول میں تبادلہ ہو کر آ گئے۔ فروری ۱۸۷۷ء میں انھوں نے شادی کی اور اسی سال

---

[۱] دہلی میں صد سالہ یادگارِ غالب کی تقریبات کے موقع پر پروفیسر عبدالقادر سروری نے شارحینِ غالب سے متعلق ایک مفصل مضمون پیش کیا تھا جو ان تقریبات کی روداد میں چھپے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ اب تک غالب کے کلام کی تقریباً ۳۷ شرحیں ہر معیار و مقدار کی لکھی گئی ہیں۔

اپریل میں لاہور چلے گئے۔

پنڈت درگا پرشاد نادر دہلی سوسائٹی کے ممبر بھی تھے پیارے لال آشوب ہی کی فرمایش سے انھوں نے شعرائے دکن کا تذکرہ خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم تیار کیا تھا، جو مطبع مفید عام لاہور سے طبع ہوا۔ نادر کی دوسری تالیف تذکرۃ النسائے نادری عرف چمن نادر بھی ہے، جس میں ۴۴ا شاعرات کا حال اور کلام درج ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۸۴ء میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا۔ نادر کے بیشتر مسوّدات ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں غتر بود ہو گئے۔ بعد کو ایک مختصر دیوان نظم مطلب غریب (۱۲۹۳ھ) فراہم کر لیا تھا۔

نادر ہی کی ایک تصنیف کا مطبوعہ نسخہ راقم الحروف کے ذخیرے میں ہے جس کے ابتدائی دو صفحات اور سرورق غائب ہے، آخر سے بھی کچھ ورق ضائع ہو گئے ہیں۔ بظاہر اس کتاب کا نام "چار چمن" ہے اور اس کی یہ ترتیب ہے:

پہلا چمن: شعر کی خوبی اور شعر فہمی میں شعرا کی فضیلت اور غرض۔ اس میں اقسام شعر کے تحت لکھا گیا ہے:

اوّل قسم: عارفانہ، دوسری قسم: عاشقانہ، تیسری قسم نصیحتانہ، چوتھی قسم: شاعرانہ[1]

ان میں سے ہر قسم کی مثالیں اساتذہ کے کلام سے فراہم کی گئی ہیں اور ان اشعار کے بین السطور میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ یہ کون سی قسم کے شعر ہیں۔ پہلا چمن صفحہ ۶۴ پر تمام ہو جاتا ہے۔ آخر میں "تاریخ تالیف خزینۃ العلوم مصنفہ لالہ درگا پرشاد نادر دہلوی" میر مقصود علی رافع کی ہے:

لکھا نادر یہ تذکرہ نادر — اب یہ حاسد کو چاہیے غم سے
قلب رنجور رافع زخمی — دگنا اور تگنا چوگنا کر لے (۱۲۹۶ھ)

حاشیے پر بتایا ہے کہ قلب بمعنی دل، لفظ رنجور کا دل یا قلب ج ہے اس کو

---

[1] اب تک یہ خیال تھا کہ شاعری کی موضوعات کے لحاظ سے ایسی تقسیم پہلی بار مولانا حسرت موہانی نے پیش کی لیکن معلوم ہوا کہ نادر اس معاملے میں حسرت کے پیش رو ہیں۔

ترتیب وار ۳ کے ہندسے کو دگنا کیا تو ۶ ہوئے اور تگنا کیا تو ۹ بنے اور تین کو چوگنا کیا تو ۱۲ ہوئے یہ صنعت ریاضی وجمع ضربیہ ہے۔

دوسری تاریخ کا عنوان یہ ہے:

"تاریخ کتاب ہذا بطور اختصار قطعہ مندرجہ کتاب ہذا صفحہ ۲۵۱ حلم مولف شاگرد مصنف موصوف"۔

اس قطعۂ تاریخ میں ۵ شعر ہیں جن میں آخری دو یہ ہیں:

شوق تھا یہ شاعری میں کون سی سیکھوں کتاب
جس سے آجائیں مجھے اس علم کے طرز و رسوم
عیسوی مصرع میں ہجری کہہ صلا ہاتف نے دی
حلم چو چند جی لگا کر پڑھ خزینۃ العلوم (۱۲۹۶ھ)

اس کی تشریح حاشیے پر یوں لکھی گئی ہے:

"ہاتف نے جو صلاح دی کہ عیسوی مصرع میں ہجری کہہ اس سے ثابت ہے کہ کل مصرع عیسوی سنہ کا ہے جس کے حرفوں سے ۱۸۷۹ء نکلے۔ اس مصرع کے اندر ہجری سنہ اس طرح ہے کہ خزینۃ العلوم پر جس کے حرفوں سے ۱۲۴۴ھ نکلتے ہیں چو چند جی لگایا۔ جی کے ۱۳ ہیں اس کا چو چند ۵۲ ہوئے، ۵۲ کو ۱۲۴۴ھ پر لگانے سے ۱۲۹۶ھ ہو گئے۔ اس کو صنعت حسابیہ کہتے ہیں"۔

اس کے بعد "پہلے چمن کا حل" پیش کیا ہے اور گزشتہ ابواب میں جو اشعار مثالوں میں آئے ہیں ان کے معانی و مطالب بیان ہوئے ہیں۔ یہ ۴۶ صفحوں کو محیط ہیں۔

دوسرا چمن: اشعار محاورات میں ہے۔ یہ ۲۷ صفحوں پر مشتمل ہے اور ساتھ ہی اس کے اشعار کا حل ۵۰ صفحوں میں ہے۔

تیسرا چمن: ضرب الامثال میں ہے، اس کے تحت ضرب الامثال اور ان کی تشریح کی گئی ہے۔ ہمارے نسخے میں یہ حرف س تک ہے۔ اس حصے میں اشعار نہیں ہیں۔

(۳)

اس کتاب کے پہلے اور دوسرے چمن میں غالب کے جو اشعار پیش ہوئے ہیں اور ان کا مطلب بیان کیا گیا ہے وہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ یہاں حاشیوں پر وہ عبارت دی گئی ہے، جو ان اشعار کے حواشی میں درج ہے اور اشعار کے نیچے وہ مطلب لکھا گیا ہے، جو شرحِ ابیات کے کے تحت علیٰحدہ حصّے میں بیان ہوا ہے:

"ان کے اشعار اس وجہ سے ادق ہوتے ہیں کہ بہت سے قابلِ ذکر الفاظ کو محذوف کرتے ہیں۔ بعیدہ قرینہ واشارہ وایما پر مدار رکھتے ہیں۔"

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا[۱]

پہلے زمانے میں دستور تھا کہ جس کو عدالت ماتحت کا اپیل کرنا ہوتا تھا وہ عدالت کی نقل حکم اپنے جامے پر ٹانک کر عدالتِ عالیہ کے سامنے جا کھڑا ہوتا تھا۔ یہ فریادی کی نشانی تھی۔ اس کو لباس فریاد کہتے ہیں۔ غالب نے وہی رواج اب ذکر کیا ہے۔ تصویر جو کاغذ پر کھینچی ہوتی ہے تو یہ کاغذ گویا اس کا لباس فریاد ہے اور فریاد اس امر کی ہے کہ مصوّر نے مجھے لوٹ لیا کہ میری گویائی، بینائی، رفتار اور تمام قدرتی اسباب چھین کر بے زبان اور بے حرکت بنا کر، اصلی صورت بگاڑ کر اس کاغذ میں قید کر دیا۔ اس میں معرفت و تعریف خدا یہ ہے کہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا کمال اور صنعت صانع حقیقی کے مقابلے میں کمال عیب اور نقص ہے حالاں کہ اپنی دانست اور ظاہری خیال سے مصوّر تصویر کو اصلی صورت سے عمدہ نقش کرتا ہے، مگر قدرتی اسباب مثلاً گویائی، بینائی، رفتار، نزاکت نہ ہونے سے اصلی صورت بالکل بگڑ گئی۔ مصوّر کو جو گمان تھا کہ تصویر

---

[۱] دیوانِ غالب ۱۴۱ (مرتبہ مالک رام) آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۵۷ء۔ تمام اشعار میں اسی دیوان کے حوالے دیے گئے ہیں۔

میری تعریف کرے گی اس لیے درحقیقت تصویر اس کی فریاد کرتی ہے کہ گستاخی کی۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا (دیوان/۸۰)

یہ طب کا مسئلہ ہے کہ جب رگوں میں ہوا بھر جاتی ہے تو خون میں بلبلے ہو جاتے ہیں۔ اس کو ریح کی بیماری کہتے ہیں۔ قطرے کو یہ درد ریح ہو کر یعنی ہوا بھر کر بلبلہ بن گیا۔ بلبلے کی ہوا جب تک بلبلے کی حد میں رہے تب تک یہ ہوا کا درد درمیان ہے اور جب یہ ہوا حد سے بڑھی یعنی پھیل کر باہر کو سر نکالا پس اسی دم درمیان سے نکلی اور درد کو آرام ہوا اس لیے درد ہی کا حد سے نکل جانا قدرتی دوا ہے۔ ہوا نکلنا یعنی مرجانا ہے۔ بلبلے کے واسطے فنا ہونا عشرت ہے کہ دریا میں مل کر دریا بن گیا۔ بقولِ ذوق :

کیونکر حباب ہو سکے دریائے بیکراں
دریا سے جب تلک نہ ملے ٹوٹ پھوٹ کے

مراد یہ ہے کہ عارف فنا ہو کر خدا کی ذات میں مل کر خدا ہو جاتا ہے۔ فنا ہونے کی تکلیف کا انجام اس کے لیے راحت ہے اس کی تائید میں انھیں کا یہ شعر ہے :

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے (دیوان/۱۹۵)

(۳) نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

(دیوان/۶۷)

اول بھی خدا ہے، آخر بھی خدا ہے، جسم انسان کی ہستی بیچ میں حائل ہو گئی، اگر یہ وجودِ انسانی نہ ہوتا تو میں خدا ہوتا۔

(۴) اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

(دیوان/۵۸)

ذوق کے پہلے شعر[1] اور اس شعر کا ایک مضمون ہے۔ پہلے اس کی شرح دیکھو پھر اس کو۔ اپنا جلوہ انسان کو دکھلانے کے واسطے پہلے اس میں آپ بینائی بنا، اگر وہ آپ ہی بینائی نہ بنتا تو پھر دیکھنے کی کس کو تاب تھی پس وہ بینائی بن کر ہر ایک میں ہے جیسا کہ قرآن شریف میں فرمایا کہ نَحْنُ فِیْ اَنْفُسِکُمْ یعنی ہم تمہارے نفسوں میں ہیں ــــ دوسری آیت یہ ہے کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد۔ یعنی ہم تمہاری شاہ رگ سے بھی نزدیک ہیں، اس میں دوئی کی بو نہیں یعنی وہ اپنے سوا کسی دوسرے کی نظر نہیں پڑتا، انسان کو جو دکھائی دیتا ہے اس وقت دیتا ہے جب کہ اس کی انسانی ہستی کو مٹا کر آپ بن جاتا ہے۔ جب دیکھنے دکھلانے والا آپ ہی آپ ہے تو دوئی کا ذکر ہے۔ اگر وہ دوئی پسند ہوتا تو ضرور کبھی نہ کبھی کسی کو اس کی اصلی حالتِ انسانی میں ملتا چوں کہ وہ انسان کو اس کی ہستی مٹا کر آپ بنے بدون کبھی دکھائی نہیں دیا اس وجہ سے وہ سب میں بیگانہ ہے دوئی کی اس میں بو نہیں۔ مولف نے درویشی نور سے مختصر طور پر اس عقدے کو کھولا ہے ورنہ یہ تصوف کا ایسا باریک مسئلہ ہے کہ خود غالب اس کے بیان پر آگے کے شعر میں فخر کرتا ہے:

---

[1] ذوق:

آپ آئینہ ہستی میں ہے تو اپنا حریف
ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا

اس لیے ہر آئینہ میں تیرا ہی عکس ہے یعنی تو ہی ہے۔ جب ہر شے میں تو ہے اس قوت کے باعث کہ تو اپنی تجلی کے سہارے کے واسطے اس میں موجود ہے آئینہ ہستی تیری تاب نہ لاسکا اگر اس میں تو نہ ہوتا تو آئینہ ہستی کی کیا ہستی تھی جو تیری تجلی کی تاب لاسکتا۔ ذرا سی تجلی کوہِ طور پر پڑی تھی وہ جل کر خاک ہو گیا تھا، خلاصہ مطلب یہ ہے کہ عارف جو تجھے دیکھ لیتا ہے پہلے اس میں تو سمایا ہوا ہے اس وجہ سے عارف تجھے نہیں دیکھ سکتا بلکہ تو ہی اس کے نام سے اپنی ذات آپ دیکھ رہا ہے جیسا کہ ناسخ فرماتے ہیں:

آئینہ یہ دوراں ہے اس میں عکس جاناں ہے
آپ اپنا حیراں ہے آپ ہی اپنا ثانی ہے

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(دیوان/ ۵۸)

(۵) محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(دیوان/ ۵۰)

حجاب یہاں دو معنی دیتا ہے۔ ایک چھپانے کا پردہ، دوسرے ساز کا پردہ۔ نوا بمعنی گانے کی آواز۔ یہ شعر ذوق کے دوسرے شعر کے مضمون کے موافق ہے[1] ذوق نے برگ سے ہر شے مراد لی ہے۔ انھوں نے پردے سے حجاب یا پردہ ستار و طنبورہ اور سارنگی وغیرہ کے تاروں کو کہتے ہیں، جو اوپر ہی ہوتے ہیں۔ جب یہ بجتی ہے تو تمام اندرونی حالات آوازوں اور سُروں کو ظاہر کر دیتی ہے۔ اسی طرح جتنے بھید خدا تعالیٰ نے مخلوقات کے پردے میں چھپائے ہیں وہ پردے ہیں ظاہراً خود بخود زبانِ حال سے

---

[1] ذوق:

گوش شنوا نہیں ہے باغ جہاں میں غافل
ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا

اے غافل تجھ کو معرفت کے کان نہیں ورنہ ہر ایک پتّا اس کی تعریف گاتا ہے۔ پتّے سے مراد ہر شے۔ آدمیوں کی عبادت تو ظاہر ہے، پہاڑوں کا اس کے عشق میں یہ حال ہے، رونے سے دریا جاری ہیں دل میں آگ بھری ہوئی ہے، درخت اس کی نماز میں کھڑے ہیں، پتوں سے جو آواز آتی ہے وہ ذکر و تسبیح کرتے ہیں۔ چوپائے رکوع میں ہیں، زمین کے کیڑے سجدے میں ہیں (پرندے) اس کی یاد گاتے ہیں، چنانچہ قمری کہتی ہے حق سرہ، فاختہ کہتی ہے حق ہو، تیتر کہتا ہے سبحان تیری قدرت، چڑیا بے چوں بے چوں کرتی ہیں بقول نظیر:

شام سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
بےچوں بےچوں بےچوں بےچوں کیا سب بےچوں بےچوں کرتی ہیں

اپنے اندرونی حالات بآواز بتا رہے ہیں۔ دیکھو ذوق کے دوسرے شعر کی شرح۔ دوسرے یہ ہے، جیسے کہ ساز کے مثلاً سارنگی کے بہت سے پردے ہوتے ہیں، ناواقف کو ان میں اکثر فضول نظر آتے ہیں مگر ساز والے کے نزدیک اگر ایک تار بھی کم ہو جائے تو سلسلے میں فرق آجائے۔ دیکھو حیوانات کا سلسلہ ہاتھی سے لے کر اس کیڑے تک جو پتھر میں ہیں اور بذریعہ خُردبین کے نظر آتے ہیں اور نباتات کا سلسلہ کلاں درخت مثلاً بڑھ کے درخت سے لے کر اس کائی تک ہے جو پتھر میں سے نکل کر پتھر پر جم جاتی ہے جس کے سبب پاؤں رپٹتا ہے، یا چونے والے فرش پر اور دیواروں پر ہوتی ہے جس سے سیاہی آجاتی ہے۔ اسی طرح اجرام فلکیہ کا جس کو نظام شمسی کہتے ہیں، اگر ایک ستارہ کم ہو جائے تو کشش اور گردش کا انتظام بگڑ کر سب ایک جگہ غٹ پٹ ہو جاویں، وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ سب کے سب زبان حال سے اس کی تعریف گاتے ہیں کہ ہم کو اس نے صنعت اور حکمت سے اس فائدے کے واسطے پیدا کیا ہے۔
بقول نظامی:

دریں پردہ یک رشتہ بے کار نیست
سر رشتہ بر ما پدیدار نیست

(۶) یک ذرہ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

(دیوان/۶۸)

جادہ بمعنی رستہ۔ لالہ کا داغ سیاہ ہوتا ہے جس کو اندھیرا جانا گیا ہے اس اندھیرے کی روشنی کے واسطے جو اس میں پتیاں ہیں وہ گویا روشن شمعیں ہیں۔ اسی طرح باغ گل لالہ کے مشابہ ہے۔ باغ میں تمام زمین سرسبز ہوتی ہے صرف روشیں یعنی راستے سبزی سے محروم ہیں، مگر باغ میں جتنے راستے ہیں وہ باغ میں ایسے خوشنما اور روشن ہیں جیسے کہ لالہ کے اندر فتیلے۔ اس وجہ سے باغ میں زمین کا ایک ذرہ بھی بیکار نہیں: مراد یہ کہ جہاں کا ایک ذرہ بھی بیکار نہیں جیسا کہ اوپر کے شعر میں گزرا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

(دیوان / ۱۳۶)

بموجب قول فلاسفہ کے کل شئ یرجع الی اصلہ۔ اس لیے تمام چیزوں کی مٹی بن جاتی ہے اور پھر وہ مٹی پہلی صورت پر آنے کی کوشش کرتی ہے۔ چوں کہ حسینوں کو لالہ و گل سے تشبیہ ہے، پس حسینوں کی مٹی نے کشش کرکے گل اور لالہ کے روپ میں ظہور پکڑا۔ یعنی جو خوب صورت چیزیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں وہ خوب صورتوں کی خاک سے وجود میں آتی ہیں جیسا کہ ناسخ فرماتے ہیں:

باغ میں گلبن ہیں گلدستے مزاروں کے تمام
خاک میں کیا کیا ہی گل رخسار پنہاں ہوگئے

یعنی باغ میں جتنے پھولوں کے بوٹے ہیں سب خوب صورت مردوں کی مٹی سے اُٹھ کر قبروں کے گلدستے بن گئے ہیں۔

(۸) شوق[1] ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

(دیوان / ۴۴)

پردۂ تصویر یا مرقع وہ چادر ہوتی ہے جس میں بہت سی تصویریں ہوتی ہیں۔ ان میں لیلیٰ مجنوں کی بھی تصویر ہے۔ سب تصویروں کو قسم قسم کے رنگوں سے لباس اور زیور سے سجایا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن مجنوں کی تصویر سوکھی، کبڑی پسلیاں (کذا) نکلی ہوئیں لاغر اور ناتواں اور ننگی ہوتی ہے، اس واسطے لکھا ہے کہ ہر رنگ کا شوق سروساماں کا دشمن نکلا۔ مجنوں کو جو تصویر کے رنگ میں لیلیٰ کے دیکھنے کا شوق ہوا تو جیسا کہ زندگی میں دیوانگی سے کپڑے پھاڑ کر ننگا رہتا تھا تصویر میں بھی شوق نے ننگا ہی رکھا۔

---

[1] ہر رنگ میں یار کے دیکھنے کا شوق۔ رقیب بمعنی دشمن۔

(۹) یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

(دیوان/۵۷)

جب تک انسان زندہ یا اپنی ہستی اور ہوش و حواس میں ہے تب تک وصالِ یار ہونا یعنی خدا کی ذات میں ملنا ناممکن ہے اگر قیامت تک اس انتظاری میں جیتے رہیں تو انتظاری کا عذاب ہی سہی مگر ذات میں ملنا مرنے یا فنا ہونے بدون ممکن نہیں، بقول مست :

خود فنا ہو کے ذات میں ملنا
یہ تماشا حباب میں دیکھا

(۱۰) ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

(دیوان/۵۸)

قاعدہ ہے کہ جیتے جی آدمی کی قدر اور شہرت نہیں ہوتی، مرنے کے بعد جو جنازہ اُٹھا تو کوچہ و بازار میں انگلیاں اٹھتی چلی گئیں کہ فلاں عاشق کا جنازہ جا رہا ہے اور تمام جگہ شہرہ پھیل گیا کہ فلاں عاشق مر گیا اور پھر قبر نے مشہور کیا کہ یہ فلاں عاشق کی قبر ہے۔ اگر دریا میں غرق ہو جاتا تو جنازہ اُٹھانے کی ضرورت پڑتی اور نہ کہیں قبر بنتی۔ سب طرح کی رسوائیوں سے بچ جاتے۔ مطلب یہ کہ عاشقانِ خدا مر کر زیادہ شہرت پاتے ہیں اور ہمیشہ تک مشہور اور زندہ جاوید رہتے ہیں جیسا کہ ذوق کے پانچویں شعر میں ہے لے

(۱۱) دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

(دیوان/۷۳)

جن کی نظر چڑھا ترا رخسارہ آتشیں
ان کا چراغ گور نہ تا حشر گل ہوا

میں نے ابھی کچھ بھی گناہ نہ کیے تھے کہ گناہ ختم ہو چکے۔ گناہ کرنے کے ارمان دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ مذاق یہ کہ شریعت والے گناہوں کو بہت بُرا بتاتے ہیں۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے بلکہ خدا کا دریائے مغفرت بہت بڑا ہے اور عاشق لوگ بہت گناہوں کو اس واسطے دوست رکھتے ہیں کہ ایک تو گناہ گار کو خدا سامنے بلا کر پوچھے گا، تو اس بہانے سے خدا کا جمال دیکھیں گے، دوسرے بخشش کے قابل بھی گناہ گار ہی ہے :

نصیب ماست بہشت لے خدا شناس برو
کہ مستحق کرامت گناہ گار اند

(۱۲) ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

(دیوان/۹۲)

شراب سے حسن زیادہ آب و تاب پر ہو جاتا ہے جو عاشق کو زیادہ قتل کرتا ہے۔ چوں کہ یہ تیز تلوار صراحی میں سے نکلی اس لیے عاشقوں کا خون صراحی کی گردن پر پڑا، یعنی وہی معاون ہوئی، اس خوف سے صراحی سے آتی ہوئی شراب کی موج تھرتھراتی ہے کہ جس طرح رنگ کی مشابہت میں صراحی پکڑی گئی کبھی ایسا نہ ہو کہ حسن کی رفتار کی مشابہت سے میں پکڑی جاؤں، کیوں کہ جس طرح اس کا رنگ قتل کرتا ہے اسی طرح اس کی رفتار کرتی ہے۔ حسن کی رفتار کو موجِ شراب سے تشبیہ ہے۔ خدا کا ہر رنگ اور ہر چال دیکھ کر عشق و لولے مارتا ہے۔

(۱۳) ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

(دیوان/۱۳۹)

اگر دوست کا ملنا مشکل کے ساتھ ہو تو آسان بات ہے کیوں کہ ہے تو سہی مشکل تو وہ بات ہے کہ مشکلوں سے بھی ملنا نصیب نہ ہو یعنی ناممکن ہو۔ طالبوں کے واسطے شے کی طلب میں ہر ایک مشکل بہت آسان ہے۔ وہ تو مشکل اس بات کو جانتے ہیں کہ مشکلیں جھیل کے

بھی مطلوب نہ ہو یعنی ملنا ناممکن ہے۔

(۱۴) سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں

بیٹھا ہے بت آئینہ سیما مرے آگے (دیوان/۲۲۱)

جب آئینہ سامنے ہوتا ہے تو اپنا آپ نظر آتا ہے تو وہ آئینہ دیکھنے والا خود بین ہوتا ہے یعنی اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ چونکہ آئینے جیسی پیشانی والا بت یعنی خدا عاشقوں کے سامنے ہے اور اس میں وہ اپنے آپ کو دیکھ کر مست ہیں اس مستی کو شریعت یا ظاہر والے خود بینی تصور کرتے ہیں۔

(۱۵) بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوار یار میں

فرماں روائے کشور ہندوستان ہے (نسخۂ مالک رام/۱۶۴)

سایہ سیاہ ہوتا ہے اور وہ ہندوستان بھی سیاہی سے منسوب ہے اس مذاق سے ہندوستان آیا۔ چوں کہ یار کا قرب طالبوں کو بادشاہت ہے اس وجہ سے دیوار کے سائے کو بادشاہت ٹھہرایا۔

(۱۶) بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبل زار

کہ گوش گل نم شبنم سے پنبہ آگیں ہے (دیوان/۲۱۲)

کان میں روئی ڈالنے سے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ گل کے کان میں یعنی گلوں پر شبنم پڑ کر حسن کو زیادہ کر دیتی ہے اس غرور میں وہ بلبل کی فریاد نہیں سنتے۔ یعنی حُسن اپنے غرور سے عشق کی آہ وزاری پر ترس نہیں کھاتا۔

(۱۷) ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

بے نیازی تری عادت ہی سہی

عشق حُسن سے تنگ آ کر اس کے جور و جفا سہنے کی عادت کر لیتا ہے جب اس کو برداشت پر قائم اور مضبوط پاتا ہے تو ناچار ملنا ہی سوجھتا ہے۔ مضبوط شوق جتانے کو کہا جاتا ہے

(۱۸) صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر

تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر (دیوان/۹۷)

اس میں یہ مثال ہے آئینے کی حیرت کی صفائی اس کے تحیر کا سامان ہے (کذا) جیسا کہ کھڑے پانی کا رنگ بدل جاتا ہے۔

(۱۹) الفت گل سے غلط ہے دعوئ وارستگی

سرو ہے باوصف آزادی گرفتار چمن

الفت میں پھنس کے آزادی کا دعویٰ غلط ہے جیسا کہ سرو باوجود اپنی آزادی کی صفت کے چمن کی الفت میں قید ہوا کھڑا ہے۔ اس کو تمثیل کہتے ہیں۔

(۲۰) درد منت کش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا (دیوان/۶۴)

اگر دوا کھا کر ہوتا تو دوا کا احسان ہوتا۔ اب جو دوا نہ کھائی اور اچھا نہ ہوا تو یہ بات یعنی میرا بیمار ہونا کچھ بُرا نہ ہوا بلکہ اچھا ہوا کہ دوا کے احسان کے بوجھوں نہ مرا۔

(۲۱) تھی وطن میں شان کیا غالب ہو غربت میں قدر

بے تکلف ہوں وہ مشت خس جو گلشن میں نہیں

(کہ گلخن میں دیوان/۱۱۶)

باغ میں باغباں کا دستور ہے کہ پودوں کی پاس کی گھاس کو نکال دیتا ہے تاکہ پودوں کو نقصان نہ پہنچے اور باغ سے باہر پھینک دیتا ہے۔ پس جب گھانس وطن یعنی باغ میں تھی جب ہی ایسی بے قدر تھی کہ اس کو نکمی ہونے کے باعث باغ سے نکال کر پھینک دیا تھا۔ اب باغ سے باہر بے اصل سوکھی گھانس کی تو کیا قدر و قیمت ہونی تھی۔ اسی طرح جس انسان کی قدر وطن میں نہ ہو تو پردیس میں نہیں ہوتی۔

(۲۲) نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا

رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو (دیوان/۱۴۹)

مالدار کو سفر میں مال کے اندیشے سے نیند نہیں آتی اور جب اتفاقاً راہ میں راہزن لوٹ لیتے ہیں تو مال کی حفاظت کا اندیشہ جاتا رہتا ہے اور نچنت ہو کر سوتا ہے تو ظریفانہ رہزنوں کو دعا دیتا ہے کہ مال لوٹ کر دل کو اندیشے کی قید سے رہا کیا اور نیند

بھر سُلایا۔ مطلب یہ کہ زرداروں کو نیند اور چین نہیں۔ بے روزی میں چین اور آرام ہے۔

(۲۳) بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا (دیوان/۵۴)

آدمی ایک تو ظاہر ہے دوسرے معنی خدمت گار۔ مراد دوم سے ہے۔[1]

(۲۴) آگ سے، پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا

ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

(ناچار دیوان/۱۶۹)

جب آگ کو پانی میں ڈالتے ہیں تو بجھتے وقت سوں سوں کی آواز یعنی رُونے کی نکلتی ہے۔ یعنی آگ جو اپنے سوز اور دھوئیں سے جہاں کو رُلاتی ہے آفت و مصیبت پڑنے کے وقت وہ بھی رو پڑتی ہے۔ اسی طرح دشمن سے مغلوب ہو کر ناچاری میں ہر ایک گریہ و زاری کرتا ہے۔

(۲۵) غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوس زر

کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آوے

مال کا لالچ توقیر کو کھو دیتا ہے، جس طرح کہ باغ میں گل معشوق بنا ہوا تھا جب زر کا لالچ ہوا تو بکنے کے لیے بازار میں آیا۔

(۲۶) لپٹنا پرنیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے

ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی (دیوان/۱۶۲)

---

[1] شرح: آقا لوگ آدمی پیش خدمت یا گھر کے نوکر کو کہتے ہیں۔ وہ تمام گھر کے مشکل کاروبار کہ آقا سے نہ ہو سکیں آسانی سے کر لیتا ہے مگر آقا والے کا کاروبار انسانیت یعنی علوم و فنون اور صنعت کمالات خدمت گار سے ہونے بہت ہی دشوار ہیں جب ان سے لڑکپن میں نہ ہو سکے جوان ہو کر خدمت گاری کی ذلت میں پڑے۔ مطلب یہ کہ ہر ایک انسان خاص ایک ایک کام کے واسطے پیدا کیا گیا ہے۔ اس سے اپنا کام آسانی سے ہو سکتا ہے اور دوسرے کا کام اس کو دشوار ہے جیسے کہ سرمایہ خرد میں ہے۔ کُلُّ نفسٍ لِما خُلِق لَہٗ یعنی جو شخص جس کام کے واسطے پیدا کیا گیا ہے وہی اس کے واسطے آسان ہے۔

پرنیاں ریشمی باریک کپڑا ہے جو آگ کی ذراسی آنچ سے جل جاتا ہے۔ تو اس صورت میں شعلے کا پرنیاں میں چھپا رہنا بہت مشکل ہے، لیکن اس سے زیادہ محال دل میں غم کی آگ چھپانا ہے یعنی جس طرح ریشمی کپڑے میں شعلۂ آتش نہیں چھپتا اسی طرح دل میں غم نہیں چھپتا اور پھونک ڈالتا ہے۔

(۲۷) رفتارِ عمر قطع رہ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے (دیوان/۱۷۴)

عمر کی چال بے قراری کے راستے کو کاٹتی ہے، یعنی بے قراری کو طے کرتی ہے، یہ عمر جھٹ پٹ گزر جانا۔ بجلی کے کوندھ جلنے سے آسانی سے ایسا سمجھ میں آجاتا ہے جیسا کہ جنتری میں سال بھر کا حساب آفتاب کی رفتار سے، مطلب یہ کہ جس طرح بجلی بھڑک کے کوندکے ذراسی دیر میں غائب ہو جاتی ہے اسی طرح تھوڑی سی دیر میں عمر چمک کر جاتی رہتی ہے۔

(۲۸) نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے (دیوان/۱۷۷)

دنیا نقد ہے سو فانی ہے، اور آخرت ادھار ہے، حقیقت میں دونوں بے اعتبار ہیں، جو عارف لوگ ہیں وہ دونوں کو کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ خدا کو حاصل کرتے ہیں اور خدا اپنے آپ کو حاصل کرنے سے حاصل ہوتا ہے، یعنی جس نے اپنے نفس کو کما لیا اس نے خدا کو پالیا، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ اس لیے میری عالی ہمت نے دونوں عالم کو بے حقیقت سمجھا اور مجھ سے مجھ کو خرید لیا کیوں کہ مجھ میں یعنی انسان میں ذاتِ الٰہی ہے۔

(۲۹) ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

ہمارا ہونا ہی اس امر کی کافی دلیل ہے کہ فنا ہونے والی شے ہے یعنی ہونے

ہی سے ہم فنا ہوئے جس طرح انسان اپنی قسم کھا کے مر جاتا ہے، گویا آپ ہی نے اپنے آپ کو فنا کیا۔

(۳۰) سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
(دیوان/۱۶۶)

اس قدر پریشانی ہے کہ زندگی کی امید نہیں، جب امید نہ رہی تو دل کو بے قراری ہوئی۔ اب دل کے قرار کے واسطے ایک نہ ایک امید رکھنی چاہیے تو ناچار دل کی تسلی کے لیے مرنے کی امید باندھی تاکہ اگر اور امیدیں پوری نہ ہوئیں تو یہ ضرور پوری ہوگی۔ جب کوئی امید پوری نہ ہو تو مرنا یاد کر کے دل کی تسلی کر لینی چاہیے۔

(۳۱) مۓ عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجیے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

(دیوان/۱۶۰)

گردوں یعنی آسمان کو ساقی ٹھہرایا چوں کہ یہ سات ہیں اور ۱ + ۲ + ۴ سات ہوتے ہیں اس واسطے اس کے سات جام ٹھہرائے چوں کہ آسمان اُلٹے پیالے کی صورت ہے اور اُلٹا پیالہ خالی ہوتا ہے۔ کسی کو اس سے قطرہ نہیں ملتا اس واسطے آسمان سے کسی کو عشرت کے قطرے کی امید نہیں کیوں کہ وہ تو خود اوندھے اور خالی پیالے ہیں۔

(۳۲) ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

(دیوان/ ۲۲۱)

شریعت تو عشقِ الٰہی سے ہٹاتی ہے اور کفر یا بُت پرستی یعنی عشقِ الٰہی عشق کی طرف یعنی بُت خانے کی طرف کھینچتا ہے اور میں عاشق حق کعبے کو پیچھے عشق کے بُت خانے کی طرف یعنی خدا کی طرف جا رہا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ عاشقانِ خدا کعبے اور ایمان کی طرف پیٹھ کرتے ہیں اور بُت خانے یعنی دل کی طرف مُنہ ہوتا ہے۔ وہ اسی گھر میں خدا کو دیکھتے ہیں۔

(۳۳) واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہوگیا ہے غالبؔ [1]
(دیوان/۲۷۸)

سونا سوگند ایک قسم کا خالص سونا ہے۔ دوسرے معنی یہ کہ سونا قسم ہوگیا ہے۔
مراد اوّل سے ہے کہ بیداری سے رنگ زرد ہو گیا ہے۔

(۳۴) جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
(دیوان/۶۴)

مصدر دینا سے جان دی یعنی مر گئے اور دی ہوئی اسم مفعول مشتق ہیں۔

(۳۵) شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں [2]
دُکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانو
(دیوان/۱۵۰)

نازک بدنی کا مبالغہ ہے کہ خواب میں آنے سے بھی پانو دُکھتے ہیں۔

(۳۶) بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں [3]
(دیوان/۱۴۰)

میرا گھر ایسا اندھیرا ہے کہ اگر اس کی دیواروں کے سوراخ میں روئی کا پھول رکھ دیں تو وہ چاند بن جائے اور اس کی چاندنی سے گھر چاندنا ہو جائے۔ یہ معاملہ ہے کہ سیاہی میں سفیدی زیادہ چمکتی ہے اور تھوڑی سی بھی بہت دکھائی دیتی ہے جیسے کہ تھوڑا سا پانی رات کو بہت اور زیادہ سفید نظر آتا ہے اور کلوزمیں ایسی چمکتی ہے

---

[1] اگر آدمی رات بھر جاگتا رہے تو رنگ زرد ہو جاتا ہے اور سونے کا رنگ بھی زرد ہوتا ہے، اس لیے رات کو نیند نہ آنے سے خالص سونے جیسا پیلا رنگ ہو گیا۔

[2] اس درجے کے نازک کی تعریف ہے کہ اگر وہ کسی کے خواب میں بھی آجائے تو اس کے پاؤں اس طرح دُکھنے لگ جاتے ہیں جس طرح کسی کے اصلی سفر میں۔

[3] اندھیرے کا مبالغہ۔

کہ پانی نظر آتا ہے۔

(۳۷) وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے[1]

ہم سب سے ملنے جلنے والے آدمی ایسے زندہ ہیں کہ تمام کو دکھائی دے رہے ہیں سب ہم کو پہچانتے ہیں، خضر کی طرح زندہ نہیں کہ آبِ حیات پی کر لوگوں سے چور بنا پھرتا ہے یعنی چھپا پھرتا ہے، خلاصہ یہ کہ نعمت وہی لطف دیتی ہے جو یاروں کے شامل برتی جائے جیسے کہ پنجابی مقولہ ہے "یاراں نال بہاراں ہیں" اور اکیلے اعلیٰ سے اعلیٰ نعمت نہایت بے لطف ہے جیسے کہ مثل ہے اکیلا روتا بھلا نہ ہنستا۔

(۳۸) ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا[2] (دیوان/۸۰)

واقعہ یہ ہے کہ فزکس یعنی علم طبیعات کا مسئلہ ہے کہ پانی گرمی پاکر بخارات و بھاپ بن کر اوپر چڑھ جاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اجزا میں پھیل کر ہوا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کثرت سے رو کر ضعف آجاتا ہے اور آنسو خشک ہو جاتے ہیں رونے میں آنسو نہیں نکلتے صرف ٹھنڈی آہیں نکلتی ہیں اور وہ جو اندر گرم خون تھا وہ آنکھوں کے رستے آنسو بن کر نکل چکا اس سبب سے ٹھنڈے سانس نکلتے ہیں (خواجہ غالب کو تمام علوم میں کمال تھا)۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
اگر گل ہوں تو گلخن میں اگر خس ہوں تو گلشن میں[3]

گل گلشن میں چاہیے اور خس یعنی تنکے بھٹی میں، یہاں زمانے کے خلاف سے اُلٹا حال ہے کہ نیکوں کو ذلت اور بدوں کو عزت زمانے کے خلاف کی شکایت۔

---

[1] خضر کے آبِ حیات کا قصہ ہے، روشناس بمعنی سب کی جان پہچان۔
[2] یہ فزکس یعنی علم طبیعی کا مسئلہ ہے کہ پانی بھاپ بہ شکل ہوا ہو جاتا ہے۔
[3] نیک کے واسطے گل اور بد کے لیے خس یعنی تنکا۔

(۴۰) مری تعمیر میں مضمر ہے صورت اک خرابی کی
ہیولا برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا (دیوان/۴۸)

تعمیر سے مراد وجود۔ مضمر بمعنی پوشیدہ و داخل ہیولی بمعنی مجسم شے۔ دہقان نادانی اور جلدی اور کوشش سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دوکان داروں اور اہل حرفہ اور سوداگروں وغیرہ کے کاروبار اپنے اختیار میں ہوتے ہیں جس قدر جلدی اور کوشش کریں اسی قدر فائدہ ہے اور کسانوں کی کھیتی اپنے اختیار میں نہیں، آسانی اختیار میں ہے یعنی جب بارش ہوگی تب ہی بودیں گے اور جلدی کر کے تھوڑی سی۔ لوندوں میں بودیں، بیج بھی جاوے اور فصل بھی۔ اور جب تک کھیتی اچھی طرح نہ پک جائے کاٹ نہیں سکتا، اگر جلدی کاٹ لیوے تو اناج مُرجھایا اور سوکھا نکلے۔ علیٰ ہذا القیاس کسان جس قدر جلدی کرے اسی قدر اس کا نقصان ہے۔ پس خون گرم دہقان یعنی دہقان کی جلدی اس کے کھلیان پھونکنے کو بجلی کا شعلہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ جلدی انسان کو خراب کرتی ہے کہ تعجیل کارِ شیاطیں بود۔

(۴۱) غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا (دیوان/۶۵)

دوست وعزیز کی جدائی کے غم میں بڑی دل چسپ جگہ باغ کی سیر بھی بُری لگتی ہے، یہاں تک کہ گلوں کا ہنسنا جو نہایت مرغوب دل ہے، مثل رونے کے ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ سیر و تماشا بھی یاروں اور دل کی خوشی کے ساتھ ہی اچھا لگتا ہے ورنہ حسرت وافسوس ہے۔

(۴۲) شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا (دیوان/۴۶)

اس میں حرفی صنعت ہے یعنی "بت مشکل پسند" میں بھی دس حرف ہیں اور تسبیح کے شمار میں بھی دس دانے ہوتے ہیں اپنے لقب کے حرفوں کی تعداد اور صفات سے شمار کو پسند کیا یعنی جس طرح آپ ایک ایک وار میں سو سو دل کو اڑا لیتا ہے اسی طرح

سبحہ کے سو سو دانے کو شمار کا ایک ایک دانہ اڑا لیتا ہے۔ ورد و وظیفے والوں کا دستور ہے کہ جب سو دانے کی پوری تسبیح پھیر لیتے ہیں تو شمار کا ایک دانہ سرکا دیتے ہیں۔ انھیں شمار کے دانوں کے حساب سے بیسیوں تسبیح پھیر لیتے ہیں۔ چوں کہ ایک ایک ہاتھ میں سو سو دل کا اڑا لینا اس کثرت سے خوں ریزی بہت مشکل ہے اس واسطے مشکل پسند کہا اور حُسن دلوں کا شکاری ہے، دلوں کو مفت کا مال سمجھتا ہے بقول وزیر:

کہتا ہے دل مرا کفِ رنگیں پہ رکھ کے یار
کیا مال مفت آیا ہے دردِ حنا کے ہاتھ

اور جو لوگ شمار سبحہ کے معنی تسبیح پھرانے کے لیتے ہیں وہ علاوہ صناعی اور مطلبی غلطی محاورے کی کرتے ہیں کہ محاورے سبحہ کے ساتھ گردانے اور پھرانے کے ہیں مثلاً: "اس کے نام کی سبحہ گردانی کرتا ہوں" "تمھارے نام کی تسبیح پھیرتا ہوں" صنعت حرفی میں ان کا ایک شعر پہلے بھی نصیحتانہ اشعار میں آخر کا آچکا ہے اور تین حرف سے اصطلاح لعن کی اور چار حرف سے لعنت کی عام اشعار میں بہت ہے۔ دیوان ظفر کے ردیف میں پوری غزل ہے اسی صنعت میں اوصاف کا یہ شعر ہے:

آرسی میں عکس اپنا دیکھ کر لائے غرور
چار دن کی زندگی میں خود نمائی کر گئے

آرسی میں چار حرف ہیں اس خوبی سے اگلے مصرع میں چار دن کہا۔ چار حرفی آرسی زبانِ حال سے بتا رہی ہے کہ میرے حرفوں کی تعداد کے موافق تیرا حُسن جوانی چار دن کا ہے اس پر غرور عبث ہے۔

(۴۳) گرنی تھی ہم پہ، برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر (دیوان/۹۳)

انسان خود ذاتِ باری ہے اور (اس میں) سما گیا ہے اور کوہِ طور پر اس نے ذری اپنے نور کی تجلی ڈالی تھی وہ کم ظرفی سے جل گیا۔ پس اس کی تجلیات بلکہ خود اس کی ذات کو اپنے میں سما لینے والا انسان ہی ہے اور اس کو اس کی ذری سی بھی چمک کی تاب

نہیں۔ بقول درد:

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

(۴۴) غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم (دیوان/۱۱۱)

آزاد لوگ دنیاوی سامان کے نہ ہونے سے غرض نہیں رکھتے، اگر کچھ دل میں خیال اگر غم ہونا بھی ہے، اس غم کے گھر کو وہ بجلی کی چمکارے سے روشن کر لیتے ہیں یعنی جانتے ہیں کہ زندگی کا عرصہ بہت قلیل ہے جیسے کہ بجلی کا چمکا۔ پس بجلی کی چمک دیکھ کر زندگی کی ناپائداری کا خیال کر کے غم کے اندھیرے کو روشن کر لیتے ہیں گویا بجلی ہی ان کے اندھیرے کی روشنی ہے کہ اس کی ناپائداری سے ان کا غم دور ہوتا ہے۔

(۴۵) ضعف سے ہے، نے قناعت سے یہ ترک جستجو
ہیں وبال تکیہ گاہ ہمت مردانہ ہم (دیوان/۱۱۱)

تلاش مال اور مرتبے کا ترک کرنا، نامردی اور ناتوانی اور نادانی سے ہے جس کا نام دل کی تسلی کے لیے قناعت اور توکل رکھ لیا ہے۔ قناعت اور توکل کے بہانے سے ہم مردانہ ہمت کے آسرے کا وبال بن گئے ہیں یعنی قناعت سے کم ہمت اور نامرد بن کر سست اور نکمے نہ ہونا چاہیے بلکہ مردانہ ہمت کر کے ہر امر میں تلاش اور کوشش کرنی چاہیے۔ کسی پر اپنا بوجھ ڈالنا نامردوں کا کام، اور اوروں کا بوجھ اپنے سر پہ لینا عالی ہمت مردوں کا کار ہے۔

(۴۶) دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے (دیوان/۲۰۵)

انسان کی اصلی غرض دوست یعنی خدا کا حاصل کرنا ہے مگر انسان نے اس اصلی مطلب کو جہالت سے فوت کیا کہ انسانوں کی دشمنی میں الجھ گیا۔ اس الجھاؤ اور عداوت و دشمنی میں پڑ کر دوست کی طلب اور ملاقات سے محروم رہا اور اگر چشم معرفت ہوتی

تو دوست کی طلب وتلاش کے سوا اور طرف دھیان نہ کرتا اور کسی کو دشمن نہ جانتا بلکہ دشمن کو بھی دوست ہی جانتا، بقول درد :

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ

جب کہ سب چیزیں دوست ہے تو کوئی بھی غیر اور دشمن نہیں، بقول ناسخ :

صفحۂ ہستی میں صورت ہی نہیں اغیار کی
ہر مرقع میں ہیں تصویریں بس اپنے یار کی

(۴۷) ہے بارے اعتماد وفاداری اس قدر
غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے (دیوان/۱۶۴)

دوست جو یار ے برنامہربان ہے یعنی جور وجفا کرتا رہتا ہے اس میں اس کو ہماری وفاداری کا پورا پورا بھروسا ہے کہ ہمارے ہر جور و جفا بخوشی سہے گا، اس لیے ہم اس کے جور و جفا بخوشی سہتے ہیں کہ شکر ہے اس کو ہماری وفاداری کا پورا بھروسا ہے۔

(۴۸) گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے (دیوان/۱۶۷)

جب کہ عام فہم یہ بات ہوگئی کہ جو شخص راز عشق رکھتا ہے وہ خاموش رہتا ہے تو خاموشی میں اخفائے راز نہ ہوا بلکہ افشائے راز ہوا۔ اس نازک خیالی سے میں بولتا رہتا ہوں تاکہ کسی کو اخفائے کا گمان نہ گزرے پس میرا بات کرنا عام سمجھ کے نزدیک حال کا چھپانا ہے اس وجہ سے میں بولنے اور بات کرنے میں خوش ہوں کہ میرا مطلب سمجھنا بہت مشکل ہے کہ بھید چھپانے کو بولتا رہتا ہوں۔ اس مضمون کی تائید میں انھیں کا یہ شعر ہے :

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے (دیوان/۱۸۵)

مومن : مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم
کچھ حال ہی ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

یعنی خاموشی کی حالت کہہ رہی ہے کہ کچھ راز عشق کا اخفا ہے۔

(۴۹) عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے (دیوان/۲۲۱)

محبوب اس بات میں خوش ہے کہ سوائے عاشق اور معشوق کے کوئی ان کے عشق سے واقف نہ ہو، سو یہ بات ہمارے میں ہے کہ ہجر و غم کے ہزارہا صدمے جھیلتے ہیں۔ پر اس راز کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دیتے اور سب عاشقوں میں نامی مجنوں گزرا ہے مگر اس سے صدموں کی برداشت نہ ہو سکی، چلّا اٹھا اور جنگلوں میں دیوانہ ہو کر لیلیٰ لیلیٰ کہہ کے اپنی مٹی اٹھائی اور پردہ نشیں لیلیٰ کی خاک اڑائی۔ اس راز کی خاک اڑائی۔ اس راز کی پاسداری سے لیلیٰ مجھ کو عشق میں اچھا اور مجنوں کو بُرا کہتی ہے۔ بھید چھپانے والے کی بڑی قدر اور ہیبت ہوتی ہے۔

(۵۰) تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا[1] (دیوان/۶۱)

مذاق اس میں ہے کہ عاشق کو اپنے پُرزے اڑتے دیکھنا ایک آسان کھیل اور عمدہ تماشا ہے کہ قاتل کی صورت تو دیکھیں گے اور تلوار کے مزے لیں گے۔

(۵۱) بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل[2]
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا (دیوان/۴۴)

خدا نے دنیا میں اپنی ایک ایسی دل چسپ محفل لگائی ہے، جو شے یہاں سے جاتی ہے، روتی چلاتی اور پریشان جاتی ہے۔ مرنا اس واسطے کٹھن ہے کہ اس کی بزم دنیا چھوٹتی ہے جیسے کہ ناسخ کا پہلا یہ عارفانہ شعر گزرا ہے

طرفہ گل اس باغ میں ہے اور شبنم ہے عجیب
ہنس کے بیٹھا جو تری محفل میں وہ رو کر اٹھا

---

[1] ہم متکلم ہے۔ اور غالب کو غائب جاتا ہے مراد دونوں جگہ غالب سے ہے۔
[2] سب کو پریشان میں شامل کیا ہے۔

(۴)

دوسرا چمن "اشعار محاورات میں" ہے، اس کے آغاز میں مولف نے لکھا ہے:

"ابتدا اردو زبان کی شاہ جہاں شاہ دہلی کے عہد سے ہے اور شاہ عالم ثانی کے عہد میں یہ مشہور شاعر دہلوی صاحب دیوان مستند استاد ہوئے ہیں جن سے اردو زبان کا زور و شور ہوا میر تقی، مرزا رفیع سودا، خواجہ میر درد، ان کے بعد غلام ہمدانی مصحفی، انشاء اللہ خاں، قلندر بخش جرأت، پھر بہت سا اکبر شاہ ثانی کے زمانے سے ظفر کے زمانے تک۔ اردو کو ان مستند اساتذہ صاحب دیوان ابراہیم ذوق، میرزا اسد اللہ غالب، حکیم مومن خاں، شاہ ظفر دہلوی، اور امام بخش ناسخ و حیدر علی آتش لکھنوی نے مانجھا ہے اس لیے اشعار محاورات ان مستند اساتذہ کے بہ ترتیب لیے گئے۔ اور چونکہ اردو زبان دہلی لال قلعے کی فصیح تھی۔ خاص کر اس میں شاہزادوں کی بموجب اس کے کہ کلام الملوک ملوک الکلام اس لیے شاہ ظفر کا کلام زیادہ لیا گیا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دیوان ظفر دراصل شاہ ظفر کے استاد کامل حضرت ذوق کا ہے کیونکہ انھوں نے اکثر آپ غزلیں کہہ کے شاہ ظفر کا تخلص دیا ہے جیسا کہ آبِ حیات میں مذکور ہے اور باقی غزلیں ان کی اصلاح سے ہیں ....."

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا (دیوان/۴۱)

موئے آتش دیدہ کنڈلی دار بال کو کہتے ہیں جیسا کہ ناسخ کے اس شعر سے ثابت ہے:

لہ موئے آتش دیدہ۔ آگ کی سینک لگا ہوا بال، مراد زلف کا کنڈلی دار بال جو آتشیں رخ کی سینک سے مڑ گیا ہے۔

(۵۲) ہجر میں میرا بدن کاہیدہ ہے
سوزِ غم سے موئے آتش دیدہ ہے

اس وجہ سے۔ یہاں موئے آتش دیدہ سے مراد زلف کے کنڈلی دار بال ہیں جو روئے آتشیں کی سینک سے مڑ گئے ہیں۔ ہم زلف کے سودا میں سودائی ہو کر قید میں آئے تو یہاں بھی پانو کی زنجیر کنڈلی دار زلف کی صورت ملی۔ اس لیے ہم یہاں بھی زلف کی زنجیر میں اسیر بے قرار ہیں، بقول ظفر:

اور سودا ہوگا افزوں، یاد آئے گی وہ زلف
لاؤمت آہن گرو زنجیر میرے روبرو

(۵۳) نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا[1] دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا (دیوان/۴۷)

نیستاں بمعنی بانسوں کا بیڑ۔ نیستاں کا ریشہ ہونے سے مراد الغوزہ مثل بنسری بن جانا جیسے کہ الغوزے سے نالے کی آواز نکلتی ہے اسی طرح تنکے سے آواز نکلی۔

(۵۴) دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں[2] کا (دیوان/۴۷)

فرصت کے لفظ میں یہ خوبی ہے کہ سروِ چراغاں ہمیشہ روشن نہیں ہوتا صرف محرم کے عشرے میں اس کی روشنی کا تماشا ہوا کرتا ہے اور یہ روزِ غمی کے کہلاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا دل ماتم سرا کا سروِ چراغاں ہے اگر ہمارا یار کسی موقع پر دیکھنا چاہے گا تو دکھلا دیں گے۔

---

[1] دانتوں میں تنکا لینا۔ جان کی پناہ یا امان چاہنا۔ رحم دلانے کو عاجزی کرنا کہ میں تیری کالی گوؤ ہوں۔

[2] سروِ چراغاں۔ ایک لوہے کا جھاڑ ہوتا ہے جس میں صدہا لوہے کے دیے بنے ہوتے ہیں جن میں تیل بتی ڈالتے ہیں۔

(۵۵) نہیں[1] معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا میری[2] مژگاں کا (دیوان/۴۸)

کس کس سے مراد دل اور جگر ہیں کہ آنسوؤں کے خون سے بنے ہیں۔

(۵۶) قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل بچوں کا[3] ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

(لڑکوں کا دیوان/ ۶۱)

اس شعر میں گریہ کا مبالغہ ہے، دیدۂ بینا بمعنی عارف کی آنکھ۔ عارفوں کو ایک دانے میں خرمن اور قطرے میں دریا یعنی جزو میں کل نظر آتا ہے کہ جزو ہی سے بڑھتے بڑھتے اس کا کل بن جاتا ہے۔ یہ شعر ذوق کے اس شعر کے مضمون پر ہے جس کی شرح ذوق کے عارفانہ شعر میں گزری ہے[4]

(۵۷) سرمست نظر[5] ہوں، مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

مفت چیز کا احسان مول کی چیز سے بھاری ہے اور بیش قیمت ہے مذاق یہ ہے جس خریدار کو سرمہ فروش ایک دو سلائی بطور بانگی کے مفت دیتا ہے وہ اس مفت کے احسان میں دب کر کچھ نہ کچھ خرید ہی لیتا ہے۔

---

[1] لہو پانی ہونا۔ سخت مصیبت جھیلنا رنج و غم میں جان کھپانا۔

[2] اصل میں 'میری' ہی ہے مگر تیری مژگاں ہونا چاہیے اور اس صورت میں شارح کا مفہوم باطن ہو جائے گا۔

[3] لڑکوں کا کھیل۔ بہت آسان کام سمجھنا، سرسری جاننا۔

[4] ذوق : دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو
جز میں آتا ہے نظر کل کا تماشا ہم کو

[5] سرمہ مفت نظر۔ وہ سرمہ جو سرمہ فروش بانگی کے طور پر ایک دو سلائی لگانے کے واسطے خریدار کو مفت دیتا ہے مراد مفتی نعمت۔

(۵۸) لو ہم مریض عشق کے بیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا[1] علاج

بیمار دار۔ بیمار کے علاج کرنے والے کو اور ٹہل کرنے والے کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ عشق کا مرض مسیحا سے بھی نہیں جاتا ثبوت یہ کہ بت پرستوں کو بتوں کے عشق سے ہر چند بڑے بڑے معجزے دکھا کر ہٹایا مگر وہ نہ ہٹے یعنی ان کا مرض عشق نہ گیا۔ بلکہ مریض عشق ہی ان کی جان کے دشمن ہو گئے۔ یعنی سولی دینے لگے یہ مشکل سے جان بچا کر چوتھے آسمان پر جا چڑھے۔ ذوق:

چرخ پہ بیٹھا رہا جان بچا کر عیسیٰ
ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا

(۵۹) وا حسرتا کہ یار نے کھینچا[2] ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر (دیوان/۹۲)

جب قاتل نے دیکھا کہ میرے قتل سے مقتولوں کو لذت آتی ہے تو قتل ہی چھوڑ دیا ہے یعنی اس کو اپنے شوق سے سروکار نہیں۔ ہماری بے لطفی و محرومی وایذا سے کار ہے۔ کس لطف سے قاتل کو قتل سے ہٹا کر اپنی قوم کو بچایا ہے۔

(۶۰) اچھل[3] کے دیکھ نہ چل اس قدر تو اے سرکش
کہ تیرے ساتھ ہے فوارہ ساں نشیب و فراز

(یہ شعر دیوان غالب میں نہیں ہے)

جس طرح فوارے کا پانی اوپر چڑھ کے نیچے آپڑتا ہے اسی طرح سرکش اچھل کے سر کے بل گر جاتا ہے۔

---

[1] کیا علاج۔ کیا سزا۔
[2] ہاتھ کھینچنا۔ ہٹ جانا، بند ہو جانا۔
[3] اچھل کر چلنا۔ اپنی بنیاد سے بڑھ کے چلنا اپنی حیثیت سے بڑھ کر چلنا۔

(۶۱) ایسا آساں نہیں لہو رونا[1]

دل میں طاقت جگر میں حال کہاں (دیوان/۱۱۳)

رونے کے واسطے دل میں طاقت اور جگر میں حال یعنی وجد کی طاقت ہونی چاہیے۔ جب یہ نہ ہوں رویا نہیں جاتا یعنی اب ایسے ناتواں ہو گئے ہیں کہ رونے کی بھی طاقت نہیں رہی۔

(۶۲) سر کھجاتا ہے[2] جہاں زخم سر اچھا ہو جائے

لذت سنگ باندازۂ تقریر نہیں (دیوان/۱۲۰)

عشق کے پتھر کی چوٹ میں وہ مزا ہے کہ بیان نہیں کیا جاتا اگر اچھا ہو جاتا ہے تو پھر چوٹ کھانا چاہتا ہے۔

(۶۳) کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ[3] لوگ

ہم کو جینے کی بھی امید نہیں (دیوان/۱۲۲)

زندگی قائم رکھنے کے لیے امید کو پیش نظر رکھتے ہیں اور ہم زندگی سے بیزار ہیں اس کے لیے امیدواروں کی انتظاری کے عذاب کیوں دیکھیں۔ الانتظارُ اشد من الموت۔

(۶۴) دل نہ دوں اپنا کبھی میں تیرے کافر ہاتھ میں

تو کلام اللہ[4] بھی گر آئے لے کر ہاتھ میں

(یہ شعر دیوانِ غالب میں نہیں ہے)

تو دل کو لے کر صاف مکر جانے والا ہے اس لیے قسم وسوگند سے تیرا اعتبار نہیں سنگدلی کی رو سے کفر کہا اور کافر کو قرآن پر ایمان نہیں ہوتا جب اس کو اس پر خود ایمان

---

[1] لہو رونا۔ نہایت زار زار رونا، اندوہ وغم میں ایسا رونا کہ سُرخ آنسو ٹپکنے لگیں۔

[2] سر کھجانا۔ پٹنے کو جی چاہنا، زخمی ہونے کی خواہش کرنا۔

[3] امید پر جینا۔ تنگ دستی میں فراغتی اور غمی میں خوشی کی امید پر دل کی تسلی کرنا تسلی دینے کے موقع پر بولتے ہیں۔

[4] کلام اللہ ہاتھ میں لے کر آنا۔ قرآن شریف کی قسم کھانا۔

نہ ہو تو دوسرا اس کی اس قسم پر جس پر اسے خود ایمان نہیں کیوں کر ایمان لاوے۔

(۶۵) رو[1] میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں (دیوان/۱۲۵)

عمر کا گھوڑا سرپٹ جا رہا ہے نہ تو سوار کے ہاتھ میں باگ ہے اور نہ پانو رکاب میں ہے جس سے روکے یعنی کوئی اختیار نہیں ہے منزلِ موت پر ہی جا کر تھمے گا یعنی ٹھہرے گا۔

(۶۶) جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر[2] باد نہیں (دیوان/۱۳۳)

مسلمانوں میں رسم ہے کہ جب مہمان یا کوئی سفر سے آتا ہے تو مرحبا کہتے ہیں اور جب جاتا ہے تو خیر باد کہتے ہیں۔ یہاں آنے کی خوشی اور نہ گئے کا غم۔

(۶۷) تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں[3] (دیوان/۱۳۳)

جب پانو کو حنا لگاتے ہیں۔ تو چلتے پھرتے نہیں، ایک جگہ ٹکے بیٹھے رہتے ہیں اس واسطے پابہ حنا کے معنی ٹکے ہونے کے ہیں یعنی عمر ایسی تیز رفتار ہے کہ اس کے مقابل میں بجلی کو قیام معلوم ہوتا ہے یعنی بجلی تو کچھ دکھلائی بھی دیتی ہے یہ دکھلائی بھی نہیں دیتی اور جھٹ پٹ گزر جاتی ہے۔

(۶۸) کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے[4] چلا کیے (دیوان/۱۷۴)

عاشقانِ خدا پر ہمیشہ تہمتیں اور جور و جفا ہوتے چلے آئے ہیں دیکھو حضرت زکریا

---

[1] رو میں ہونا۔ گھوڑے کا سرپٹ دوڑنا۔
[2] خیر باد۔ کلمہ دعائیہ، کسی عزیز کو رخصت کے وقت کہتے ہیں۔
[3] باندھنا۔ شعر میں لانا، نظم میں لانا، کسی سے تشبیہ دینا۔
[4] آرے چلنا۔ آفتیں، مصیبتیں جھیلنا، زخم، صدمے، رنج اٹھانے۔

پیغمبر کو آرے سے چروایا منصور کو سولی چڑھایا، شمس تبریز کی کھال اتروائی۔

(۶۹) ہاں بھلا[1] کر ترا بھلا ہو گا

میں نہیں جانتا دعا کیا ہے[2] (دیوان/۱۸۲)

اپنی بہبودی کی دعا مانگنا اور لوگوں سے منگوانا کچھ فائدہ نہیں، فائدہ مند اگر ہے تو یہی بات ہے کہ اگر تو اپنا بھلا چاہے تو کسی کا بھلا کر اس کے عوض میں ضرور تیرا بھلا ہو گا۔

(۷۰) لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے[3] (دیوان/۱۸۷)

اس شعر کا مطلب بھی وہی ہے۔ جو پیچھے ۶۸ ویں شعر میں سر پر آرے چلنے کا ہے۔

(۷۱) خستگی کا تم سے کیا شکوہ کریں

ہتھکنڈے[4] ہیں چرخ نیلی فام کے

(کیا شکوہ کہ یہ۔ نسخہ مالک رام/ ۲۰۰)

سیاہ رنگ آدمی کی برائی میں کہا کرتے ہیں کہ جیسے یہ اوپر سے سیاہ ہے ویسا ہی اندر سے ہے پس آسمان اندر باہر سے سیاہ ہمارا دشمن ہے۔ جس نے ہم کو تم سے زخمی کرایا۔

(۷۲) اسد خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے[5]

کہا جو اس نے ذرا میرے پانو داب تو دے (دیوان/۲۰۹)

---

[1] کر بھلا ہو بھلا۔ ہر ایک سے بھلائی اور نیکی کرنے کی نصیحت پر بولتے ہیں۔

[2] اصل میں دوسرا مصرع غلط لکھا گیا ہے، یوں ہونا چاہیے:

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا — اور درویش کی دعا کیا ہے

[3] قلم ہونا۔ کٹنا۔

[4] ہتھکنڈے۔ چالاکیاں، داؤ گھات، فند و فریب۔

[5] ہاتھ پانو پھول جانا۔ خوشی یا خوف کے مارے ہاتھ پانو کا بیکار ہو جانا، ہاتھ پانو کا نہ چلنا۔ غالب کا دوسرا تخلص اسد تھا۔

جب اس عزیز نے مجھے اپنے پانو دبانے کی خدمت کو کہا تو مجھے شادی مرگ ہو گئی کہ میرے کم بخت ہاتھ پانو پھول گئے، اگر مراد کو پہنچا تو بد قسمتی دیکھو کہ مراد ہاتھ آنے سے رہ گئی۔

(۷۳) اے پرتو خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے[1] (دیوان/۲۳۵)

سایہ سیاہ ہوتا ہے اور جس پر وقت پڑتا ہے وہ بھی رنج و غم سے سیاہ پڑ جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر خدا کا پرتو پڑ جائے تو ہم بھی روشن ہو جائیں۔

(۷۴) واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی[2] (دیوان/۲۳۶)

واعظ، زاہد وغیرہ بہشتی شراب طہور کی تعریف ایسے مبالغے سے کرتے ہیں کہ سُن کر منہ میں پانی بھر آتا ہے مگر ہے خیالی پلاؤ۔

اس طرح اس کتاب میں (۴۷) اشعار کی شرح ملتی ہے۔ بعض اشعار کا مطلب شارح نے غلط بھی بیان کیا ہے اور بعض جگہ سیدھا اور سامنے کا مفہوم چھوڑ کر دور از قیاس مطلب پیدا کیا ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ شرح ابیات دل چسپ ہے اور اس سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ خود غالب کے ہم عصر اور قریب العہد لوگ اس کے کلام کو کس طرح سمجھتے تھے اور لفظی و معنوی خوبیوں کی کُنہ کو کہاں تک پہنچے تھے۔

(فروری ۱۹۶۹ء)

۱؎ وقت پڑنا۔ آفت پڑنا، مصیبت پڑنا۔

۲؎ کیا بات ہے، طنزاً کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ کیا کہنے، کیا خوب، واہ واہ، مراد یہ کہ کچھ بھی نہیں، دھوکے کی بات ہے، فرضی اور خیالی پلاؤ ہے۔

غالب اور ریاض الافکار

(۱)

ریاض الافکار[1] مؤلفہ وزیر علی عبرتی عظیم آبادی فارسی کے نثر نگاروں کا تذکرہ ہے۔ اس میں ۱۰۴ نثر نگاروں کے مختصر تراجم اور اُن کی نثر کے نمونے شامل ہیں۔ وجۂ تالیف کے ذیل میں عبرتی لکھتا ہے:

"... وزیر علی عظیم آبادی متخلص بہ عبرتی ... چنیں عرضہ دہ می گردد کہ ایں دلدادۂ سلمائے سخن رابیشتر اوقات دل و دیدہ وقفِ مطالعہ منشاتِ شیریں بیانانِ ہند ... ماندے، ازاں جریدہ پُرسوز وگداز ہر رقعہ را کہ چیزے بزرگِ جاں نشتر زن یافتے با بعضے مختصر مکاتیبِ ہمعصرانِ خود، نظر بملامتِ ابنائے زماں، باختصارِ تمام سوادش بقرطاس پارہ ہا برمی گرفتے، و نبذے از حالِ خجستہ مآلِ (۲ب) آں معنی پژوہان بقدرِ فہمِ نارسا از روے تذکرہ ہا مثلِ یدِ بیضا و سروِ آزاد و مرآت الخیال و ریاض

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

Supplement to the Catalogue of the Persian Manuscripts In the Oriental Public Library at Bankipore. Vol.1 pp. 48-61 (Patna 1932

الشعرائوغیرہ ذٰلک نیز دریافتہ ضمیمہ مکتوب شان می ساخت، اما ازسخت گیری روزگار و ہجوم انواعِ اضطرار، کجا سررشتہ جمعیت بکف می اُفتاد کہ درصدد انتظامش می شد، مگر درین زمان کہ سنہ یک ہزار و دوصد و شصت وہشت (۱۲۶۸) از ہجرت نبوی است و محرر اوراق بہزار کلفت بدگر دیار از وطن آمادۂ گرم روی است نخواست کہ ہمچو طومار عالیہ اندوختہ سالہا را رایگان دہد، ناگزیر آن جملہ مکاتیب را بقیدِ حروفِ تہجی مشتمل بر بست وہشت خیابان زیب انتظام دادہ بہ "ریاض الافکار" مسمٰی ساخت....."

ان ۱۰۴ نثر نگاروں کے تراجم میں مندرجہ ذیل نام بھی ملتے ہیں :

میر احسن علی احسن لکھنوی (۴ ب) محمد صادق خاں اختر (۵ ب) سراج الدین علی خاں آرزو (۶-الف) اوجاگر چند اُلفت (۹ ب) پیارے لال اُلفتی (۱۰-الف) امرت لال (۱۱ ب)، امیر حسن بسمل کاکوروی (۱۳-الف) مہدی علی بسمل فتح پوری (۱۴-الف) خواجہ حسین میرزا ثنائی (۱۸ ب) داراب بیگ جویا (۲۰ ب) شیخ غلام علی راسخ (۲۹-الف) شبر خاں لودی (۳۸-الف) طالب آملی (۴۱ ب) عرفی (۴۶-الف) ناصر علی سرہندی (۴۷-الف) اسد اللہ خاں غالب (۴۷-الف) محمد اکرم غنیمت کنجاہی (۴۸-الف) محمد محسن فانی کشمیری (۴۹-الف) ابوالقاسم کاہی (۵۳ ب) ابوطالب کلیم (۵۴-الف) راجا رام نراین موزوں (۵۷-الف) منیر لاہوری (۵۷-الف) نصیرای ہمدانی (۶۰-الف) امیر علی نوائی (۶۱-الف) ہمایوں بادشاہ (۶۶-الف)۔

اس تذکرے کے بہت کم نسخوں کا علم ہے، ایک خطی نسخہ کتاب خانۂ خدا بخش پٹنہ میں محفوظ ہے[1] دوسرا نسخہ محبِ مکرم ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

۱؎ ملاحظہ ہو کتب خانۂ بانکی پور کی فہرست کا ضمیمہ جلد اول صفحات ۴۸ تا ۶۱۔ فہرست نگار نے نسخۂ خدا بخش کی خاصی تفصیل دی ہے۔

کے ذخیرۂ کتب میں ہے[1]۔ مؤخر الذکر ۶۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کا مسطر ۱۳ سطری خط شکستہ شفیعا آمیز، روشنائی متن کی سیاہ اور عنوانات کی شنگرفی ہے۔ سائز ۷×۱۱ ہے یہ جس مجلد میں ہے اس میں مندرجہ ذیل نسخے بھی شامل ہیں :

۱۔ مکاتبات عبرتی (۱۲۵۹ھ) ۲۔ رسالہ در قواعد مضاف مضاف الیہ وغیرہ از عبرتی (۱۲۵۹ھ) ۳۔ رسالہ رفیع الدین فی قواعد الشعر (عربی) ۴۔ رسالہ فی التعریب لمحمد بن سراج الدین المنشی (عربی) ۵۔ مزیل الاغلاط فی اغلاط القاموس والصراح لمحمد حبیب اللہ (عربی) ۶۔ عطیہ کبریٰ۔ سراج الدین علی خاں آرزو ۷۔ موہبۂ عظمیٰ۔ سراج الدین خاں آرزو ۸۔ رسالہ در بیان حروف تہجی مع فوائد دیگر۔

اس تذکرہ میں مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کا ترجمہ بھی شامل ہے (ورق ۴۸ الف) اور ظاہر ہے کہ یہ اُن کی زندگی ہی میں لکھا گیا ہے، غالب کی نثر کے نمونے کے طور پر اُن کے ایک فارسی خط کا اقتباس پیش کیا گیا ہے۔ یہ خط کلیات نثر غالب میں موجود ہے، مگر ہم اُس کی متعلقہ عبارت یہاں اس لیے نقل کر رہے ہیں کہ اس میں نسخۂ مطبوعہ سے بعض اختلافات بہت اہم پائے جاتے ہیں۔ ہم نے مقابلہ کلیات نثر غالب کے اس مطبوعہ نسخے سے کیا ہے جو مطبع منشی نولکشور سے جنوری ۱۸۶۸ء میں چھپا تھا۔

وزیر علی عبرتی کی ملاقات کبھی غالب سے نہیں ہوئی، لیکن وہ غالب کا ذکر بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ کرتا ہے، غالب کے بارے میں اُن کے معاصر تذکروں میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے ذیل میں ریاض الافکار کی مندرجہ عبارت بہت اہمیت رکھتی ہے۔

(۲)

ترجمۂ غالب

(۴۷۔ الف) غالب : اسم منیف آں میر آہنگ قافلۂ نغز کلامانِ ہند میرزا اسد اللہ

---

[1] میں نے اسی نسخے سے استفادہ کیا ہے، میں ڈاکٹر آرزو کا تہِ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے یہ نسخہ مستعار دیا اور اُس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

خاں، مولدِ حمیدہ بنیادش خاک جوہر خیز دار السلطنۃ دہلی[1] (۲، ۴ ب)، بتقریبے[2] از وطن بالوف بکلکتہ پیوستہ، مذاق نشناسان کلکتہ بہ سیف لسانی و مؤشگافی آن سخن رس نکتہ پیوند خار حسرت در دلہا شکستہ، در صدد آویزش باآن مغتنم روزگار گشتہ[3]. خصوصاً مرزا امان علی خاں کہ اصلا باآں مستعد روزگار جادو زبان نسبتے ندارد، ازاں جائیکہ آن معنی سگال خیلے ماہر این فن بود، بہ نیروے طبع رسا بر ہمہ غالب آمد، ہر چند من محررِ اوراق را دولتِ ہمدمی آن جانِ سخن نصیب نگشت، مگر پارۂ نظم و نثرِ آن خوش تلاش کہ از بیاض مشفقے میر ذوالفقار علی صاحب بچشم درآمد این قدر دریافت گشت کہ چہ نظم و چہ نثر، در ہمہ، بپارسی زبان اُستادِ طرزِ خاص است. ما ہم عصران را جز گوش گشتن و شنفتن کلام متینش، چہ یارائے حرف زدن، بر روے او. تا دم تحریرِ این اوراق بشاہ[4] جہاں آباد بعیش می گذارد. این رقعہ ملاعب مضمون از ان غالب عرصہ دہر است کہ خدمتِ مولوی سراج الدین احمد[5] برنگاشتہ[6]: رقعہ.

---

[1] یہ غلط ہے، غالب کا مولد دہلی نہیں آگرہ ہے۔

[2] غالب اپنی پنشن کے مقدمہ کی پیروی کے لیے کلکتہ ۱۸۲۸ء میں گئے تھے۔ (ملاحظہ ہو ذکرِ غالب/ ۵۷) طبع سوم۔

[3] یعنی غالب اور حامیانِ قتیل کا معرکہ، غالب کی سوانح کے سلسلے میں اس کی تفصیلات ملتی ہیں۔

[4] ریاض الافکار کا سالِ تالیف ۱۲۶۸ھ (مطابق ۱۸۵۲ء) ہے۔

[5] غالب کے دوست اور کلکتہ کے باشندے۔ کلیاتِ نثرِ فارسی طبع ۱۸۶۸ء/۱۲۸۴ھ میں ان کے نام غالب کے متعدد خطوط ہیں، کچھ خطوط متفرقاتِ غالب مرتبہ مسعود حسن رضوی (شائع کردہ رام پور، ۱۹۴۷ء) میں شامل ہیں۔

[6] یہاں جس خط کا اقتباس دیا گیا ہے وہ کلیاتِ نثرِ فارسی (طبع نولکشور ۱۸۶۸ء) میں صفحہ ۶۷ پر موجود ہے، مگر اس کے متن میں نہ صرف یہ کہ اختلاف ہے بلکہ کلیات میں یہ خط طویل ہے۔ اختلافات ہم نے حاشیے میں نوٹ کر دیے ہیں۔

نمونۂ نثر غالب: "اے[1] مولوی سراج الدین احمد، بترس از خدائے جہاں[2] کہ چوں قیامت قائم گردد و آفریدگار بداد نشیند،[3] من گریبان دراں[4] و مویہ کناں دراں ہنگامہ آیم، و در تو آویزم[5] کہ یک عمر مرا بمحبت فریفتی[6] و دلم بُردی،[7] و چوں من از سادہ دلی[8] بر وفائیکہ کردم، و ترا[9] از دوستاں برگزیدم نقش[10] کج باختی[11] و بامن[12] بیوفائی کردی۔[13] خدارا بگو کہ آں زماں چہ جواب خواہی داد؟ وچہ عذر پیش خواہی آورد؟ وائے بر من کہ روزگار ہا[14] در رنج گزرد و خبر نداشتہ باشم کہ سراج الدین احمد کجاست وچہ حال دارد؟ اگر جفا بپاداش وفا ست، بسم اللہ۔ ہر قدر توانی بفرمائے[15] کہ ایں جا کہ مہر و وفا فراوان است۔ لاجرم جفا نیز باید کہ فراواں باشد۔ واگر خود ایں تغافل بواسطہ[16] جرمے است کہ از من بوجود آمدہ زینہار نخست گناہ مرا خاطر نشان من باید کرد، آنگاہ[17] انتقام باید کشید، تا شکوہ[18] را میانہ گنجائی نباشد،[19] و مرا زہرۂ گفتار نبود۔ منم کہ معاشم[20] من در گونہ گونہ رنج و رنگارنگ عذاب

---

[1] کلیات: زینہار صد زینہار اے مولوی سراج الدین الخ

[2] کلیات: جہاں آفریں۔ [3] کلیات: بنشیند۔

[4] کلیات: من گریان و مویہ کنان۔

[5] کلیات: آویزم و گویم کہ این آن کس است کہ یک عمر الخ۔

[6] کلیات: فریفت۔ [7] کلیات: بُرد۔

[8] کلیات: سادگی۔ [9] کلیات: وایں را۔

[10] کلیات: نفس۔ [11] کلیات: باخت۔

[12] کلیات: بمن۔ [13] کلیات: کرد۔

[14] کلیات: روزگارہا گزرد۔ [15] کلیات: بیفزائے۔

[16] کلیات: بباد افراہ جرمے دیگر است نخست گناہ مرا خاطر نشان الخ۔

[17] کلیات: وانگاہ۔ [18] کلیات: تا شکوہ درمیاں نگنجد۔

[19] کلیات: نباشد۔ [20] کلیات: از گونہ گون رنج و رنگ رنگ عذاب۔

بہ معتاد[1] کفار می ماند، خون در جگر و آتش در دل و خار در پیراہن و خاک، (بر سر و نالہ بر لب[2]) ہیچ کافر بدین روز گرفتار مباد، و ہیچ آفریدہ[3] این خواری مبیناد۔ راست بکسے[4] می مانم کہ در صحراے[5] یاسش بگل فرو رفتہ باشد و ہر چند خواہد کہ بالا جہد نتواند و فرو رود[6]

(والسلام بالوف الاحترام[7])

---

[1] کلیات: بمعاد کفار ماند۔ [2] کلیات: ندارد۔
[3] کلیات: دشمن۔ [4] کلیات: راست بہ تنہا روے مانم۔
[5] کلیات: کہ در صحراے، پایش بگل فرو رود۔ [6] کلیات: فروتر رود۔
[7] کلیات: ندارد۔ کلیات نثر (ص ۶۷) میں یہ خط "فروتر رود" پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ وہاں بعد کی عبارت یہ ہے۔ والا قدر نواب امین الدین احمد خاں) بہادر کہ گیتی را بر ویش دیدمی و وصالش را زندگی دانستمی بکلکتہ رہگرای شد دیگر زندگی از بہر کہ خواہم؟ و دل را بہ بیدار کہ شادمان دارم؟ و اماندگی، من ازین جا توان سنجید کہ نتوانستم ہمپائیش کردن و روا داشتم او را تنہا گزاشتن، می گفت کہ در کلکتہ یکے از دوستانِ خود بمن نشان دہ، تا چوں بدان دیار برسم مرا بجاے تو باشد و غم خواری نماید گفتم حاشا کہ جز از مولوی سراج الدین این کار بر نیاید و دلم جز بوے نشکیبد چنان کہ نامہ بنام نامی شما نوشتہ بوے سپردہ ام اُمید کہ چون شما را دریابد آن مایہ مہربانی کنید کہ اندوہِ تنہائی از دلش بر خیزد و شما را بجاے من شناسد۔ والسّلام [جنوری ۱۹۶۳ء]

حادثۂ اسیری اور غالب

(ایک غزل کا زمانۂ تصنیف)

منشی نبی بخش حقیر آگرے کے رہنے والے تھے اور غالب کے اُن سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ غالب اُن کی سخن سنجی اور سخن فہمی کے بھی معترف تھے۔ اُن کے نام غالب کے ۲۷ خطوط ہیں جو نادراتِ غالب کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں[1] ایک فارسی خط پنج آہنگ میں بھی شامل ہے[2]

حقیر فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مشورۂ سخن پہلے نظیر اکبر آبادی کے صاحبزادے خلیفہ گلزار علی اسیر سے تھا۔ بعد میں غالب کے شاگرد ہو گئے۔ اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۰ء میں ان کا انتقال ہوا[3]

پنج آہنگ میں جو فارسی خط ہے وہ کلیاتِ نثر میں بھی شامل ہے۔ یہ حادثۂ اسیری کے بعد لکھا گیا ہے۔ چنانچہ یہ جملہ "دریں روزگار کہ از بندِ ستم رستگارم و بہ بندِ

---

[1] مرتبہ آفاق حسین آفاق دہلوی، شائع کردہ مشہور پریس کراچی ۱۹۴۹ء۔ اس پر قاضی عبدالودود صاحب کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔ معاصر حصہ ۱۔

[2] کلیاتِ نثر غالب، طبع اول جنوری ۱۸۶۵ء/ ۱۰۳۔

[3] تلامذۂ غالب/ ۹۴۔۹۵ نیز نادراتِ غالب/ ۳۳۔

غم گرفتار بودم"[۱] اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کے آخر میں غالب نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ کل تیموری شہزادوں میں سے ایک نے بزمِ مشاعرہ منعقد کی تھی اور شاعروں کو غزل خوانی کی دعوت دی تھی۔ مجھے اب شعر کہنے کا دماغ تو رہا نہیں، نہ طبیعت اس طرف مائل تھی مگر بندگی بے چارگی، چنانچہ خاص اسی روز، جب اُس جلسے میں جانا تھا بلکہ عین اُس وقت جب پالکی میں بیٹھا ہوا مشاعرے میں شرکت کے لیے جارہا تھا، چند اشعار بے طلب ذہن میں وارد ہوئے، وہ تمھیں بھی بھیج رہا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ تم بھی اس زمین میں غزل لکھ کر مجھے بھیجو۔

مگر نادراتِ غالب یا پنج آہنگ میں صرف یہ فارسی خط نقل ہوا ہے غزل کا پتا نہیں چلتا کہ غالب نے کون سی غزل بھیجی تھی۔ بہ ظاہر اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ غزل علاحدہ کاغذ پر لکھ کر بھیجی ہو گی اور وہ محفوظ نہ رہا۔ دوسرا زیادہ قوی قرینہ یہ ہے کہ پنج آہنگ فارسی نثر اور انشا کی کتاب تھی اس میں اردو غزل کا درج کرنا ضروری نہ سمجھا گیا ہو گا۔ نادراتِ غالب کے مرتب نے یہ فارسی خط شاید اسی بیاض سے نقل کیا ہے، جس میں غالب کے دوسرے غیر مطبوعہ خطوط تھے، کیوں کہ اس میں اُنھوں نے تاریخ کے ساتھ خط کا سنہ کتابت بھی لکھا ہے جو پنج آہنگ میں نہیں ہے (مگر انھوں نے خود اپنے ماخذ کی صراحت نہیں کی) پنج آہنگ میں اس خط کے خاتمے پر صرف تاریخ درج ہے:

"از اسد اللہ نگاشتہ ۱۶؍ ربیع الاوّل و ۲۲ فروری ہنگام نیم روز۔"[۲]

نادراتِ غالب میں اس کے ساتھ ہی قوسین میں سنہ ہجری (۱۲۶۴ھ) بھی لکھا ہوا ہے اور سنہ عیسوی مشکوک ہے[۳]۔ تقویم کے حساب سے ۱۸۴۸ء میں ۱۶؍ ربیع الاول ۲۱؍ فروری کے مطابق تھی اور دن دوشنبہ کا تھا۔ مگر میرا تجربہ یہ ہے کہ اس تقویم کے حساب

۱۔ کریم الدین طبقاتِ شعرائے ہند میں لکھتا ہے: "اِن ایام میں، یعنی درمیان ۱۸۴۷ء کے ایک حادثہ اُن پر جانبِ سرکار سے بُرا پڑا، جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق حال ہوا" (ص ۳۷۸)

۲۔ کلیاتِ نثر غالب/۱۰۳۔ ۳۔ نادراتِ غالب، (متن)/۲۰۱۔

میں ایک دن کا فرق رہ جاتا ہے۔ اس لیے ہجری و عیسوی تاریخوں کا جو تطابق غالب نے لکھا ہے اسی کو صحیح ماننا چاہیے۔ گویا یہ خط ۱۶ ربیع الاول ۱۲۶۴ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۸۴۸ء روز سہ شنبہ کا لکھا ہوا ہے۔

مجھے ایک قدیم قلمی بیاض میں غالب کا یہی خط ملا ہے[۱]۔ اس میں نہ صرف یہ کہ بعض اہم لفظی اختلافات ہیں جو پنج آہنگ میں شمول کے وقت غالب نے کیے ہوں گے[۲] بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ریختہ کی جس غزل کا اس خط میں حوالہ ہے یہ وہ مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے:

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

اس کی داخلی فضا بھی یہ غمازی کر رہی ہے کہ حادثہ اسیری سے غالب کو جو ذہنی تکلیف پہنچی تھی اُس کا ان کی شاعری پر کتنا گہرا اثر پڑا۔ غالب اس زمانے میں شعر و سخن سے دل برداشتہ ہو رہے تھے مگر قلعہ معلیٰ کا معاملہ تھا اور قلعہ لاکھ بے رونق سہی پھر بھی غالب کی امید گاہ تھا۔ اُنھوں نے طوعاً و کرہاً غزل لکھی اور عین اُس وقت موزوں کی جب

۱۔ بیاض قلمی مملوکہ راقم الحروف، اس میں کچھ اور بھی اہم خطوط ہیں، اس کا تعارف تفصیل کے ساتھ علاحدہ پیش کیا جائے گا، بظاہر یہ ۱۸۵۷ء سے کئی برس پہلے لکھی گئی ہے اور اس میں مختلف انشا پردازوں کے مکاتیب جمع کیے گئے ہیں۔ جامع کا نام، سالِ کتابت وغیرہ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

۲۔ آگے جس خط کا متن کلیات نثر/۱۰۳ سے نقل کیا گیا ہے اس کی ابتدا ایک فارسی شعر "گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام الخ" سے ہوتی ہے مگر بیاض میں یہ شعر نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر ۱۶ ستمبر ۱۸۴۸ء سے دو تین دن پہلے لکھا گیا تھا۔ پھر یہ اُس خط میں کیسے آ گیا جو ۲۲ فروری ۱۸۴۷ء کا مرقومہ ہے۔ یہ معما دوسرے موقع پر حل کروں گا۔ فی الحال صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ کلیات نثر میں شمول کے وقت اضافہ کیا گیا ہوگا۔

وہ سواری میں بیٹھے ہوئے گھر سے قلعہ کو جا رہے تھے۔ چنانچہ غزل کا یہ شعر اسی کیفیت کا آئینہ دار ہے:

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

جیسا کہ سیاق و سباق اور اس کے زمانۂ تصنیف سے ظاہر ہے، یہ حادثۂ اسیری کے بعد لکھا گیا ہے۔ قمار خانہ قائم کرنے کے الزام میں غالب دو بار ماخوذ ہوئے تھے۔ پہلی بار تو ۱۸۴۱ء میں، اُس وقت سو روپیہ جرمانہ ہوا تھا[۱] اگر ادا نہ کریں تو چار مہینے کی قید۔ یہ جرمانہ دے کر چھوٹ گئے۔ دوبارہ ۱۸۴۷ء میں پکڑے گئے[۲] قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی مجرم پہلے کسی جرم میں ماخوذ ہو کر تاوان ادا کر چکا ہو، اور پھر اُسی جرم کا ارتکاب کرے تو اب کی قید اور جرمانہ دونوں بھگتے گا۔ غالب نے بہتیرے ہاتھ پیر مارے کہ کسی طرح قید کی ذلت سے چھوٹ جائیں، قلعے سے بھی سفارش آئی، شہر کے عمائد نے بھی سعی کی مگر کسی کی پیش نہ گئی اور اس بار اُنھیں جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ وہ ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو پکڑے گئے تھے[۳] ۲ جولائی ۱۸۴۷ء کو عدالت فوجداری سے اس مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا جس میں چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو (۲۰۰) روپے جرمانے کی سزا تجویز کی گئی تھی[۴] اگر جرمانہ ادا نہ کریں تو قید میں چھ ماہ کا اور اضافہ ہو جائے گا۔ غالب نے اپنی برات کے لیے صدر میں اپیل کی مگر عدالت ماتحت کا فیصلہ بحال رہا۔

---

[۱] دہلی اردو اخبار مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء مخزونہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی۔
[۲] ذکرِ غالب (طبع سوم) ۸۲۔
[۳] امتیاز علی عرشی: قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں، مشمولہ سہ ماہی نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۸ء (اس کی خبر دو مئی ۱۸۴۷ء کے "فوائد الناظرین" میں شائع ہوئی تھی۔ یہ ماسٹر رام چندر کا اخبار تھا)۔
[۴] حسن نظامی: دہلی کا آخری سانس/ ۱۷۴۔۱۷۵۔

صرف اتنی رعایت ہو گئی کہ اگر اصل جرمانے کے علاوہ پچاس روپے اور ادا کر دیں تو مشقت مقرّری معاف کر دی جائے۔ اندازہ یہ ہے کہ غالب نے یہ پچاس روپے زائد تاوان دے دیا ہوگا، مگر وہ پورے چھ ماہ جیل میں نہیں رہے تین مہینے گزرے تھے کہ ایک دن ڈاکٹر راس سول سرجن قیدیوں کا معائنہ کرنے آئے اور اُنھوں نے غالب سے بھی تفحّصِ احوال کیا تو انھوں نے یہ شعر پڑھا:[1]

جس دن سے کہ ہم غم زدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیہ کے ٹانکوں سے سوا ہیں

سول سرجن اتنا متاثر ہوا کہ اس نے غالب کی سفارش کر کے اختتام میعاد سے پہلے ہی رہا کروا دیا۔

اس موقع پر یہ اعادہ ضروری ہے کہ غالب کی گرفتاری ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو عمل میں آئی تھی اور ۲ جولائی ۱۸۴۷ء کو عدالت فوجداری سے مقدمہ کا فیصلہ ہوا پھر غالب نے اپیل کیا۔ اس میں بھی کم سے کم تین ماہ ضرور گزر گئے ہوں گے اور تین مہینے غالب جیل میں رہے گویا وہ ۱۸۴۷ء کے اواخر میں یا ۱۸۴۸ء کے اوائل میں قید سے رہا ہوئے اور یہ خط اُنھوں نے فروری ۱۸۴۸ء میں (گویا رہائی سے ایک یا ڈیڑھ ماہ کے بعد ہی) لکھا ہے۔ اس پس منظر میں مذکورہ غزل کے یہ شعر خاص طور سے غور طلب ہیں:

دے وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا، غالب دشمن آسماں اپنا

یہ غزل ۱۸۴۱ء والے پہلے ایڈیشن اور ۱۸۴۷ء والے دوسرے ایڈیشن میں

---

[1] کلام عاصی (طبع دہلی) ۲۶۳۔

شامل نہیں ہے[1] لیکن دیوانِ غالب مطبوعہ ۱۸۴۷ء کا جو نسخہ کتاب خانہ رام پور میں ہے، اس کے آخر میں غالب کا وہ کلام نقل ہوا ہے جو اس دیوان کی اشاعت کے بعد غالب نے کہا تھا[2] اس میں یہ غزل بھی شامل ہے۔ اس زمانے میں غالب نے اور جو غزلیں کہی تھیں، ان میں یہ اشعار بھی اسی ذہنی فضا کو پیش کرتے ہیں[3]:

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

تنگیِ دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

---

[1] دوسرا ایڈیشن مطبع دارالسلام، حوض قاضی دہلی سے مئی ۱۸۴۷ء میں چھپا تھا۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ دہلی یونیورسٹی میں تھا، لیکن اب وہاں سے غائب ہو چکا ہے۔ مگر اس کی ایک نقل رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اشاعت کے لیے دیوان کا مسودہ غالب بہت پہلے تیار کروا چکے تھے ورنہ ذکر اس پری وش کا الخ، اس میں ضرور شامل ہونی چاہیے تھی۔

[2] امتیاز علی خاں عرشی: دیوانِ غالب نسخۂ عرشی/ ۹۶-۹۷۔

[3] عرشی نے حادثۂ اسیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "غرض اس کانٹے کے چبھنے سے بھی ان کا بہت سا خونِ دل کاغذ کے صفحوں پر بہا اور ہمارے لیے متعدد شاہکار نقش باقی رہ گئے"۔

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گراں باریِ زنجیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں[1]

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے[2]
ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

---

[1] اس غزل کے بارے میں غالبؔ نے نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کو لکھا تھا۔ "جب بادشاہ دہلی نے مجھے نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاریِ سلاطینِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر لکھی" (مکاتیب غالب)۔ اس لحاظ سے یہ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کے بعد لکھی گئی۔

[2] اس شعر کے بارے میں ۲۴ اگست ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں قاضی عبدالجمیل جنون کو غالبؔ نے لکھا تھا: "اس میں کوئی اشکال نہیں، جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا۔ خدا جانے شہر میں یا نواحِ شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ پردیس چلا جائے" (خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد، ص ۱۲۷)۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

اُس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے[1]

پُرہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے
خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

---

[1] ملاحظہ ہو نادراتِ غالب/۱۲، نیز نسخۂ عرشی/۳۶۳۔ یہ غزل ۱۱ مئی ۱۸۵۱ء کے دہلی اردو اخبار میں چھپی تھی اور اسے حقیر کے پاس بھیجتے ہوئے غالب نے لکھا تھا: "داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اُس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور؟"

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقّع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے تاکا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گُسار ہوتا
ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
غالبؔ تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

یہ سب غزلیں ۱۸۴۷ء کے بعد کی لکھی ہوئی ہیں اور اگر غالبؔ کے حادثۂ اسیری کا پورا واقعہ کسی کے ذہن میں ہو تو وہ اُن کے بین السطور میں غالبؔ کے اُن جذبات و احساسات کا اندازہ کر سکتا ہے جنھوں نے غالبؔ کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا تھا:

"میں ہر اک کام خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئینِ عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ، آستانۂ رحمۃ للعالمین، دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اِس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے، اور بغیر اس کے کہ کوئی منزلِ مقصود قرار دوں۔ سر بھرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گزرا، اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں۔" [1]

یہاں غالبؔ کا وہ فارسی خط نقل کیا جاتا ہے۔ اس کا مقابلہ کلیاتِ نثر کی پہلی اشاعت (۱۸۶۸ء) سے کیا گیا ہے اور جو اختلافات نظر آئے اُن کی نشان دہی حواشی میں کر دی ہے۔

---

[1] حالی: یادگارِ غالب/ ۲۷-۲۸ (طبع ۱۹۹۳ء) نیز باغِ دو در، مرتبہ سیّد وزیر حسن عابدی، مشمولہ اورینٹل کالج میگزین ۱۹۶۱ء۔

بنام منشی نبی بخش اکبرآبادی سررشتہ دار فوجداری کول:

اندیشہ[1] گواه است و مشاهده شاهد که کاستن[2] بهر آراستن است و زدودن از برائے نمودن۔ ستور را چون بیار ایند پیرایند، و باده را تا به پیمایند[3] بپالایند، نَے پاره را تا به بُریدن پارهٔ ازان به خوردگی نه رَود صورت قلم نتوان داد، آرے درکارگاهِ کون و فساد، هیچ فساد بے کون و هیچ کون بے فساد نیست[4] بسپهرم بُردند و چندے هم بران[5] پایه نگذاشتند[6] و سپس برزمین زدند تا پیکرم چنان بخاک نقش بست که آن نقش به هیچ کزالک[7] از خاک نتوان سترد گوئی درین کون و فساد که ناگاه روے داد مرا بُردند[8] (و) خسته را بجاے من آوردند که مرگ از زیستن و خنده از گریستن نشناسد۔ یارب این پیکر که بخاک نقش بسته[9] و این نقش که ازان پیکر بخاک نشسته[10] زُود باشد که از روے خاک تر خاک سپرند، درین روزگار که نه ز بندِ ستم رستگار و به بندِ غم گرفتار بودم[11] سخن ورِ جادو بیان، از خود رفته لاله هرگوپال تفته را بسوئم گذار اُفتاد شنیدم که آن لطف گستر بوطن رفته بودند[12] (و) اینک آمده اند، عجب آمد که بنامهٔ ننواختند۔ همانا هم نشینی و هم زبانی

---

[1] کلیات نثر/۱۰۳ میں اس خط کا سرنامہ یہ فارسی شعر ہے:

گفتنی نیست که بر غالبِ ناکام چه رفت
می توان گفت که این بنده خداوند نداشت

[2] کلیات: از بهر۔

[3] کلیات میں یوں ہی ہے مگر بیاضِ منقول عنہ میں بپالایند۔

[4] کلیات: ز خاکم آفریدند و به سپهر بُردند (بیاض میں بشهر بُردند) جو ظاہراً کتابت کا سہو ہے۔

[5] کلیات بدان۔

[6] کلیات نگاه داشتند۔

[7] کلیات: کذالک۔

[8] کلیات: مرا بردند و خسته۔

[9] کلیات: بست۔

[10] کلیات: نشست۔

[11] کلیات: بودند نیک۔

[12] بیاض منقول عنہ میں بس۔

من[1] با تفتہ ہم زبانی و ہم نشینی با خویش[2] شناختند و حقا کہ چنین است۔ دوش یکے از شاہزادگان تمر خانیہ بزم سخن آراستہ بود، و سخن سنجان را بغزل خوانی خواندہ، مرا کہ بگفتن ریختہ سرے نماندہ اگرچہ (بگفتن غزل مامور شدم و دل بدان نہ بستہ بودم[3]) اما روزے کہ شب بدان انجمن باید رفت[4] خاطہ[5] وقتے کہ سوارہ رہ می بریدم[6] بیتے چند بے خواست از دل غم زدہ سر بر زد چنان کہ بشما (نیز[7]) می فرستم و می خواہم کہ ہم درین زمین غزلے گفتہ بمن فرستند۔

غزل

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا کہ یہ خط قید سے رہائی کے بعد لکھا ہے۔ اس میں تفتہ کے دہلی آنے کا بھی ذکر ہے۔ وہ غالب کو رہائی کی مبارک باد دینے آئے ہوں گے۔ خط کے آخر میں غالب نے حقیر سے فرمایش کی ہے کہ مشاعرے کی غزل تمھیں بھیج رہا ہوں تم بھی اس زمین میں غزل لکھ کر مجھے بھیجو۔ چنانچہ نبی بخش حقیر نے غالب کی یہ فرمایش پوری کی ہے۔ مگر افسوس کہ اُن کی پوری غزل نہیں ملتی، صرف ایک مطلع دستیاب ہوتا ہے[8]:

دیر میں ہے ذکر اپنا کعبے میں بیاں اپنا

ایک ہم ہیں اور رچہ چاہے کہاں کہاں اپنا (۱۹۶۲ء)

---

[1] بیاض منقول عنہ میں لبس۔ [2] ہم نشینی خویش با من۔

[3] کلیات: اگرچہ دل بسگالش بنشستہ بودم (؟ بستہ)

[4] کلیات: بایست۔ [5] کلیات: ہنگامی۔

[6] کلیات: رہ می بردم۔ [7] کلیات میں نیز ندارد

[8] مالک رام: تلامذۂ غالب/ ۹۶ نیز آفاق حسین: نادرات غالب/ ۳۶۔

تلامذۂ غالب پر ایک نظر

میرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، اردو کے وہ خوش نصیب شاعر ہیں جن کی زندگی اور فن کے بہت سے گوشوں پر سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے اور بعض عالموں نے اپنی عمرِ عزیز کا بڑا حصّہ اُن کی تحقیق و تفتیش میں بسر کر دیا ہے۔ یوں تو "غالب شناسی" کی مہم کا آغاز حالیؔ نے کیا تھا لیکن اُن کے بعد جن حضرات نے غالبیات کے سلسلے میں گراں قدر اضافے کیے، اُن میں قاضی عبد الودود، امتیاز علی عرشیؔ، مالک رام اور مہیش پرشاد امتیازی حیثیت رکھتے ہیں اور اُن میں بھی جناب مالک رام کو ایک حیثیت سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اوروں نے غالبؔ پر تحقیق کو "پھیلایا" ہے اور اُنھوں نے "سمیٹا" ہے۔ چنانچہ "ذکرِ غالب" سوانحی خوبیوں کے لحاظ سے بے مثال بھی ہے اور مثالی بھی۔

پچھلے سال جناب مالک رام کی ایک اور کتاب "تلامذۂ غالب" شائع ہوئی تھی۔ اس میں غالبؔ کے ۱۴۶ شاگردوں کے حالاتِ زندگی اور اُن کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ اس کی ترتیب و تالیف اور تلاش و تحقیق میں کتنی محنت کی گئی ہے، اس کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ مولّف نے ۱۴۸ مختلف مطبوعہ اور قلمی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، جن میں ۲۳ رسائل و جرائد کے مجلدات بھی شامل ہیں۔ اس کتاب

میں غالب کے ۲۷ تلامذہ کی تصویریں بھی جمع کر دی گئی ہیں جن میں بعض نادر ہیں، اور پہلی بار منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اس کے علاوہ ۳۹ نام ایسے ہیں جن کا تذکرہ ضمناً حواشی میں آگیا ہے اور مؤلف نے اُن کے بارے میں بھی مفید معلومات مختصر پیرائے میں مہیا کر دی ہیں۔

ایک انگریز نقّاد نے لکھا تھا کہ اچھا لکھنے والا وہ ہے جو یہ بھی جانتا ہو کہ "کیا بات نہیں لکھنی چاہیے"! مالک رام کی تحریروں میں یہ وصف بہت نمایاں ہے۔ وہ اپنے موضوع کا پوری طرح احاطہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں اور "انتخابِ مواد" کا حیرت انگیز ملکہ رکھتے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں احتیاط، توازن، وقار اور سنجیدگی کے ساتھ دل کشی اور جاذبیت ہے اور تحقیقی مضامین کے لیے اُن کا اسٹائل نہایت موزوں ہے۔

"تلامذۂ غالب" چونکہ اپنے موضوع پر واحد اور اہم کتاب ہے۔ اس کے علاوہ اُس کی حیثیت ایک "تذکرے" کی ہے، اس لیے میں یہاں اُس کے بعض تسامحات کا ذکر کروں گا تاکہ فاضل مؤلف آیندہ ایڈیشن کی تیاری کے وقت اُن پر غور فرما سکیں اور میری رائے سے متفق ہوں تو اس کی تصحیح کی جا سکے۔

اس کتاب میں جو فرو گزاشتیں ہوئی ہیں اُن کی نوعیت یہ ہے کہ اکثر کتابت کی غلطیاں ہیں، لیکن جہاں یہ باور کرنے کے لیے صریح قرینہ موجود ہے، میں نے نظر انداز کر دیا ہے۔ بعض مآخذ مؤلف کی دسترس سے باہر رہ گئے، اُن کی طرف میں نے اشارہ کر دیا ہے۔ کئی جگہ مجھے شبہ وارد ہوتا ہے اور بعض اُمور محض میری رائے سے علاقہ رکھتے ہیں۔

۱۔ امراؤ مرزا انور دہلوی کے ترجمے میں لکھا ہے:

"۱۸۵۷ء کے بعد پہلے رام پور اور وہاں سے جے پور گئے۔ وہیں ۱۸۸۵ء (۱۳۰۲ھ) میں ۳۸ برس کی عمر میں خدا کو پیارے ہوئے"۔[1]

اس حساب سے انور کا سالِ پیدائش ۱۸۴۷ء قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد یہ بیان پڑھیے:

---

[1] تلامذہ / ۴۲۔

"نواب سعید الدین احمد خاں طالب نے اپنے والد نیّر رخشاں سے
اُن کی شاگردی کے سلسلے میں ایک عجیب روایت نقل کی ہے۔
لکھتے ہیں کہ جب ..... عارف کو خطِ نسخ سیکھنے کا شوق ہوا، تو وہ
سید جلال الدین یاقوت رقم ثانی ..... کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
اُن دنوں عارف کی شاعری کا عام شہرہ تھا، اُدھر میر جلال الدین
کے اُن دونوں صاحبزادوں کو شاعری کی چاٹیک تھی اور وہ ایک
اچھّے استاد کی ٹوہ میں تھے۔ میر جلال الدین کو یہ اچھا موقع ہاتھ
آیا۔ انھوں نے عارف سے کہا کہ میں آپ کو یوں تو شاگرد کرتا نہیں،
ہاں تبادلہ کرتا ہوں۔ یعنی میں آپ کو نسخ کی تعلیم دوں گا اور اس
کے اصول بتاؤں گا۔ آپ میرے دونوں لڑکوں کو شاعری کے
رموز بتائیں اور شاعر بنا دیں۔ عارف مرحوم نے منظور کر لیا اور
معاملہ اس پر طے ہو گیا۔ اگرچہ عارف نے ایک سال کے بعد سلسلۂ
تعلیم ختم کر دیا، اور استاد نے سند لکھ دی، لیکن ظہیر اور انور مدّتوں
عارف سے اصلاح لیتے رہے ..... جب بہادر شاہ ظفر کو اُن کا
حال معلوم ہوا تو اُنھوں نے ان دونوں کو استاد ذوق کے سپرد
کر دیا ..... ذوق کے بعد انور غالب سے مشورہ کرنے لگے تھے ....."[1]

ذوق کی وفات ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء کو ہوئی[2] اور عارف نے اپریل ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا[3]۔ اگر طالب مرحوم کی مذکورہ بالا روایت کو صحیح سمجھا جائے تو اس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا بھی لازم آتا ہے کہ انور نے چار پانچ سال کی عمر میں عارف سے استفادہ کیا اور چھ سات سال کی عمر میں ذوق سے۔ اور یہ عادۃً محال ہے کہ انھوں نے عالمِ شیر خوارگی ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا ہو۔ جب کہ "ظہیر اور انور مدّتوں عارف سے اصلاح لیتے رہے" اس

---

[1] تلامذہ / ۱۱۱۔ [2] ذکرِ غالب (طبع سوم) / ۹۱۔ [3] ایضاً / ۱۳۷۔

سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عارف کی وفات ۱۸۵۲ء سے بہت پہلے تعلقِ تلمذ پیدا ہو چکا تھا۔

انور کا دیوان ۱۸۹۹ء میں مطبع رفاہِ عام لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس کے خاتمے پر ایک طویل تقریظ، انور کے بھائی ظہیر دہلوی کی بھی شامل ہے۔ انھوں نے بھی یہی لکھا ہے کہ "فنِ سخن کا اکتساب شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ و میرزا اسداللہ خاں غالبؔ سے کیا تھا مگر شاید کوئی ایک ایک دو دو غزل دکھانے کا اتفاق ہوا ہو" (دیوان انور/۱۲۷)۔

لیکن مجھے پھر بھی یہ قبول کرنے میں تامل ہے کیونکہ ذوقؔ کی وفات کے وقت انور محض طفلک ناداں تھے۔

۲۔ منشی غلام بسم اللہ میرٹھی کے حال میں لکھا ہے: "نعت بھی کہتے تھے۔ چنانچہ نعتوں کا ایک مجموعہ "نالۂ بسمل" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔"[۱]

"نالۂ بسمل" کا ایک نسخہ میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ ۳۲ صفحوں کا مختصر سا رسالہ ہے، جسے "نعتوں کا مجموعہ" ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی کیفیت خاتمۂ کتاب کے مندرجہ ذیل ترقیمے سے ظاہر ہوگی:

> "شکرِ خداوند ذو الجلال کہ نسخۂ عدیم المثال درحالِ پُرملال، حضرت بلال رضی اللہ عنہ از تصنیفِ لطیف، عاشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مولوی غلام بسم اللہ صاحب بسملؔ رئیس بریلوی ..... ارشدِ تلامذۂ نواب اسداللہ خاں صاحب غالبؔ، مطبع مطلع العلوم و اخبار نیر اعظم مرادآباد میں ..... ۲۰ اکتوبر ۱۸۹۶ء کو چھپ کر سرمۂ چشمِ مشتاقاں ہوا۔"[۲]

حضرتِ بلال کا یہ قصہ ترکیب بند مسدّس کی شکل میں نظم ہوا ہے۔ پہلا بند یہ ہے:

طالبِ مولیٰ کا فسانہ ہے یہ
تارکِ دنیا کا فسانہ ہے یہ

---

[۱] تلامذہ/ ۴۹۔ [۲] نالۂ بسمل/ ۳۲۔

راغبِ عقبیٰ کا فسانہ ہے یہ
عاشقِ شیدا کا فسانہ ہے یہ
دل سے سنو دوستو یہ داستاں
لکھتا ہے یوں راویِ رنگیں بیاں

خاتمے پر بھی لکھا ہے۔ "تمام شد نسخہ وفات نامہ بلال رضی اللہ عنہ"۔ اس کے بعد ایک نعتیہ قصیدہ ہے اور پھر قدسی کی مشہورِ عالم نعت "مرحبا سید مکی مدنی العربی" کی تضمین ہے۔ تضمین کے بعد "تاریخ تصنیف ریختہ قلم ..... حضرت مولوی صاحب عالم متخلص بہ صاحب ..... کہ بسیار طول دادہ بودند چند اشعار ازاں چیدہ نوشتہ شد[1]"

بسمل ہی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "حضرت شاہ عبدالرحمٰن (گنج) سے بیعت تھے[2]"۔ "گنج" اُن کا لقب نہیں۔ اِس سے عموماً قاری کو دھوکا ہو جاتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ وہ حضرت شاہ فضلِ رحمان گنج مرادآبادی سے بیعت ہوں گے۔ یہ نام غلط لکھا گیا ہے۔ بسمل نے حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کے ملفوظات دُرّ المعارف ۱۳۰۴ھ میں بریلی سے شائع کیے تھے۔

۳۔ لال بالمکند بےصبر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ دیوان اور ایک مثنوی "لختِ جگر" مطبوعہ موجود ہے۔ مثنوی میں .. ۲۵ شعر ہوں گے۔ ایک دوسری مثنوی "اخگرِ عشق" غیر مطبوعہ رہ گئی۔ یہ ۱۲۷۳ھ میں لکھی گئی تھی۔ "لالہ پُر داغ" تاریخ ہے[3]۔

صرف یہی نہیں، بےصبر کا بہت سا اردو اور فارسی کلام غیر مطبوعہ ہے۔ اُن کے ضخیم کلیات کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو دستیاب ہوا تھا جو تقریباً ۳۸۴ صفحات کو محیط ہے۔ اس میں غزلیں، مثنویاں، قصائد، قطعات، رباعیات، تاریخیں، مسدس، مخمس، سبھی کچھ موجود ہے۔ چند قصائد مرزا غالب کی مدح میں بھی ہیں۔ اور اُن کا بیشتر حصّہ غیر مطبوعہ ہے۔ یہ کلیات صحت اور اہتمام سے مرتب ہو کر شائع ہو جائے تو بےصبر کی ساری عمر کی کمائی محفوظ ہو جائے گی۔

---

[1] نالۂ بسمل/۳۱۔ [2] تلامذہ/۴۹۔ [3] تلامذہ/۵۵۔

۴۔ ذیلی حاشیے میں شیخ مہدی علی ذکی مرادآبادی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "کلیات مطبوعہ موجود ہے"۔ ذکی کا کلیات آج تک نہیں چھپا، البتہ اُن کا اردو دیوان طبع ہوا تھا اور اب بہت کمیاب ہے۔ دیوانِ ذکی کا ایک قلمی نسخہ دہلی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے اور اس میں مطبوعہ نسخے سے بعض اختلافات کے علاوہ کچھ کلام زائد بھی ہے۔ یہ نسخہ وفاتِ ذکی کے چند سال بعد ان کے ایک شاگرد نے لکھنؤ میں نقل کیا تھا۔

۵۔ قاضی عبدالجلیل جنون کے بارے میں لکھا ہے: "کتب درسیہ صدر الصدور مفتی عنایت اللہ (مصنف تواریخِ حبیب الہ) سے پڑھیں[۱]۔ ان کا صحیح نام مفتی عنایت احمد ہے۔ یہ کاکوری کے رہنے والے تھے اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں"۔[۲]

۶۔ حالی کے حال میں لکھا ہے: "اردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی یکساں دستگاہ تھی اور ان زبانوں میں بھی ان کا مختصر دیوان موجود ہے"۔[۳]

حالی کا اردو دیوان عام طور سے مل جاتا ہے۔ عربی اور فارسی میں اُن کا کوئی دیوان نہیں، فارسی کی چند غزلیں اور نظمیں (مثلاً سرسید کا مرثیہ) اور عربی میں چند اشعار ہیں۔ انھیں "مختصر دیوان" کی حیثیت میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کا یہ کلام اگست ۱۹۱۴ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا تھا۔ (حالی کی تصانیف کے سلسلے میں ملاحظہ ہو رسالہ صحیفہ لاہور، دسمبر ۱۹۵۸ء)۔

۷۔ شاہ رؤف احمد رافت رامپوری کا حال حاشیۂ ذیلی میں لکھا ہے، اور یہ کہ "اپنے مرشد کے ملفوظات "دارالمعارف" کے عنوان سے جمع کیے"۔[۴]

اس مجموعے کا صحیح نام "دُرالمعارف" ہے۔ اور یہ حضرت شاہ غلام علی نقشبندی کے ملفوظات ہیں۔

۱۔ تلامذہ/۷۶۔

۲۔ تفصیل کے لیے: تذکرہ مشاہیر کاکوری از حافظ محمد علی حیدر، اور نزہۃ الخواطر فی بہجۃ المسامع والنواظر الجزء السابع ۳۴۱ شائع کردہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن (۱۹۵۹ء)۔

۳۔ تلامذہ/۸۸۔ ۴۔ تلامذہ/۱۰۴۔

۸۔ ذیلی حاشیے ہی میں جارج پیش شور کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اُن کی تصانیف میں منظوم سوانح عمری کا نام نہیں آیا۔ یہ بھی طبع ہو چکی ہے۔

۹۔ نواب سیّد سجّاد مرزا، سجّاد دہلوی کے ترجمے میں لکھا ہے: "پدری سلسلہ برہان الملک سعادت علی خاں میر محمد امین نیشاپوری نواب وزیر اودھ کے واسطے سے حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے"۔[۱]

میر محمد امین نیشاپوری کو محمد شاہ پادشاہ کے دربار سے "سعادت خاں برہان الملک" کا خطاب ملا تھا۔

"سعادت علی خاں" اُس کا نہیں، اودھ کے پانچویں وزیر کا نام ہے جو آصف الدولہ کے بعد مسند آرائے ریاست ہوا تھا۔ ثانیاً یہ کہ پدری سلسلے کا برہان الملک کے واسطے سے ملنا محال ہے۔ اُس کی اولاد میں ایک بیٹا اور چھ بیٹیاں تھیں، بیٹا نو عمری ہی میں چیچک یا کسی اور بیماری سے مر گیا تھا[۲] اسی لیے برہان الملک کے بعد خلعتِ وزارت اُس کے بھانجے اور داماد مرزا مقیم کو عطا ہوا جس نے بعد میں "صفدر جنگ" کا خطاب دربارِ شاہی سے حاصل کیا۔ سعادت خاں کے ایک بھائی سیادت خاں تھے، یہ ممکن ہے کہ سجّاد کا پدری سلسلہ اُن کے واسطے سے حضرت موسیٰ کاظم تک پہنچا ہو۔

۱۰۔ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ پر "باغیوں کی مجرمانہ اعانت" کا الزام، اُن کی گرفتاری اور پھر رہائی کے سلسلے میں نواب صدیق حسن خاں کی کوشش و سفارش کا واقعہ بیان کرتے ہوئے جناب مالک رام نے لکھا ہے:

> "ان کی رہائی کے لیے نواب والاجاہ، امیر الملک مولوی صدیق حسن خاں بہادر (بھوپال) نے بعض انگریزی حکام کے توسّط سے خاص کوشش کی تھی۔ اُن کا مقدمہ مولوی مومن علی خاں سندیلوی صدر الصدور کی عدالت میں تھا۔ نواب والاجاہ نے اُن کے نام سفارشی خط لکھا۔ خدا کے فضل سے شیفتہ رہا ہو گئے لیکن جایداد

---

[۱] تلامذہ/ ۱۴۴۔ [۲] نجم الغنی: تاریخ اودھ جلد ۱/ ۸۳۔

ضبط ہو گئی۔ رہائی کے بعد انھوں نے شکریے کا خط نواب صدیق حسن خاں بہادر کو لکھا اور کہا کہ نجاتِ صوری تو ہو گئی لیکن نجات معنوی ابھی باقی ہے۔ یعنی جب تک ذریعۂ معاش پیدا نہ ہو زلیست محال ہے۔ اس پر نواب صاحب نے دوسرا خط صدر الصدور موصوف کے نام لکھا تو نصف جایداد بھی واگزاشت ہو گئی"۔ [۱]

مؤلّفِ تلامذہ نے یہ واقعہ "شمع انجمن" کے حوالے سے لکھا ہے [۲] لیکن اس معاملے میں ایک بات وضاحت طلب رہ گئی۔ نواب صدیق حسن خاں نے خود اپنا حال متعدد جگہ لکھا ہے [۳] اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۹ جمادی الاوّل ۱۲۴۸ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ ماں نے پرورش کی اور :

"چوں زمانِ شعور آمد در خانہ ہیچ شے از اسبابِ دنیا جز کتاب خانہ متروکۂ والدِ مرحوم ندید"۔ [۴]

طلبِ علم میں گھر سے نکلے کانپور، فرخ آباد ہوتے ہوئے، ۱۲۶۹ھ میں دہلی آئے اور شیفتہ کے گھر قیام کیا۔ ایک سال آٹھ ماہ دہلی میں رہے اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے درس میں شریک ہوئے۔ ۱۲۷۰ھ میں بھوپال گئے۔ وہاں ماموں مفتی محمد حسین کے گھر قیام کیا انھیں کے وسیلے سے ملازم ہوئے۔ نائب اول ریاست مدار المہام محمد جمال الدین خاں بہادر کی بیوہ دختر سے عقد کیا، (۵ شعبان ۱۲۷۷ھ)۔ بعد ازاں ۱۲۸۷ھ میں نواب شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال سے ۸ شوال کو عقد ہوا۔ یہاں سے اُن کے عروج اور رسوخ کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

---

[۱] تلامذہ / ۸۱۔ [۲] شمع انجمن / ۱۳۴۔

[۳] مثلاً ملاحظہ ہوں: (۱) حِطّہ بذکرِ الصحاح السّتہ (۲) ابجد العلوم جلد ۳ / ۹۳۹۔ (۳) اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثرِ الفقہا المحدثین / ۲۶۳ تا ۲۷۱۔ (۴) الفرع النامی وغیرہ۔

[۴] اتحاف النبلاء / ۲۶۳۔

۲۱ ربیع الثانی ۱۲۸۸ھ کو دربارِ عام میں عہدۂ نیابت دوم ریاست، خلعت، قیمتی بیس ہزار روپیہ، زیور مروارید و اقمشہ پوشیدنی و قلمدانِ نقرہ و آفتابی و پالکی و سپر و شمشیر و کمر بند و فیل وغیرہ مع خریطۂ عہدہ۔ خود بیگم بھوپال نے عطا فرمایا۔ پہلے "میر دبیر ریاست" تھے۔ اب خطاب "معتمد الدولہ سیّد محمد صدیق حسن خاں بہادر نائب دوم ملک محروسہ ریاست بھوپال" ہوا۔ پھر پچاس ہزار سالانہ کی جاگیر اور ضرب توپ اور خطاب "نواب والاجاہ امیر الملک" عطا ہوا۔

شیفتہ کا جو خط "شمع انجمن" میں نقل ہوا ہے۔ وہ یکم شعبان ۱۲۷۶ھ کا مکتوبہ ہے۔ اُس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ نواب صدیق خاں نے اُن کی رہائی کے لیے کوشش کی تھی۔ لیکن یہ اُن کے ذاتی اثر و رسوخ سے نہ تھی بلکہ بعض حکّامِ انگریزی کے واسطے اور وسیلے سے تھی۔ ورنہ اس زمانے میں اُن کی حیثیت ایک معمولی سررشتہ دار سے زیادہ نہیں تھی۔ اُن کا عروج تو شیفتہ کی وفات کے بھی دو سال بعد ہوا ہے۔

۱۱۔ سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "مئی ۱۸۶۵ء میں اپنے ماموں جناب شاہ عالم شائقؔ کے ساتھ دہلی پہنچ کر غالبؔ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بہت دن تک اُن کے پاس رہ کر استفادہ کیا۔ غالبؔ کی وفات کے بعد، چندے غلام حسنین قدرؔ بلگرامی سے بھی مشورہ کرتے رہے"۔ [۱]

صفیرؔ نے قدرؔ سے مشورہ کیا ہو، اس پر بھی مشکل سے یقین کیا جاسکتا ہے۔ اس پر بھی وہی شبہ وارد ہوتا ہے، جو عاشق کے، فرحتی سے اصلاح لینے پر مؤلفِ تلامذہ نے وارد کیا ہے[۲] قدرؔ ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میں پیدا ہوئے[۳] اور صفیر ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۴ء) میں[۴] یعنی دونوں تقریباً ہم عمر تھے اور ہم طرح بھی۔ صفیرؔ نے امان علی سحرؔ اور میرزا دبیرؔ سے بھی مشورہ کیا تھا۔ قدرؔ نے بھی فتح الدولہ برقؔ اور سحرؔ سے عروض وغیرہ کی تحصیل کی تھی۔ امداد علی، سحرؔ سے بھی شاید مشورۂ سخن کیا ہو۔ بعد میں دونوں نے غالبؔ کا تلمّذ اختیار

---

[۱] تلامذہ/۱۹۴۔ [۲] ایضاً ۲۲۵۔ [۳] ایضاً ۲۴۸۔ [۴] ایضاً ۱۹۴۔

کیا۔ غرض قدر اور صفیر ہم عمر ہونے کے ساتھ ہم طرح اور ہم پلّہ تھے۔ اور مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار دونوں نے ایک ہی زمین میں منقبت لکھ کر فیصلے کے لیے غالب کے پاس بھیجی تھی، جس پر انھوں نے گول مول سی رائے ظاہر کر دی تھی۔ (غالب کے اُس خط کا حوالہ سر دست مجھے نہیں ملا)۔

۱۲۔ سیّد قطب الدین دلاور علی طرزی ہاپوڑی کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ:

> "مولانا مملوک علی کے درس حدیث میں یہ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم ہم سبق تھے۔ مولانا تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ دلاور علی اور تو سب کام کر لیتے تھے لیکن روٹی پکانے سے ہمیشہ کتراتے تھے۔ اور یہ کام میرے سپرد تھا۔" [۱]

مولانا مملوک العلی کا انتقال ۱۲۶۷ھ میں ہوا[۲] آثار الصنادید کی تالیف کے وقت وہ چودہ پندرہ برس سے دہلی میں درس دیتے تھے[۳] اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی ولادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ (چارشنبہ) کو ہوئی[۴] "کرمِ عظیم" مادۂ تاریخ ولادت ہے۔ ابتدائی درسیات کی تعلیم کے بعد ۱۲۹۵ھ میں مدرسہ دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۳۰۱ھ میں فارغ التحصیل ہوئے[۵] غرض یہ محالات میں سے ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی، طرزی کے ہم درس رہے ہوں۔ یہاں شاید مؤلف کا سہو قلم ہو۔ نام مولانا محمد قاسم نانوتوی (دار العلوم دیوبند) کا ہو سکتا ہے۔

۱۳۔ (الف) سیّد احمد حسن عرشی قنوجی کے ترجمے میں، اُن کے والد مولانا سیّد اولاد حسن کے نام کے بعد قوسین میں ۱۸۰۵–۱۸۳۸ء لکھا ہے۔ ظاہراً اُس کا مطلب یہی ہے کہ مؤلف کے نزدیک اُن کا سالِ ولادت ۱۸۰۵ء اور سالِ وفات ۱۸۳۸ء ہے۔

---

[۱] تلامذہ / ۲۰۳۔

[۲] عبد الحی۔ نزہۃ الخواطر فی بہجۃ المسامع والنواظر۔ المجلد السابع / ۴۸۷ (۱۹۵۹ء)۔

[۳] سرسیّد: آثار الصنادید (طبع اول)۔ [۴] عزیز الحسن: اشرف السوانح / ۱۶ (۱۳۵۴ھ)۔

[۵] ایضاً / ۲۴–۲۵۔

مولانا اولاد حسن ۱۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے تھے[1] اور ۱۲۵۳ھ میں انتقال ہوا۔ عمر ۴۳ برس کی پائی کہ اس حساب سے پیدائش کا عیسوی سال ۱۷۹۵ء ہونا چاہیے نہ کہ ۱۸۰۵ء۔

(ب) احمد حسن عرشی قنوجی کی تحصیلِ علمی کے حال میں لکھا ہے کہ: "علوم کتاب و سنّت کی سند شیخ صالح عبد الغنی، اور سیّد فاروقی مجدّدی، اور مولانا سیّد عبد الغنی مدنی سے لی۔"[2]

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے تین اساتذہ سے سند حدیث لی ــ حالانکہ یہ ایک ہی نام ہے، "شیخ صالح" کسی کا نام یا نام کا حصّہ نہیں، بلکہ تعظیمی الفاظ کے طور پر لکھا گیا ہے، اور "سیّد فاروقی مجدّدی" کسی مختلف فرد کا نام نہیں۔ ایک ہی شخص کی نسبت ہے۔ صدیق حسن خاں کا بیان ہے:

"کتبِ حدیث از شیخِ صالح عبد الغنی ابو سعید الفاروقی المجدّدی نزیلِ مدینہ منورہ فرا گرفت ..... وایں اجازت در سنہ احدی وسبعین ومائتین والف (۱۲۷۱ھ) حاصل نمود ....."[3]

نواب صدیق حسن خاں نے اجازت نامے کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں۔ یہ شاہ عبد الغنی صاحب دہلوی ہیں۔ جو حضرت شاہ ابو سعیدؒ (خلیفہ شاہ غلام علی نقشبندیؒ) کے فرزند تھے۔ نسباً فاروقی اور مشرباً مجدّدی تھے۔ مقاماتِ مظہری کا ضمیمہ انھیں کا لکھا ہوا ہے۔ سر سیّد احمد خاں نے آثار الصنادید میں دونوں بزرگوں کا احوال لکھا ہے[4] اور خود جناب مالک رام نے اس کتاب میں اُن کا ترجمہ حاشیے پر درج کیا ہے[5]۔

(ج) عرشی کے سفرِ حج کی نیت سے جانے اور بڑودہ میں قیام کرنے کا بھی تذکرہ ہے۔ اور جناب مالک رام نے لکھا ہے کہ "بڑودہ پہنچ کر ایک ہم نام دوست حکیم سیّد احمد حسن فنا (شاگردِ غالب) کے مکان پر اُترے۔ (تذکرہ علمائے ہند میں لکھا ہے کہ مولانا

---

[1] اتحاف النبلاء/ ۲۳۵۔
[2] تلامذہ/ ۲۳۱۔
[3] " " / ۲۲۲-۲۲۳۔
[4] آثار الصنادید/ ۲۶ (طبع اول)۔
[5] تلامذہ/ ۱۷۹-۱۸۰ (حاشیہ)۔

غلام حسین قنوجی کے مکان پر ٹھہرے تھے)[۱]

مولف نے جو عبارت قوسین میں لکھی ہے وہ شاید انھیں ضعیف روایت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن خود نواب صدیق خاں نے بھی یہی لکھا ہے کہ عرشی بڑودہ میں غلام حسین کے مکان پر فروکش تھے۔ اُن کے گھر ہی عرشی کا انتقال ہوا۔ اس لیے رحمٰن علی، مولف تذکرہ علمائے ہند کی روایت قابلِ ترجیح ہے۔

ضمناً ایک بات اور عرض کردوں: " تلامذہ" میں "غلام حسین" نام لکھا گیا ہے۔ لیکن صحیح نام غلام حسنین ہے[۲]۔

۱۴۔ منشی محمد حسنین محمود دہلوی کی ایک مثنوی "تحفۂ محمود" کا تذکرہ مؤلف نے کیا ہے اور اُسی کے خاتمے کی عبارت سے مختصر حال اخذ کر کے لکھا ہے[۳]۔ ان کی ایک غزل اکمل الاخبار، دہلی (اگست ۱۸۶۹ء) میں شائع ہوئی تھی وہ نقل کردی ہے۔ محمود کی ایک اور تصنیف مختصر رسالہ" قولِ فیصل"، بھی ہے۔ یہ ۱۸۸۰ء کا مطبوعہ ہے۔ اُس کے سرورق کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نئی اور پرانی شاعری کا محاکمہ ہے۔ اس میں حالی اور غالب وغیرہ اساتذہ کی غزلوں کے علاوہ محمود کی اپنی غزلیں بھی شامل ہیں۔ یہ رسالہ بہت دن ہوئے امروہہ میں ایک صاحب کے پاس میں نے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ آسانی سے دستیاب نہیں ہوسکتا۔

۱۵۔ احمد حسین مرزاپوری کا حال دو تخلصوں (تمنّا اور مینا) کے ذیل میں لکھا ہے اور یہ صراحت بھی کردی ہے کہ غالباً مینا اور تمنّا میں تصحیف ہوگئی ہے[۴]۔ اگر یہ صحیح تھا تو دو جگہ تذکرہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

۱۶۔ نواب یوسف علی خاں ناظمؔ (رامپور) کو لکھا ہے کہ آپ "نسباً حسینی سید تھے"۔ اگرچہ حاشیے میں اختلاف کی صراحت کردی ہے لیکن سیادت کی روایت کو ظاہراً

---

[۱] تلامذہ / ۲۳۱۔
[۲] ابجد العلوم جلد ۳ / ۹۳۳۔
[۳] تلامذہ / ۲۵۶۔
[۴] تلامذہ / ۶۶ اور ۲۶۹

ترجیح دی ہے۔ میرے خیال میں یہ صحیح نہیں۔ قدیم تاریخیں اور تذکرہ نگار علی محمد خاں کو "افغان" یا "روہیلہ" ہی بتاتے ہیں۔ نجم الغنی رامپوری نے ان کو سیّد ثابت کرنے کے لیے بڑی طومار بندی کی ہے۔ لیکن اُن کے دلائل حد درجہ بودے ہیں۔

۱۷۔ بعض شعرا کے تراجم تو تلامذہ میں شامل ہیں۔ لیکن یا تو اُن کے تلمّذ کا ثبوت نہیں دیا گیا، یا وہ میری نظر میں مشکوک ہیں۔ جب تک اُن کے تلمّذ کی سند دستیاب نہ ہو۔ مثلاً:

۱۔ فرزند علی اخگرؔ عظیم آبادی	(ص ۲۹)
۲۔ عین الحق بےؔ صبر کاکوری	(ص ۵۷)
۳۔ غلام محمد تپشؔ دہلوی	(ص ۵۹)
۴۔ شاہزادہ بشیر الدین توفیقؔ	(ص ۶۸)
۵۔ جمشید علی خاں جمؔ	(ص ۷۴)
۶۔ حکیم معشوق علی خاں جوہرؔ	(ص ۸۰)
۷۔ خلیفہ حسام الدین حسّامؔ	(ص ۹۳)
۸۔ محمد ابراہیم خلیلؔ و فوق	(ص ۱۰۱)
۹۔ دیبی پرشاد سرور	(ص ۱۵۰)
۱۰۔ انور علی شاہ	(ص ۱۶۶)
۱۱۔ سیّد محمد بشیر خاں بشیرؔ	(ص ۱۷۶)
۱۲۔ حکیم محمد علی صوفیؔ	(ص ۱۹۸)
۱۳۔ سردار محمد خاں طالبؔ	(ص ۱۹۹)
۱۴۔ مرزا سرفراز حسین طرّارؔ	(ص ۲۰۲)
۱۵۔ پیارے لال ظہیرؔ	(ص ۲۱۸)
۱۶۔ شنکر دیال عاشقؔ	(ص ۲۲۳)
۱۷۔ عاشق حسین عاشقؔ	(ص ۲۲۶)

۱۸۔ سیّد محمد سلطان عاقلؔ (ص ۲۲۶)

۱۹۔ سیّد بدرالدین احمد کاشفؔ (ص ۲۵۰)

۲۰۔ مصلح الدین منصورؔ (ص ۲۶۵)

۲۱۔ احمد حسین میناؔ (ص ۲۶۸)

۲۲۔ وحید الدین وحیدؔ دہلوی (ص ۲۶۴)

۲۳۔ شکور احمد وکیل (ص ۲۹۹)

مندرجہ بالا شعرائیں بہت سے وہ ہیں جن کے تلمذ کی روایت ضعیف ہے یا اس کی تصدیق کا قدیم تر ذریعہ موجود نہیں۔ انھوں نے بالفرض اگر غالبؔ سے اصلاح لی بھی ہو تو ایک دو غزلوں سے زیادہ دکھانے کا موقع نہ ملا ہوگا۔

۱۸۔ مقدمہ میں مولّف تلامذہ نے اعتراف کیا ہے کہ "ایسے بھی شاعر تھے کہ اُن کا صرف تخلّص ہی معلوم ہو سکا نام اور کلام تک رسائی نہ ہوئی مثلاً آزردہ وغیرہ۔ میں نے دانستہ سلسلہ میں اُن کا ذکر نہیں کیا کیونکہ محض فہرست کو لمبا کرنا مقصود نہیں تھا۔ بعض اصحاب ایسے تھے کہ اُن کا نام اور تخلّص دونوں معلوم ہو گئے اگرچہ نہ مفصّل حالات ملے نہ زیادہ کلام ہی ہاتھ لگا مثلاً حسامؔ، دردؔ، ذکیؔ، رابطؔ، سالمؔ وغیرہ۔ انھیں البتّہ میں نے سلسلہ میں درج کر لیا ہے۔"[1]

اگر ان شعرا کو اتنی کمزور شہادتوں کے ہوتے بھی زمرۂ تلامذہ میں شامل کر لیا گیا تو الگزنڈر ہدرلی آزادؔ کا ترجمہ کیوں شاملِ تذکرہ نہیں، جس کے تلمّذ کا نسبتہً قوی ثبوت موجود ہے۔

الگزنڈر ہدرلی آزادؔ، ایک فرانسیسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور بقول رام بابو سکسینہ "ہند برطانوی" نسل کے شاعر تھے۔ غالباً ۱۸۲۹ء میں اُن کی ولادت ہوئی اور اٹھارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا، پہلے اپنا کلام زین العابدین خاں عارفؔ کے

---

[1] تلامذہ / ۷۔ ۸۔

پاس اصلاح کے لیے بھیجتے تھے۔ بعد میں مرزا غالب سے مشورہ کیا۔ اردوے معلی کے ایک خط میں غالب نے ان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔[۱]

ان کا حال رام بابو سکسینہ نے تفصیل سے لکھا ہے۔[۲] مولانا عبدالماجد دریابادی رسالہ معارف میں آزاد پر ایک مقالہ "غالب کا ایک فرنگی شاگرد" لکھ چکے ہیں۔[۳] نظرِ ثانی کے بعد یہ اُن کے مجموعۂ مضامین بھی شامل ہے۔[۴] آزاد کے بڑے بھائی تھامس ہدرلی بھی شاعر تھے۔ انھوں نے ۱۸۶۳ء میں مطبع احمدی آگرہ سے آزاد کا دیوان طبع کرایا تھا۔ اس کا دیباچہ منشی شوکت علی ساکن شاہ پور ضلع فتح پور نے لکھا ہے:

> "الگزنڈر ہدرلی ..... با محتشم الدولہ امیر الملک محمد اسد اللہ خاں بہادر سہراب جنگ غالبؔ متخلص و نواب زین العابدین خاں متخلص بہ عارفؔ ..... بذریعہ مراسلات و مکاتبات استمدادِ سخن داشتے"۔[۵]

غالب سے الگزنڈر ہدرلی کا متعارف ہونا تو اردوے معلّی کے ایک خط سے ثابت ہے اور اس کا امکان ہے کہ زین العابدین خاں عارفؔ کی وفات کے بعد انھوں نے غالب سے مشورۂ سخن کیا ہو۔ اگر یہ بات بے بنیاد ہوتی تو منشی شوکت علی دیباچۂ دیوان میں اُنھیں غالب کا شاگرد نہ لکھتے جو خود آزاد کے بھائی تھامس ہدرلی کی نگرانی میں چھپا تھا۔

۱۹۔ تلامذۂ غالب میں، قاضی عنایت حسین بدایونی کا ترجمہ، اشکی، تخلص کے

---

[۱] غالب: اردوے معلی/ ۱۳۹ (مبارک علی، لاہور اڈیشن)۔

[۲] Saksena: European & Indo-European Poets of Urdu & Persian p. 71

[۳] معارف: اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۲۲ء۔ [۴] مقالات ماجد/ ۹۔

[۵] ماسبق/ ۱۰۔ غالب کا خطاب اس میں سرتاپا غلط لکھا ہے۔ انھیں بہادر شاہ ظفر نے ۴ر جولائی ۱۸۵۰ء کو "نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ" کا خطاب دیا تھا (دیکھو ذکر غالب/ ۹)۔

ذیل میں لکھا گیا ہے۔[1] شعرائے بدایوں کے ایک ناقص تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے اشکی تخلص کرتے تھے۔ بعد میں فراق اختیار کیا۔ تذکرے کی عبارت یہ ہے:

"فراق۔ حاجی حافظ عنایت حسین، رئیس بدایوں۔ پہلے تخلص اشکی کرتے تھے، اب فراق۔ انھوں نے نظم نویسی و نثر نگاری میں عمدہ لیاقت پیدا کی۔ علم کی تحصیل اچھی کی۔ یہ صاحب طراریِ طبیعت و تیزیِ ذہن و مضمون آفرینی میں بے مثال اور جملہ فنونِ شاعری میں باکمال ہیں۔ پہلے مرزا غالب دہلوی کے شاگرد ہوئے تھے، اب حضرت مذاق مدظلہم العالی سے مشورت سخن رکھتے ہیں۔ چونکہ ہر قسم کی لیاقت عمدہ تھی، امتحان دے کر وکالت میں درجۂ اعلیٰ کی سند پائی۔ چند مدت تک عدالت دیوانی میں وکالت کرتے رہے۔ تھوڑے عرصے سے اُس کو ترک کیا۔ اب نواب ٹونک مقیم بنارس کے داروغۂ کارخانہ جات ہیں۔"[2]

یہ ایک مختصر سا مطبوعہ رسالہ ہے جس میں صرف بدایوں کے شعرا کا مختصر حال اور انتخابِ کلام ہے۔ ان میں تقریباً سب ہی شاہ دلدار علی مذاق (شاگرد ذوق) کے تلامذہ ہیں۔ چونکہ "اول و آخرِ ایں کہنہ کتاب اُفتادہ است"۔ اِس لیے مصنف، عنوان کتاب اور سالِ تالیف و طباعت کے بارے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ داخلی قرائن سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۹۶ھ کے بعد کسی سال میں یہ لکھا گیا ہے۔

مندرجہ بالا بیان، اور ترجمہ مندرجہ "تلامذۂ غالب" میں کچھ جزوی اختلافات ہیں۔ ان کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ ایک بات ضمناً اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ قاضی عنایت حسین ہی کے ترجمے میں لکھا ہے کہ: "جب موسیٰ ندی میں طغیانی آئی (۱۹۰۸ء) اور ان کا گھر بار نذرِ سیلاب ہوا تو اُسی میں کلام بھی ضائع ہو گیا۔"[3]

---

[1] تلامذہ/۱۲۰۔ [2] تذکرۂ شعرائے بدایوں (مطبوعہ و ناقص)/۳۲-۳۳۔ [3] تلامذہ/۱۲۰۔

یہ مشہور طغیانی ۱۹۰۸ء میں نہیں غالباً ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء میں آئی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس طوفان میں جو اسباب تاراج ہوا، اسی میں گلشنِ ہند، مرزا علی لطف کا ایک قلمی نسخہ جناب غلام محمد مددگار کیبنیٹ کونسل دولتِ آصفیہ کو ملا تھا، جسے مولانا شبلی نعمانی نے ایڈٹ کر کے مقدمہ لکھا ہے، اور وہ پہلی بار ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا تھا۔[1]

۲۰۔ تلامذہ میں متعدد اشعار اس طرح نقل ہوئے ہیں جو وزن میں نہیں ہیں۔ اُن میں کہیں سہوِ کاتب ہے اور کہیں خود مؤلف سے تسامح ہوا ہے، بہر حال اُن کی تصحیح ضروری ہے۔ ایسے اشعار کی ایک نامکمل فہرست پیش کرتا ہوں۔ صرف وہی مصرع لکھا گیا ہے جو ساقط الوزن ہے۔ اُس کے سامنے قوسین میں صفحہ کا حوالہ ہے:

انور : تم ورنہ آفتِ صد کارواں ہو آج

(۴۲) (صحیح : آفتِ رہِ صد کارواں)

بیتاب : ساقی اگر نہیں، نہ ہو، مے سے کام ہے

(۵۲) (صحیح : ساقی اگر نہیں ہے الخ)

بیدل : قطرہ میں بحر کا تماشا

(۵۴) (صحیح : قطرے میں ہے الخ)

بے صبر : یار جب مجھ کو یاد آتا ہے
گریہ بے اختیار آتا ہے

(۵۶) (یہ مطلع ہے، لہذا پہلا مصرع یوں ہونا چاہیے:
یاد جب مجھ کو یار آتا ہے)

جوہر : روزے کہ دیدمت، شدم مبتلائے تو

(۸۲) (صحیح : ...... شدہ ام الخ)

حزیں : سب ناز سہے میں نے بے جا اور بجا اُن کے

(۹۳) (صحیح : بے جا و بجا)

---

[1] ملاحظہ ہو دیباچہ گلشنِ ہند۔

سیاح : مسندِ فقرا، پر زاہد نہ کرے کیوں کر تکیہ

(۱۵۷) (صحیح : مسندِ فقر پہ الخ)

شیفتہ : کچھ انتظار مجھ کو نہیں، مے کا نہ ساز کا

(۱۸۶) (صحیح : ..... مجھ کو نہ مے کا، نہ الخ)

شیفتہ : دل ہوا رنج سے خالی، تو جی بھر آیا

(۱۸۶) (صحیح : ...... خالی بھی، الخ)

شیفتہ : آں جا کہ خندہ آید بر پادشاہ گدا را

(۱۸۹) (صحیح : ...... بر پادشہ الخ)

صوفی : خوش ہوں جنوں سے میں، کہ کرتے ہیں التفات

(۱۸۹) (صحیح : ...... کہ وہ کرتے ہیں التفات الخ)

صوفی : بیک ملک دو حکمران نگنجد

(۱۹۸) (صحیح : یک ملک و دو حکمراں نگنجد)

صوفی : بارِ غم کیوں کر نہ ہوئے سرِ احباب کو داب

(۱۹۸) (صحیح : ...... کیوں کہ)

طالب : مگر چل گیا وار تیر نگاہ کا

(۲۰۰) (صحیح : تیرِ نگہ)

در قطعۂ تاریخ : رفتہ بخلد، طرزیِ شیریں بیاں

(۲۰۳) (صحیح : بخلدِ برین)

تاریخ از صہبائی : آمد بلبِ خود "چراغ دہلی"

(۲۰۹) (صحیح : بہ لبِ خرد)

عارف : رہن ہو جائے نہ جبّہ و دستار کہیں

(۲۲۲) (صحیح : نہ یہ)

عزیز : بیا، کہ پیریِ جواں بگر دانیم

(۲۳۵) (غالباً : بیا کہ عشق بہ پیری الخ)

تاریخ نازطالب: راز فوتش خود ز "اُغفرلی" برآر

(۲۵۳) (صحیح : سالِ فوتش)

مفتون : مثلِ چشمِ اغنیا تنگ است پیرہن مرا

(۲۶۳) (صحیح : پیراہن)

مفتون : چہ خوش ! کہ قاتلِ من

(۲۶۳) (خوش کے لعد ایک لفظ کم ہے مثلاً زندگی)

ناظم : میں نے کہا کہ دعوے الفت مگر غلط

(۲۷۷) (صحیح : دعویِ الفت)

ناظم : تجھ سے کچھ شکوہ، اے فلک پیر نہیں

(۲۷۸) (صحیح : مجھے اے فلکِ پیر)

ناظم : یہ روزِ سیہ ہے شب دیجور نہیں

(۲۷۸) (صحیح : شبِ دیجور نہیں ہے)

نشاط : چارہ سازِ بے پروا، دردِ لا دوا اپنا

(۲۸۱) (صحیح : بلا اضافت)

نشاط : نشاط، دل سے پہنچے تا در کعبہ، دلے واں بھی

(۲۸۱) (صحیح : نشاط ہم الخ)

نیر : دیدۂ صاحب نظراں از نظر افتاد

(۲۹۱) (صحیح : در دیدۂ الخ)

نیر : چلے آؤ شب تاب میں، کیسی شب ماہ

(۲۹۲) (مثلاً : شبِ مہتاب)

وفا : آہوں نے میرے یہ دل خراشی کی ہے

(۲۹۹) (صحیح : مری)

وفا : کیا ناز کرے اس پر کہ جب آخر کار

(۲۹۹) (صحیح : اُس پہ)

وکیل : ملے یوں لطف مے کشوں کو پیر مے خانہ

(۲۹۹) (ایک لفظ "لطف" کے بعد اور چاہیے)

۲۱۔ بعض شعرا کا صرف نام یا تخلص لکھا ہے، مگر اُن کے مآخذ کا اندراج نہیں کیا۔ مثلاً منشی ہیرا سنگھ درد (ص ۱۰۵)۔ منشی دیبی پرشاد سرور (ص ۱۵۰)۔ حکیم محمد علی صوفی نجیب آبادی (ص ۱۹۸)۔ سید بدرالدین احمد عرف فقیر صاحب دہلوی کاشف (ص ۲۵۰)۔

۲۲۔ نمبر ۳ کے تحت سطور بالا میں، بالمکند بے صبر کی تصانیف کا تذکرہ آچکا ہے۔ بے صبر کے سلسلے میں چند باتیں یہاں درج کرنا ضروری ہیں۔ مؤلفِ تلامذہ نے لکھا ہے کہ بے صبر اور تفتہ دونوں سکندر آباد کے رہنے والے تھے اور "غالباً ان سے کچھ عزیزداری بھی تھی"۔[۱]

(ا) بے صبر کے پسرِ خُرد سری برہما سروپ نے اگست ۱۸۸۵ء (۱۳۰۳ھ) میں ایک مضمون "سوانح عمری بے صبر" کے عنوان سے شائع کرایا تھا۔ اس کی بنیاد پر قاضی معراج دھولپوری بھی بے صبر پر ایک مفصل مضمون لکھ چکے ہیں۔[۲] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ بے صبر کے ماموں ہوتے تھے۔

(ب) جناب مالک رام نے لکھا ہے کہ "ستر برس کی عمر تھی جب ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا۔"[۳] اس حساب سے اُن کا سالِ پیدائش ۱۸۲۰ء تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ لیکن صحیح سالِ ولادت ۱۸۱۰ء (۱۲۲۵ء) ہے اور انتقال ۱۳ فروری ۱۸۸۵ء (مطابق ۱۳۰۲ھ) کو میرٹھ میں ہوا۔ اس طرح اُن کی عمر ۷۵ سال کی ہوئی۔[۴]

(ج) مالک رام صاحب کا بیان ہے کہ "..... اخگرِ عشق..... ۱۲۷۳ھ میں

---

[۱] تلامذہ/۵۵۔
[۲] اردو ادب (علی گڑھ) جلد ۶ شمارہ ۳۔
[۳] تلامذہ/۵۵۔
[۴] اردو ادب جلد ۶ شمارہ ۳۔

لکھی گئی تھی۔ "لالۂ پُر داغ" تاریخ ہے[۱] "لالۂ پُر داغ" سے ۱۲۷۳ھ ہی برآمد ہوتے ہیں لیکن مثنوی کا سالِ تصنیف ۱۲۷۵ھ ہے۔ اس تاریخ میں دو عدد کا تعمیہ کیا گیا تھا۔ مادۂ تاریخ یوں ہے:

جس کا سن "لالۂ پُر داغ" ملا پر وہ لالہ بہ سرِ باغ ملا

۱۲۷۳ +۲ = ۱۲۷۵ھ

۱۲۷۳ھ میں سر باغ (یعنی ب) کے دو عدد شامل ہوں تب صحیح سالِ تصنیف ہاتھ آتا ہے۔[۲] "مثنوی لختِ جگر" کا تذکرہ 'تلامذہ' میں ہے لیکن سالِ تالیف نہیں بتایا۔ یہ ۱۲۵۳ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔

(۵) بے صبر کی تصانیف کی مجموعی تعداد دو درجن کے لگ بھگ ہو تو عجب نہیں۔ مناسب ہوگا کہ آیندہ ایڈیشن میں فاضل مرتّب اُن کی ایک فہرست بھی شامل کر دیں۔[۳]

مجھے اس تبصرے کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں۔ مجھ سے پہلے جناب تمکین کاظمی اپنے تبصرے میں بعض تسامحات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں[۴] میں نے ان کا اعادہ کرنا غیر ضروری سمجھا ہے۔

LIBRARY
IDARE-ADBIYAT-E-URDU
ACC. No ۳۳۵۷۵
۸ جولائی

۱۔ تلامذہ/۵۵۔

۲۔ ملاحظہ ہو اردو ادب، جلد ۶ ش ۳۔ نیز ہماری زبان علی گڑھ یکم جولائی ۱۹۵۷ء و ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء۔

۳۔ اس سلسلے میں ہری کشن راز کا مضمون "منشی بالمکند بے صبر" مطبوعہ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جلد ۱۴ شمارہ (ستمبر ۱۹۵۹ء) بھی قابلِ قدر ہے۔

۴۔ تحریک: دہلی جلد ۶ شمارہ ۱۲ اپریل

اردوے معلّیٰ : غالب نمبر

(ایک "علمی و تحقیقی" رسالے کا جائزہ)

اردو کے شاعروں میں مرزا غالب کی شخصیت آج بھی اپنے اندر رومینی رکھتی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل سے اب تک مرزا کی زندگی شخصیت اور شاعری سے متعلق ایک ہزار سے زیادہ مضامین، مقالے اور تبصرے لکھے گئے ہیں۔[1] لکھنے والوں نے اسے ایک "عظیم انسان" اور "فلسفی" سے لے کر جھوٹا اور مکار تک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔[2] اور تماشا یہ ہے کہ "غالب کے طرف دار" ہوں یا "غالب شکن" اس کے نام کی برکت سے انھیں کچھ نہ کچھ حصّہ مل ہی جاتا ہے۔

ہر سال ماہ فروری میں غالب کی یاد منائی جاتی ہے۔ رسالہ "آجکل" (دہلی) اور "ماہِ نو" (کراچی) تو باالالتزام کچھ نہ کچھ ہر سال غالب سے متعلق شائع کرتے ہی ہیں، دوسرے رسالے بھی اپنی والی کوشش کر کے کوئی نہ کوئی پہلو سخن گستری کا نکال ہی لیتے ہیں۔ اس سال دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے ایک شش ماہی رسالہ "اردوے معلّی" کے نام سے

---

[1] ملاحظہ ہو "غالب نما" مرتبہ نثار احمد فاروقی، رسالہ برہان، فروری۔ اپریل ۱۹۶۰ء، تحریک، مارچ ۱۹۶۰ء۔

[2] عبدالمالک آروی : غالب کی اخلاقی کمزوریاں۔ نگار، مارچ ۱۹۲۹ء نیز "غالب بہ حیثیت محقق" مشمولہ "نقد غالب"۔

جاری کیا ہے، یہ بڑا مبارک اور مستحسن کام ہے۔ دہلی اردو کا مرکز اور ہندوستان کی راجدھانی ہے۔ یہاں سے کسی ادبی رسالے کا اجرا ظاہر ہے کس خوشی اور اطمینان کا موجب ہو گا۔ اردوے معلی کا پہلا شمارہ (فروری ۱۹۶۰ء) غالب سے متعلق مضامین و مقالات کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک سو ساٹھ صفحے کی اچھی خاصی کتاب ہے۔ ظاہری حسن دلکش اور نظر فریب ہے۔ رسالے کے ایڈیٹر، شعبۂ اردو کے صدر، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ہیں جو "میر تقی میر" لکھ کر اچھی خاصی شہرت کما چکے ہیں۔ پہلے شمارہ میں مضامین قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر اشرف، مولانا نیاز فتح پوری، خلیق انجم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر گیان چند جین جیسے معتبر اور سنجیدہ لکھنے والوں کے شامل ہیں۔ مولانا امتیاز علی عرشی کا مضمون اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سے غالب کی بعض نئی فارسی تحریریں پہلی بار سامنے آتی ہیں اور غالب شناسوں کے لیے نیا مسالا فراہم کرتی ہیں یوں کہ نوابانِ لوہارو کا کتب خانہ اب رام پور کی رضا لائبریری میں محفوظ کرا دیا گیا ہے۔ اس میں بعض قدیم مطبوعہ کتابیں ایسی بھی آئی ہیں جو مرزا غالب کے مطالعہ میں رہ چکی ہیں یعنی لالہ ٹیک چند بہار کا رسالہ "ابطال ضرورت" خان آرزو کا رسالہ اور وارستہ سیالکوٹی کی تالیف "مصطلحات الشعراء" دوران مطالعہ میں غالب کی "رگ تحقیق" پھڑکی ہے تو انھوں نے حواشی میں اپنے قلم سے نوٹ بھی لکھ دیے ہیں۔ ان میں سے بعض بہت دلچسپ ہیں۔ مولانا عرشی نے ان تحریروں کو بڑے سلیقے اور ضبط و نظم کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ "غالبیات" کے سلسلے میں یقیناً نئی اور اہم دریافت ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے غالب کے کلیات نظم فارسی کے ایک قدیم نسخے کا تعارف کرایا ہے۔ اور متداول کلیات کے بعض اہم اختلافات کی نشان دہی کی ہے۔ جناب خلیق انجم نے "غالب کی قیام گاہوں" پر لکھا ہے، جس میں "مہد سے لحد تک" کی بہت سی منزلیں آ گئی ہیں۔ بعض مکانوں کے فوٹو بھی دیے ہیں جن کی وجہ سے مضمون بہت دلچسپ ہو گیا ہے۔

ایڈیٹر کی طرف سے شذرات میں یہ کہا گیا ہے کہ اس شش ماہی رسالے کا

مقصد "تحقیقی اور علمی ضرورتوں" کو پورا کرنا ہے[1]۔ چونکہ "تحقیقی اور علمی" کاموں کی ذمہ داریاں بہت نازک ہوتی ہیں اس لیے ہمیں یہ توقع تھی کہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں شائع ہونے والا یہ مجلہ کم از کم معمولی غلطیوں سے تو ضرور پاک ہوگا۔ لیکن یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ صرف اس میں املا و انشا کی غلطیاں ہیں بلکہ "علمی تحقیق" کے اعتبار سے بھی بہت کچھ محتاجِ اصلاح ہے۔ چند ضروری امور کی طرف سطورِ ذیل میں توجہ دلائی گئی ہے:

۱۔ "اردوئے معلی" غالب کے مجموعۂ مکاتیب کا نام ہے۔ پھر مولانا حسرت موہانی مرحوم اسی نام کا رسالہ علی گڑھ اور کانپور سے شائع کر چکے ہیں۔ اور رسالوں میں یہ نام گویا ان کے لیے مختص ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ منشی قربان علی بسمل وغیرہ نے اسی نام کا ایک رسالہ دہلی سے جاری کیا تھا[2] جو کتابی سائز پر شائع ہوتا تھا اور بہت دنوں زندہ رہ کر بند ہوگیا۔ شعبۂ اردو کو اب کوئی نیا نام تلاش کرنا تھا تاکہ التباس پیدا نہ ہو۔

۲۔ زیرِ نظر شمارے کے سرورق پر جو تصویر دی گئی ہے وہ قطعاً جعلی اور غیر مستند ہے۔ غالب کی اصلی اور معتبر تصاویر دستیاب ہو جاتی ہیں جن میں کچھ موقلم سے بنائی ہوئی ہیں اور ایک تصویر کیمرے کی ہے[3]۔ "اردوئے معلی" میں جو تصویر شامل کی گئی ہے وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی فرمایش سے زمانۂ حال کے کسی مصور نے تیار کی تھی اور پہلی بار

---

[1] رسالہ اردوئے معلی، دہلی / ۵-۶۔

[2] اس کے چند فائل کتب خانہ نذیریہ دہلی میں محفوظ ہیں اور راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں۔

[3] "دیوان غالب نسخۂ عرشی" میں یہ تصویر شامل ہے قلمی تصاویر میں وہ مستند ہے جو کتب خانہ حبیب گنج میں محفوظ ہے۔ اور ڈاک خانے کے ٹکٹوں پر بھی چھپ چکی ہے۔ حبیب گنج والی تصویر "ذکرِ غالب" مصنفہ مالک رام میں بھی شامل ہے۔ نیز دیکھو رسالہ "زمانہ" کانپور جلد ۷۰، شمارہ جولائی ۱۹۶۳ء اور "احوالِ غالب" مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو۔

جناب نیر بھوروی نے حال ہی میں "مرقع غالب" کے نام سے تمام مستند اور غیر مستند تصاویر مع تعارف کے شائع کرا دی ہیں۔

دیوانِ غالب کے جرمنی ایڈیشن میں چھپی تھی۔ مستند تصاویر کی موجودگی میں اس کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آسکی۔

۳۔ ایک رسالہ جو کسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے "تحقیقی و علمی ضرورتوں" کو پورا کرنے کے لیے نکلے کم از کم صحتِ املا کے لحاظ سے نامعتبر نہیں ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں "روشِ عام" کی تقلید سند نہیں ہو سکتی۔ راقم الحروف کو یہاں ایک لطیفہ یاد آگیا کہ ایک بزرگ کسی شہر میں پہنچے اور وہاں ایک عالم کی بڑی شہرت سنی تو ملاقات کے مشتاق ہو کر اس سے ملنے کے لیے گئے۔ وہ بزرگوار اس وقت کچھ لکھ رہے تھے، ان کو دیکھ کر کاغذ قلم ایک طرف رکھ دیا اور کھڑے ہو کر استقبال کیا، ابھی بیٹھ کر بات بھی کرنے نہ پائے کہ تھے کہ ملاقاتی کبیدہ خاطر ہو کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے " لاحول ولا قوۃ ! میں نے تو اس شہر میں آپ کا شہرہ سنا تھا۔ بڑے عالم و فاضل ہیں یہاں تو املا بھی صحیح نہیں " لائق "کو "ی" سے (لایق) لکھا جا رہا ہے" یہ کہہ کر واپس آگئے۔ انھوں نے تو ایک لفظ کا غلط املا دیکھ کر اتنے تیور چڑھائے تھے اگر یہ "علمی و تحقیقی" مجلّہ ملاحظہ فرما لیتے تو شاید دنیا ہی سے بیزار ہو جاتے۔ کیوں کہ اس کی پہلی ہی سطر میں "شائع" کو "شایع"، "مبدأ" کو "مبدء" لکھا گیا ہے۔ اور علیٰ ہذا :

"عالی جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب بالقابہ" (ص ۵)۔ یہاں "ڈاکٹر" لکھنے کے بعد سارے القاب غیر ضروری ہیں۔ علاحدہ، قایم (ص ۵) "وسایل اور ذرایع" (ص ۶) انشاء اللہ[1] (ص ۷)" دیئے " (ص ۹) اور ہر جگہ اس طرح لکھا ہے کہ "ی" کے نقطے بھی موجود ہیں اور ہمزہ بھی۔ حالانکہ ہمزہ زائد ہے۔ ایک جگہ ۱۲۶۸ھ کو مطابق ۵۲-۱۹۵۱ء لکھا ہے (ص ۱۰)۔ اگر ہجری سال صحیح ہے ۵۲-۱۸۵۱ء ہونا چاہیے۔ "فلک اضافت" (ص ۱۴) یہ نئی ترکیب ہے۔ تایل (ص ۱۶) " زرہ" (ص ۱۸) دو جگہ آیا ہے۔ اور "زرہ" درکار ہے۔ مضایقہ (ص ۲۰) فرایض (ص ۴۷) سایل (ص ۵۲) "انقلاب وارد ہو" (ص ۶۸)

---

[1] صحیح املا "ان شاء اللہ" ہے کیوں کہ "ان" حرف ہے "شاء" فعل۔ "ان" کو ملا کر لکھنے سے "انشاء" کے معنی بدل جائیں گے۔

"فی زمانہ" (ص ۶۸) وفایق (ص ۷۲) سنے گیے (ص ۷۴) "کچھ دیواریں اور کھپریل" (۸۴) "کچی دیواریں" چاہیے۔ گمان یہ گزرتا تھا کہ کٹگھرے ہے اور صبح کو پھانسی ملے گی" (ص ۸۶) اصل عبارت یوں ہے "گمان یہ گذرتا تھا کہ کٹگھرے ہے اور صبح کو مجھے پھانسی ملے گی"۔[1] ضایع (ص ۱۰۸) طبایع ضایع، بدایع، لایق (ص ۱۱۲) ؏ "اس کے رخ سے صبح کا دھوکا نہ کہا مرغ سحر" (ص ۱۱۳) ؏ "خامشی سے فایدہ اخفاے حال ہے (ص ۱۴۶) "محبت پیش گاں" (ص ۱۴۸) دربردو جال (۱۴۸) اپنے ملک کی رندی (ص ۱۵۰) عرایف، سایل، آگیے (ص ۱۵۱) یہ خط وکتابت ۱۲۵۳ھ سے ۱۲۵۶ھ تک جاری رہی (ص ۱۴۳) زایل (ص ۱۵۷) حقایق (ص ۱۵۸) وغیرہ۔

۴۔ قاضی عبدالودود صاحب نے ایک جگہ غالب پر اعتراض کیا ہے کہ وہ عربی سے اتنے نابلد تھے کہ ضمیر مذکر و مونث تک کی تمیز نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے ایک جگہ اپنی والدہ کو "مدظلہ العالی" اور دوسری جگہ ملکہ وکٹوریہ کے لیے "خلد اللہ ملکہ" لکھا ہے۔[2] غالب کے تتبع میں اس "غالب نمبر" نے بھی یہ غلطی کی ہے۔ شذرات کے بعد مدح کے کچھ اشعار دیے ہیں جن کے عنوان میں "آنسہ اسماء سعیدی" کو "متعلم" لکھا گیا ہے۔ (ص ۹)

۵۔ اضافت کا عام قاعدہ ہے۔ اگر مضاف کے آخر میں حرفِ علت یا ہمزہ نہ ہو تو اسے کسرہ دیا جائے گا جیسے "نظرِ کرم" میں "ر" پر زیر آگیا لیکن حرفِ علت ہونے کی صورت میں علامتِ اضافت یعنی زیر کو "ی" سے ظاہر کیا جاتا ہے جیسے علما سے "علماے کرام" "خو" سے "خوے بد" وغیرہ۔ اس اصول پر اساتذہ بڑی سختی سے کاربند رہے ہیں اور غالب نے بھی اپنے ایک خط میں ایک شاگرد کو ایسی غلطی پر ٹوکا ہے۔ زیرِ نظر رسالے میں یا تو ہمزہ کا اتنا التزام ہے کہ "آئے، جائے، کھائے" اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ جن پر ہمزہ درکار ہے، وہاں سے بھی ندارد کر دیا، یا "ازروی فرمان، دنیای اسلام، ناخدای سخن" جیسی تراکیب میں بھی ہمزہ موجود ہے جہاں ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

---

[1] اردوے معلی (خطوطِ غالب) / ۲۹۸۔

[2] نقدِ غالب، مرتبہ مختارالدین احمد / ۵۲۵۔

۶۔ "ہندستان" اور ہندوستان کے املا پر بحث بہت ہو چکی ہے بعض کے نزدیک دونوں صورتیں درست ہیں اور بقول بعض ایک ۔ خود میں "ہندستان (بغیر واو) کا حامی ہوں ۔ مگر اس رسالے میں طرح دیا ہوا ہے ۔ کسی ایک املا کی پابندی مناسب تھی ۔ خواہ دونوں طرح درست ہو ۔

اصولِ املا کے لحاظ سے "گئے، نئے" وغیرہ میں ہمزہ چاہیے، "ی" کے نقطے درکار نہیں، مگر "لیے، پیے، جیے" وغیرہ میں ہمزہ بے کار ہے، رسالے میں اکثر جگہ خلاف ورزی کی گئی ہے ۔

۷ ۔ غالب کے سلسلے میں متفرق کتابوں اور اخباروں سے اہم اقتباسات دیے گئے ہیں ۔ مگر اس طرح :

"خواجہ احمد فاروقی بحوالہ روزنامچہ جیون لال، ورق ۳۸ ۔ الف و ب" یا "خواجہ احمد فاروقی بہ حوالہ گلدستہ نازنیناں وغیرہ ایسے مواقع پر مرتّب نے اپنا نام درج کرنا کیوں ضروری سمجھا ہے یہ معما حل نہ ہو سکا ۔ کیا "روزنامچہ جیون لال"، "دہلی اردو اخبار" اور "گلدستہ نازنیناں" ان کی تصانیف کے نام ہیں اگر ایسا ہے تو صراحت ضروری تھی ۔

۸ ۔ فارسی اور ہندی، یا ہندی اور ہندی الفاظ کے مابین واو عطف کا داخلہ ممنوع ہے مثلاً یوں نہیں کہیں گے "پیالہ و گھڑا" یا "پیار اور پریم" ۔ اگرچہ پہلی صورت میر کے ہاں ملتی ہے ۔ "بہتیری باتیں ہوئی ہیں اخلاص و پیار کی" یا "جامۂ مستیِ عشق اپنا مگر کم گھیر تھا" لیکن اس وقت زبان "ان گھڑ" تھی اور بقول حاتم "سر کو دھڑ کا قافیہ" باندھ دیتے تھے ۔ بعد میں اساتذہ نے ایسی ترکیبوں کو ٹکسال سے باہر کر دیا ۔ اس رسالے میں ان معمولی باتوں کا لحاظ بھی نہیں رکھا گیا ۔ "چھٹی و ساتویں و آٹھویں" (ص ۶۹) اسی کی مثال ہے ۔ ایک جگہ "جائے رہائش" کی ترکیب بھی ملتی ہے ۔ اوّل تو "جائے" پر ہمزہ، پھر "رہائش" کو "ی" سے لکھنا غلط ۔ آخری میں پوری ترکیب مہمل "رہائش"، نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی ــ یہ کچہری کے محرّروں کی زبان ہے اور علمی رتبہ سے فروتر ۔

۹ ۔ "غالب نے ایک ایرانی کی صحبت و شاگردی اختیار کی" (ص ۶۷) ۔ اگر اس

ایرانی سے ملا عبد الصمد مراد ہے تو اس کا خارجی وجود مشتبہ ہے[1]۔ اگر نئی تحقیق سے اس کا وجود خارجی ثابت ہو چکا ہے تو اس کی صراحت ضروری تھی۔

۱۰۔ غالب کی قیام گاہوں کے سلسلے میں "گلی قاسم جان کے اصلی والے پھاٹک" کو (تصویر نمبر ۶) نواب الٰہی بخش خاں معروف کا مکان بتایا ہے، یہ ثبوت کا محتاج ہے۔ اس معاملے میں حمیدہ سلطان صاحبہ کے بیان کو بطور سند پیش کیا ہے۔ وہ معروف کی ہم عصر نہیں ہیں، نہ ان کی شہادت قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ اسی مکان میں غالب کی شادی ہوئی تھی۔ ثبوت درکار ہے۔ اصلاً یہ نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم کے والد (نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں) کا بنوایا ہوا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس مکان میں بگا بیگم کی شادی ہوئی ہو۔

۱۱۔ اسی محولہ بالا مضمون میں ایک فارسی عبارت اردوئے معلّیٰ کے صفحہ ۳۱۸ کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ (ص ۸۷) مگر اصل کتاب سے غیر حاضر ہے اور کلیات نثر غالب میں موجود ہے۔

آفاق دہلوی مرتب "نادراتِ غالب" کے حوالے سے لکھا ہے کہ غالب قمار خانہ قائم کرنے کے الزام میں کالے صاحب کے مکان سے گرفتار ہوئے تھے۔ اس سے اختلاف نہیں کیا۔ یہ غلط ہے کالے صاحب کے مکان میں غالب اواخر جولائی ۱۸۴۷ء میں آئے ہیں مگر مضمون نگار نے مئی ۱۸۴۷ء لکھا ہے۔

اسی طرح حکیم محمود خاں والے مکان کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے تشنہ ہے۔ چند باتیں قابلِ غور ہیں:

(الف) غالب کالے خاں صاحب کی حویلی سے اٹھ کر حکیم محمود خاں کے بھائی (حکیم محمد حسن خاں) کے مکان میں آرہے تھے۔ اور یہ مکان وہی ہے جسے غالب نے "تنگ نائے" کہا ہے، محمد حسن خاں کی حویلی تھی جس کا بیشتر حصّہ منہدم ہو کر دوبارہ تعمیر

---

[1] دیکھو احوالِ غالب، مرتبہ مختار الدین احمد (مقالہ قاضی عبد الودود)۔

ہو چکا ہے۔[1]

(ب) مضمون نگار نے "کروڑا والی حویلی" کا محلِ وقوع ہمدرد دواخانے کے سامنے گلی قاسم جان میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر بتایا ہے۔ درآں حالیکہ یہ "بائیں ہاتھ پر واقع ہے اور اب اصلی حالت میں محفوظ نہیں۔

(ج) "اسماعیل خاں کا مکان" کے عنوان سے مضمون نگار نے لکھا ہے کہ یہ مکان "گلی قاسم جان کے اس نکڑ پر واقع تھا جو بلّی ماران کی طرف ہے۔ اس مکان کے سامنے ہندوستانی دواخانہ ہے"۔

واقعہ یہ ہے کہ جہاں اب ہندوستانی دواخانہ ہے یہاں پہلے حکیم محمود خاں کی بہن کا مکان تھا جو حکیم مظفر حسین سے بیاہی تھیں۔ حکیم مظفر خاں ٹونک چلے گئے تھے۔ ان کے اس مکان میں غالب کا زنان خانہ تھا۔ مسجد کے عقب میں غالب کے رہنے کا مکان تھا جسے مردانہ مکان کہہ سکتے ہیں۔ یہ حویلی بہت بڑی تھی۔ جب ورثہ میں تقسیم ہوئی تو حکیم اجمل خاں کے حصّے میں اصطبل بنوا لیے گئے تھے۔ وہ بعد میں ان کے صاحبزادے حکیم جمیل خاں نے فروخت کر دیا۔ حکیم اجمل خاں اور حکیم عبدالمجید خاں کے حصّے کا مکان ابھی کم و بیش اپنی پہلی حالت پر موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسماعیل خاں سے اس کو کچھ علاقہ نہیں۔

(د) انھوں نے لکھا ہے کہ غالب کی ولادت یقیناً ان کے ننھیال ہی میں ہوئی۔[2]

غالب کی کسی تحریر سے اس "یقیناً" کی تائید نہیں ہوتی۔ مالک رام صاحب نے اگرچہ ایسا خیال ظاہر کیا ہے[3] لیکن یقیناً وہ بھی نہیں کہہ سکتے۔

(ر) "غالب نے ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) سے دہلی میں سکونت اختیار کر لی"۔[4]

---

[1] جس مکان میں آج کل سلطان یار خاں وکیل رہتے ہیں یہ بھی محمد حسن خاں کی حویلی کا ایک حصّہ تھا اور اس کے ڈانڈے وہاں تک تھے جہاں اب حکیم عبدالحیؔ انصاری کا مطب اور اس کے نیچے ایک ہوٹل ہے۔

[2] اردوئے معلّی، غالب نمبر/ ۷۵۔

[3] ذکرِ غالب/ ۲۱۔

[4] اردوئے معلّی، غالب نمبر/ ۷۷۔

یہ قطعیت کے ساتھ متعین نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شادی سے پہلے بھی دہلی آتے جاتے تھے اور شادی کے معاً بعد ہی دہلی میں مقیم نہیں ہوئے۔ اگر ملا عبد الصمد کا وجود خارجی تسلیم کر لیا جائے تو غالب نے بقول خود ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۰۔ ۱۸۱۱ء) میں اس سے ملاقات کی اور دو برس اپنا مہمان رکھا اور آگرہ کے زمانۂ قیام کی بات بتاتے ہیں۔ اس لیے خود ان کا ۱۲۲۸ھ (۱۲-۱۸۱۳ء) تک آگرے میں ہونا تو بہر حال ثابت ہے[1]

اس میں شبہ نہیں کہ جناب خلیق انجم نے جو ایک نوجوان ادیب اور نقاد ہیں، بڑی محنت سے یہ مضمون لکھا ہے لیکن بعض پہلو تفصیل طلب رہ گئے ہیں اور یہ معمولی سی فروگزاشتیں کھٹکنے لگتی ہیں۔

۱۳۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے "غالب اور بھوپال" کے عنوان سے دو انکشاف کیے ہیں۔ ایک تو غالب کی وہ غزل جس کا مقطع ہے:

پیرانہ سال غالب مے کش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

جعلی ثابت کی ہے۔ دوسرے نسخۂ حمیدیہ کے غائب ہونے کی کہانی بتائی ہے۔ جس وقت جناب مالک رام دیوانِ غالب مرتب کر رہے تھے اور اس غزل کو شامل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، میں نے بھی شبہ ظاہر کیا تھا کہ غالب کی کسی تحریر سے یا کسی دوسرے ماخذ سے ان کا بھوپال جانا ثابت نہیں ہوتا۔ مگر انھوں نے یہ فرمایا کہ غالب ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے ہیں اور ان کے خطوط ۱۸۴۹ء سے ملنا شروع ہوتے ہیں۔ ۵۲ برس کی اس طویل مدت میں صرف ان کے سفرِ کلکتہ اور چند دوسرے واقعات کا علم ہوتا ہے اور آدھی صدی کے کتنے ہی اہم واقعات ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔ خارجی شواہد کی روشنی میں یہ بات اتنی مستبعد بھی نہیں تھی اور اس غزل کے جعلی ہونے کا ثبوت بھی نہیں ملتا تھا۔ اس لیے ان کا اس غزل کو دیوان میں شامل کر لینا کچھ ایسا ناروا بھی

---

[1] غالب کی قیام گاہوں کے سلسلے میں میرا ماخذ حکیم محمد کامل خاں صاحب ہیں جو شریف منزل بلی ماران میں رہتے ہیں اور شریف خانی خاندان کے معمر فرد ہیں۔

نہیں تھا اس کے جعلی ہونے کی داستان دیوان طبع ہونے کے بعد معلوم ہوئی ہے۔ حضرت مولانا امتیاز علی عرشی نے بھی اپنے مرتبہ دیوان میں اس غزل کو شامل کیا ہے[1] اس سے ان بزرگوں پر غیر ذمہ داری کا الزام لگانا زیادتی ہے۔

اس مضمون میں بڑی احتیاط کے ساتھ "نسخۂ حمیدیہ" کے غائب کرنے کا الزام بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق پر لگا دیا گیا ہے۔ میں اس بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں الحمدللہ مولوی عبدالحق ابھی سلامت ہیں، وہ خود تردید یا توثیق کر سکتے ہیں (جس وقت یہ مضمون لکھا گیا تھا [جون ۱۹۶۰ء] اس وقت موصوف حیات تھے)۔

۱۴۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جو اردو کے ذہین اور بالغ نظر محقق ہیں، "غالب کا ایک نیا خط" کے عنوان سے سخاوت حسین مدہوش بدایونی کے نام غالب کا ایک خط پیش کیا ہے، جو سب سے پہلے رسالہ "سراج سخن" میں شائع ہوا تھا اور خطوطِ غالب کے کسی مجموعے میں نہیں آسکا ہے۔ یہی خط جناب فرخ جلالی نے ضروری تمہید کے ساتھ "آج کل" (غالب نمبر، فروری ۱۹۶۰ء) میں شائع کرا دیا ہے۔ نارنگ صاحب نے اس پر صرف یہ اضافہ کیا ہے کہ رسالہ "سراج سخن" کے بارے میں زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ اہم ہے مگر غالبیات کے سلسلے میں بالکل غیر متعلق سی بات ہے۔

۱۵۔ کوئی صاحب محمد ذاکر ہیں۔ انھوں نے "دیوانِ غالب کا پہلا اور آخری مطبوعہ نسخہ" سامنے رکھ کر اختلافات کی نشان دہی کی ہے۔ پہلے نسخے سے مراد مطبع "دیوانِ غالب نسخۂ عرشی" کو قرار دیا ہے۔ (حالانکہ دیوانِ غالب کے چند ایڈیشن نسخۂ عرشی کے بعد بھی چھپ چکے ہیں) معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار کی نیت عرشی صاحب کو متہم کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان کی تحقیق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "سرسید نے آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں اسی چھاپے خانے سے شائع کیا تھا لیکن آثار الصنادید پر مطبع سید الاخبار نہیں بلکہ سید المطابع درج ہے۔"

---

[1] دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ۳۰۲۔

یہ عبارت موصوف نے "ہندوستانی اخبار نویسی" سے نقل کر لی ہے، خود آثار الصنادید کی زیارت نہیں کی جس کی طبع اول کے پہلے ہی صفحے پر جلی قلم سے :

"در مطبع سید الاخبار با ہتمام سید عبد الغفور بقالب طبع در آمد"

لکھا ہوا ہے، جہاں انھوں نے عرشی صاحب کے بیان کردہ پندرہ سطری مسطر کی تغلیط کی ہے وہاں یہ بھول گئے ہیں کہ مسطر میں مکتوبی اور غیر مکتوبی دونوں ہی سطریں شمار ہوتی ہیں۔ عرشی صاحب کا بیان غلط نہیں ہے۔ انھوں نے صولت پبلک لائبریری رامپور کے نسخے سے فائدہ اٹھایا ہے اور یہ نسخہ راقم الحروف نے بھی دیکھا تھا۔

مقالہ نگار نے ایک ایسا اعتراض کیا ہے جس پر ہنسی آتی ہے یعنی غالب کے دیباچہ، دیوان میں عبارتیں پیراگراف کی صورت میں نہیں تھیں اور تشکیل اور اضافتیں بھی نہیں دی گئیں۔ عرشی صاحب نے ایسا کیا ہے گویا "بدعت" کر کے غالب کے دیباچے کا مطلب ہی فوت کر دیا ہے لیکن موصوف کو شاید علم نہیں کہ غالب کے دیباچے ہی پر موقوف نہیں اس زمانے اور اس کے بعد بھی ۲۵۔۳۰ برس کے عرصے میں چھپی ہوئی کسی کتاب پر دہ اعراب یا باقاعدہ پیراگراف اور رموزِ اوقاف نہیں دکھا سکتے۔ ان کا رواج پنجاب میں تعلیمات کے ڈائرکٹر کرنل ہالرائڈ وغیرہ کی کوششوں سے ہوا ہے اور موجودہ آداب تحریر میں ان کا لحاظ بے حد ضروری ہے۔ عرشی صاحب نے اگر اسے رموزِ اوقاف اور تشکیل و اضافت کے ساتھ پیراگراف میں تقسیم کر کے نقل کیا ہے تو یہ بات قابلِ تعریف ہے نہ کہ قابلِ اعتراض۔

رہا صحیح تعدادِ اشعار کا معاملہ تو یہ ایسا نہیں کہ اس پر اتنی طویل بحث کی جائے۔ سیدھی بات ہے کہ پہلے ایڈیشن میں جتنے اشعار ہیں انھیں شمار کر لیا جائے اور وہی صحیح تعداد ہے۔ عرشی صاحب نے نسخۂ عرشی کے دیباچے میں ہر ردیف کے اشعار کی صحیح تعداد پیش کر دی ہے، اس کی تغلیط اسی وقت ممکن ہے جب مضمون نگار ہر ردیف کے اشعار کی صحیح تعداد خود شمار کر کے پیش کریں۔

اختلافات نسخ کی نشاندہی میں بھی انھوں نے یہ بات فراموش کر دی ہے کہ ۱۸۴۱ء کے بعد خود غالب کی زندگی میں ان کے دواوین کے متعدد ایڈیشن چھپے ہیں اور ان میں

غالب نے ردو بدل بھی کیا ہے۔ اس لیے صحیح متن وہ سمجھا جائے گا جو غالب کی نظر سے آخری بار گزر کر چھپا۔ اگر ۱۸۴۱ء کے نسخے میں کچھ باتیں متداول دواوین سے مختلف ہیں تو ان کی نوعیت ایک مضمون کے مسالے کی ہو سکتی ہے مگر ان کی بنیاد پر دیوان کے متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔

۱۶۔ جناب خواجہ احمد فاروقی کے اس مجموعے میں متعدد مضامین ہیں، پہلا مضمون "غالب کے ایک شاگرد مولانا بیدل" پر لکھا گیا ہے۔ مگر ان کی تصانیف کا پورا تعارف نہیں کرایا۔ عبدالسمیع بیدل کا وطن "رامپور ضلع سہارنپور" دواوین میں لکھا ہے۔ مگر اس طرف اشارہ نہیں کیا کہ وہ ریاست رامپور سے مختلف ایک مقام ہے۔ بظاہر مضمون نگار کو اس کا علم نہیں ورنہ مالک رام پر یہاں بھی اعتراض کرتے۔

عبدالسمیع بیدل کی سب تصانیف کے "پیش نظر" ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن قریب بہ یقین ہے کہ بعض تصانیف جن کا سرسری تعارف کرایا گیا ہے، ان کے سامنے نہیں ہیں اور یہ معلومات کسی دوسرے ذریعے سے اخذ کر کے دی گئی ہیں۔ مثلاً "حمد باری" کے ذیل میں لکھا ہے:

بیان لغات میں منظوم رسالہ۔ مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۳۱۳ھ تعداد صفحات ۳۲ ابتدا:

سیل ہے رو اور نالا ہے دبیر
ندی ارغاب اور تالاب آب گیر (ص ۱۱۶)

ہمارے سامنے "حمد باری" کا جو ایڈیشن ہے وہ ۱۳۲۷ھ میں مطبع قاسمی میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔ اس کی ابتدا "التماس مولف" سے ہوتی ہے جو تین صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ تلخیص ملاحظہ ہو:

کہتا ہے ..... عبدالسمیع رامپوری کہ جس وقت ..... شیخ الٰہی بخش کے چھوٹے بھائی حقیقی یعنی ..... حافظ عبدالکریم صاحب کے فرزند ..... وحیدالدین نے فارسی پڑھنے کی طرف طبیعت رجوع کی خالق باری شروع کی۔ اس کتاب کے بعض الفاظ پنجابی اور سنسکرت اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے ..... تب میں نے ..... بیان لغات

یہ رسالہ ...... لکھا ..... وقت تالیف رسالہ چند نسخ معتبرہ ..... مثل صراح والنفس و برہان قاطع و غیاث اللغات و نفائس اللغات اس عاجز کے پیش نظر رہتے تھے ..... اگر کسی صاحب کو شبہ واشکال ہو..... تو ..... مجھ کو تیر ملامت کا نشانہ نہ بناویں بلکہ اوّلاً حواشی رسالہ ہٰذا ..... ملاحظہ فرماویں .....“ (مقدمہ ؛ حمد باری)۔

تین صفحوں کے اس مقدمہ کے بعد اصل رسالہ شروع ہوتا ہے جس میں پہلے حمد ہے۔ ابتدا:

حمد باری لکھ کے اور نعت رسول
جو لکھے بیدل کرو دل سے قبول
ہے خدا اللہ پیغمبر رسول
ہے صحابی جس کو ہو صحبت حصول

پھر ”فصل در بیان آسمان و متعلقات آں“ (ص ۶) اس کے بعد ”فصل در بیان سال و ماہ وغیرہ“ (ص ۷) پھر ”فصل در بیان زمین و آنچہ دران است از معاون و بحار و اماکن وغیرہ“ (ص ۸)۔ اس فصل میں چھ شعروں کے بعد ساتواں شعر یہ آتا ہے جسے ڈاکٹر فاروقی نے اپنے مضمون میں ”ابتدا“ کا شعر بتایا ہے:

سیل ہے رو اور نالا اے دبیر
ندی ارغاب اور تالاب آب گیر (حمد باری، ص ۹)

یہ خالق باری کے طرز کا مختصر سا رسالہ ہے۔ اس کے حواشی میں مشکل الفاظ کی تشریح اختر امروہوی نے کی ہے۔ حافظ محمود شیرانی خالق باری کے مقدمے میں اس رسالے کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فاروقی نے بیدل کی ”تصانیف کو ملاحظہ نہیں فرمایا کسی اور ذریعے سے معلومات اخذ کی ہیں۔ ورنہ وہ اس کے مندرجات سے ہمیں صحیح طور پر مطلع فرماتے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ مضامین لکھتے وقت فاضل مضمون نگار نے اپنی توجہ دوسری مہمات پر مرکوز رکھی ہے۔ انھوں نے جناب مالک رام پر غلط حوالے دینے، غلط بیانی کرنے اور تحقیقی غلطیوں کا ارتکاب کرنے کی فرد جرم عائد کی

ہے[1] اس طرح گویا اُس احتجاج کا "الزامی جواب" دیا ہے جو مالک رام نے رسالہ معارف (اعظم گڑھ) میں شائع شدہ مضمون "غالب کا سکۂ شعر" میں نامکمل اور گمراہ کن حوالہ دینے پر کیا تھا[2] لیکن عجیب اتفاق ہے کہ جتنے الزام انھوں نے مالک رام پر لگائے ہیں اسی نوعیت کی تمام تر غلطیاں خود اپنے مضامین میں بھی کی ہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ "تلامذۂ غالب" میں بعض تاریخی اور تحقیقی غلطیاں ہیں[3] لیکن اس کا ایک پہلو یہ بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ انھوں نے یہ کتاب قاہرہ (مصر) میں بیٹھ کر لکھی تھی جہاں ظاہر ہے کہ اردو کا کوئی بڑا کتب خانہ نہیں ہے۔ نہ وہاں اردو میں تحقیقی کام کرنے کے لیے وسائل میسّر آ سکتے ہیں۔ میرا اعتراض صرف یہ ہے کہ تحقیقی اور تاریخی غلطیوں کی نشان دہی کے وقت "نیت بخیر" ہونی چاہیے۔

۱۷۔ یہی حال فاروقی صاحب کے "غالب اور بے صبر" والے مضمون کا ہے۔ اس ضمن میں جتنی معلومات پیش کی ہیں وہ رسالۂ اردو ادب (علی گڑھ) رسالہ نیا دور (لکھنؤ) اور رسالہ نقوش (لاہور) سے اخذ کی گئی ہیں لیکن ایک رسالے کا بھی حوالہ نہیں دیا۔ جناب معراج دھولپوری نے برہما سروپ کی لکھی ہوئی "سوانح عمری بے صبر" تلامذۂ غالب کی اشاعت کے بعد دریافت کی ہے اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ نو دریافت ہے، مالک رام اس کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ آدابِ تحقیق سے واقفوں کو یہ معمولی سی بات معلوم ہے کہ جو مآخذ معروف و مشہور ہوں یا مقالہ نگار جن سے استفادے کا مدعی ہو صرف انھیں کی روشنی میں اس کے بیانات کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر میرے پاس کوئی ایسی مستند قلمی دستاویز ہو جس سے غالب کا ہاشمی سیّد ہونا ثابت ہو جائے تو اُس سے پہلے چھپنے والی کتابوں کے مصنفوں پر اتہام بددیانتی یا کتمانِ حقیقت کا لگانا

---

[1] ملاحظہ ہو اردوئے معلیٰ، صفحات ۹۲، ۹۹، ۱۰۹، ۱۱۸ وغیرہ۔

[2] معارف (اعظم گڑھ) اگست ۱۹۵۹ء۔

[3] ملاحظہ ہو میرا مضمون "تلامذۂ غالب پر ایک نظر" نقوش (لاہور) دسمبر ۱۹۵۹ء۔

کھلی ہوئی زیادتی ہے۔

میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ فاروقی صاحب نے "سوانح عمری بے صبر" کہاں دیکھی ہے؟ اگر انھوں نے رسالہ اردو ادب ہی سے یہ سب باتیں اخذ کی ہیں تو مضمون نگار جناب معراج دھولپوری کا نام کیوں نظر انداز کیا گیا ہے۔

"غالب اور بے صبر" کے عنوان سے بارہ صفحوں کے اس مضمون میں بے صبر کے چند غیر مطبوعہ اشعار کے سوا کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوتی۔ "ہندستانی ماحول" وغیرہ کی بحث بالکل فضول ہے۔ اس کا غالب نمبر میں قطعاً موقع نہ تھا۔

۱۸۔ ایک اور مضمون "غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات حضرت غمگین کے نام" خواجہ احمد فاروقی صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ ان خطوط کا سراغ سب سے پہلے محمد یونس خالدی صاحب نے لگایا تھا وہ غالباً حضرت غمگین پر کوئی کتاب بھی لکھ رہے ہیں۔ غمگین کے بارے میں مختلف اوقات میں رسالہ فاران (کراچی)، رسالہ مہر نیمروز (کراچی) اور آجکل (دہلی) نیز رسالہ اردو (کراچی) اکتوبر ۱۹۵۹ء میں مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے حالات کے سلسلے میں خواجہ صاحب نے کوئی نئی بات نہیں کہی، سوائے اس کے کہ چند غیر معروف اور بعض غیر اہم کتابوں کے حوالے دینے کا التزام کیا ہے۔ غمگین اور اُن کے خاندان کے حالات اب سے پونہ تھائی صدی قبل "سیرت الصالحین" کے نام سے آگرہ اخبار پریس آگرہ سے شائع ہو چکے ہیں۔ ظاہراً مضمون نگار کو اس کا مطلق علم نہیں۔

غمگین کے نام غالب کے جو خطوط پیش کیے ہیں ان کے مطالب کی روشنی میں ایک نہایت وقیع مضمون جناب میکش اکبر آبادی کا لکھا ہوا رسالہ "آجکل" (دہلی فروری ۱۹۶۰ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ اس سے ان خطوط کے مطالب اور مندرجات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ خواجہ صاحب چونکہ تصوف کے مردِ میدان نہیں نہ اُس کی اصطلاحوں سے واقف ہیں اس لیے انھوں نے صرف فارسی متن بلا ترجمہ درج کر دیا ہے۔ (اس میں بھی کئی فاحش غلطیاں ہیں) ان خطوط کے پیش کرنے کا انداز بھی عجیب ہے۔ دوسری بات یہ کہ رسالہ اردو (اکتوبر ۱۹۵۹ء) میں خطوط کا جو متن پیش کیا گیا ہے اس سے مقابلہ کرنے

پر بعض اختلافات بہت اہم نظر آتے ہیں۔ اب خدا جانے کہ صحیح متن کون سا ہے، جو اردو (کراچی) میں چھپا ہے یا جسے اردوے معلیٰ میں پیش کیا گیا ہے۔ نظر بظاہر "اردو" کا متن قرین صحت معلوم ہوتا ہے۔

۱۹۔ ڈاکٹر یان ماریک چیکوسلواکیہ میں اردو پڑھاتے ہیں۔ ان کے مضمون کا عنوان ہے "چیک زبان میں دیوانِ غالب کا ترجمہ"۔ یہ صحافیانہ انداز کا ہے اور ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

اب چند باتیں عمومیت کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں۔ یونیورسٹی سے اردو کا "تحقیقی رسالہ" ہی اگر شائع کرنا ہے تو اس کے لیے بہت سے ناپیمودہ گوشے باقی ہیں اُن پر صحت اور جامعیت کے ساتھ کام کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مومن خاں کا فارسی کلام ابھی تک بے توجہی کا شکار ہے۔ اس کے کلیات فارسی کا کوئی اچھا کیا بُرا نسخہ بھی بازار میں دستیاب نہیں ہوتا۔ اگر اس ضرورت کا احساس کیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ غالب کے سلسلے میں بہت کام ہو چکا ہے اب کسی نئی بات کے دریافت ہونے کا امکان بھی بہت کم ہے۔ بس یہی ممکن ہے کہ اُن کے شاگرد، احباب، محلّے والے اور نزدیک و دور کے قرابت رکھنے والے زیرِ بحث لائے جائیں یہ کام اگر کسی درجے میں بھی مفید ہیں تو اُن پر جناب قاضی عبدالودود، جناب مالک رام، جناب امتیاز علی خاں عرشی، جناب مختارالدین احمد آرزو وغیرہ بہت کچھ کر چکے ہیں اور کریں گے۔ تاریخ ادب اردو کے بہت سے پہلو ابھی تاریکی میں ہیں بنیادی اور اہم کام یہ ہے کہ ہم تخلیقی فکر کا رجحان پیدا کریں اور تحقیق میں یہ بوالعجبیاں دکھاکر موضوع کو ناقابلِ فہم نہ بنائیں۔

جس وقت معاصر (حصّہ ۹) میں "میر تقی میر: حیات اور شاعری" پر قاضی عبدالودود صاحب کی تنقید شائع ہوئی تھی، ڈاکٹر فاروقی نے لندن سے ایک خط جناب آل احمد سرور کو لکھا تھا اور وہ انھوں نے "ہماری زبان" (علی گڑھ) میں شائع کر دیا تھا۔ اصل عبارت سرِدست پیش نہیں کر سکتا، لیکن فاروقی صاحب کا مفہوم یہ تھا کہ فلاں ادارے میں "ریسرچ میتھڈالوجی" پر فلاں بزرگوار کا لیکچر سنا بے ساختہ

آپ (آل احمد سرور) یاد آگئے۔ مقررِ موصوف نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اس چیز کی کوئی اہمیت نہیں کہ میر جمعہ کے دن پیدا ہوئے تھے یا ہفتے کو، یا نپولین کے گھوڑے کا رنگ مگسی تھا یا ابلق۔ اصل چیز سماجی رشتے اور تہذیبی عوامل ہوتے ہیں اور ان کا سراغ لگانا اور اس رشتہ غیر محسوس کا دریافت کر لینا ہی دیدہ وری کی علامت ہے۔" میں ڈاکٹر فاروقی کے اس خیال سے متفق تھا لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اردوے معلّٰی کے شمارے میں عملی طور پر انھوں نے خود ہی اس نظریے کی تغلیط کر دی ہے۔ اس میں سارا زور اس بات پر ہے کہ غالب کے دیوان میں صحیح تعدادِ اشعار کیا ہے۔ بے صبر کب پیدا ہوئے، غمگین کے نام غالب کے کتنے رقعات ہیں اور بیدل کی تصانیف دس ہیں یا کم و بیش ـــ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں کا علاقہ سماجی عوامل یا تہذیبی رشتوں سے کیا ہو سکتا ہے؟

ہمیں یہ چند سطور لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی اگر ہم یہ نہ دیکھتے کہ رسالہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے نکلا ہے اور شعبے کے صدر اس کے ایڈیٹر ہیں جنھوں نے ایک سو ساٹھ صفحوں کے رسالے میں پندرہ جگہ اپنا نام درج کر کے رسالے کا اعتبار بڑھایا ہے پھر یہ رسالہ غالب سے منسوب ہے جس کے پڑھنے والوں کا بڑا حلقہ اسے ذوق و شوق سے دیکھے گا۔ ظاہر بیں اور ناواقف حضرات جو انگریزی اخباروں سے اردو کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں ایسی ہی چیزوں سے متاثر ہو کر بے تکلف An authority on the poet, کا خطاب دے دیتے ہیں۔

(۲)

(میرے ایک کرم فرمانے "اردوے معلی، غالب نمبر" پر میرا تبصرہ ملاحظہ فرما کر مجھے ایک طویل خط لکھا ہے جس میں میرے بعض اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے۔ اس کے ضروری اقتباسات پیش کرتا ہوں، میں نے اپنے خیالات کا اظہار حاشیے میں کر دیا ہے ـــ ن۔ا۔ف)

۱۔ "یہ اعتراض فضول سا ہے کہ اردوے معلی نام اور پرچوں کا بھی تھا،"[1]

---

[1] یہ اعتراض بنیادی نہیں، لیکن اس نظر سے ہے جیسے جناب غلام رسول مہر نے "خطوطِ غالب" دو جلدوں میں مرتب کر کے نہ صرف یہ کہ مولوی مہیش پرشاد کی محنت سے پورا فائدہ اٹھایا بلکہ اپنے مرتبہ مجموعے کا نام تک دوسرا رکھنے کی زحمت نہ فرمائی۔ کوئی قرینہ یہ نہیں کہتا کہ شعبۂ اردو کو رسالے کا یہ نام رکھنا ضروری تھا۔

۲۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد بالقابہ " ڈاکٹر لکھنے کے بعد سارے القاب غیر ضروری ہیں" اگر کوئی لکھنا چاہے تو اس پر اعتراض کیا ہے ؟ ڈاکٹر لقب نہیں کہ اس کے بعد 'بالقابہ' فاضل سمجھا جائے[۱]

۳۔ " خواجہ احمد فاروقی بحوالہ روزنامچہ جیون لال" آپ کو اعتراض ہے کہ اپنا نام کیوں لکھا، یہ ٹھیک نہیں۔ اعتراض اس پر ہو سکتا تھا کہ اس طرح نہ لکھنا تھا۔ کوئی اور شکل اختیار کرنی تھی۔ دراصل ڈاکٹر فاروقی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عبارت دوسروں کی ہے مگر اس کا پیش کرنے والا میں ہوں[۲]

۴۔ رہائش فارسی لفظ بھی ہے مگر وہ جو اردو کے معنی میں ہے "رہ" سے بنا ہے اور میں اس کے استعمال سے احتراز کرتا ہوں اس کا املا بھی " ی" ہی سے ہوگا اس لیے کہ فارسی کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے[۳]

۵۔ " حمیدہ سلطان ..... معروف کی ہم عصر نہیں ہیں۔ نہ ان کی شہادت قابلِ قبول ہو سکتی ہے" اگر آپ واقعی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حمیدہ سلطان ایک غیر ثقہ راوی ہیں، اس صورت میں تو جو کچھ آپ نے لکھا ہے ٹھیک ہے۔ یہ نہیں کہنا چاہتے تو یہ لکھنا تھا کہ وہ معاصر نہیں ،

---

۱ ڈاکٹر کے ساتھ عالی جناب' اور صاحب کا اجتماع ضروری نہیں۔ ڈاکٹر خود ایک اعزاز ہے۔ جس طرح انگریزی میں اس لفظ کے ساتھ "مسٹر" یا "اسکوائر" نہیں لکھا جاتا۔

۲ اعتراض یہ ہے کہ ایسے مواقع پر پیش کرنے والے کے نام کی ضرورت ہے نہ فائدہ۔ اپنے جن مضامین میں فاروقی صاحب نے ان عبارتوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔

۳ فرمایش، فہمایش، آرایش، آسایش اور اسی قبیل کے فارسی الفاظ یقیناً 'ی' سے لکھے جائیں گے لیکن رہائش کے بارے میں اول تو مجھے قطعاً اس لفظ کے مستند ہونے سے انکار ہے، اور لکھا بھی جائے تو اسے فارسی الفاظ کے التباس سے بچانا چاہیے۔ یہ اسی طرح برداشت کیا جا سکتا ہے جیسے ٹپہ خانہ، ٹھیکہ دار، لٹھ بند، اور فوق البھڑک۔

اس لیے اس معاملے میں ان کی شہادت کچھ وزن نہیں رکھتی۔[1]

۶۔ بھوپال والی غزل پہلی بار جس طرح پیش ہوئی تھی، وہ اس کے جعلی ہونے کا قطعی ثبوت تھا۔[2] یہ بات دوسری ہے کہ مالک رام صاحب اور عرشی صاحب کو اس کا علم نہ تھا۔

---

[1] غلطی مجھ سے یہ ہوئی کہ جس عبارت پر اعتراض تھا وہ نقل نہ کی، اب حاضر ہے: "یہ غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں کا مسکن تھا۔ یہیں دہلی کی سرزمین سے غالب کا پہلی بار رشتہ قائم ہوا تھا یعنی امراؤ بیگم سے ان کی شادی ہوئی تھی (ملاحظہ ہو تصویر نمبر ۷)۔ یہ اس کمرے کی تصویر ہے جس میں غالب کا نکاح ہوا تھا۔" (ص۔ ۸۷) میں نے خلیق انجم صاحب سے دریافت کیا تھا کہ انھیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی، انھوں نے حمیدہ سلطان صاحبہ کا نام لیا۔ اس پر مجھے اعتراض ہے۔ ایک تو وہ مکان نواب الٰہی بخش خاں معروف کا (کم از کم موجودہ حالت میں) نہیں، دوسرے یہاں غالب کی شادی ہونے کی معلومات کا کوئی قدیم تر ذریعہ نہیں۔ نواب خسرو مرزا، حکیم الیاس خاں، حکیم کامل خاں، آغا حیدر حسن دہلوی اور ایسے کتنے بزرگوں سے میں نے اس سلسلے میں معلومات چاہیں، انھوں نے یہی بتایا کہ وہ مکان نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کا ہے اور اس کے سامنے والا مکان نواب صاحب مرحوم کا دیوان خانہ تھا۔ (جس میں آج کل روزنامہ "الجمعیتہ" کا دفتر ہے) خلیق انجم صاحب کو محض حمیدہ سلطان صاحبہ کے بیان پر اکتفا نہ کرنا تھا۔

[2] وہ غزل پہلی بار بھوپال کے ایک چھوٹے رسالہ "گوہر تعلیم" (اپریل ۱۹۳۷ء) میں چھپی تھی اور بقول ڈاکٹر جین اس کے عنوان میں "اپریل فول" بھی لکھا ہوا تھا۔ مگر وہاں سے رسالہ "ہمایوں" (لاہور، اپریل ۱۹۳۹ء) اور "منادی" دہلی نے بھی نقل کر لی۔ حضرت مالک رام اور عرشی نے اسے "ہمایوں" ہی سے نقل کیا تھا۔ اصل ماخذ کا "ہمایوں" میں حوالہ نہ تھا یا انھیں دستیاب نہ ہو سکا جس سے یہ علم ہوتا ہے کہ غزل "اپریل فول" کے سلسلے میں کہی گئی ہے۔ عرشی صاحب نے غزل کا ماخذ "ہمایوں" (اپریل ۱۹۳۹ء) بتایا ہے۔ (جین صاحب نے لکھا ہے کہ "وہاں سے لے کر اوائل ۱۹۳۸ء میں رسالہ "ہمایوں" نے اسے شائع کر دیا) میرا اعتراض یہ ہے کہ مالک رام صاحب یا عرشی صاحب پر اس صورت میں الزام آسکتا تھا کہ ان کا ماخذ رسالہ "گوہر تعلیم" ہوتا۔ "ہمایوں" میں جس انداز سے غزل پیش کی گئی تھی اس سے کسی کا گمراہ نہ ہونا تعجب انگیز ہو سکتا تھا۔

عرشی صاحب کا مرتبہ نسخہ دیوان اب تک میں نے بالاستیعاب نہیں دیکھا اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے غزل مذکور کس طرح پیش کی ہے۔ لیکن جس طرح مالک رام صاحب (کے) مرتبہ دیوان میں ہے یقیناً قابلِ اعتراض ہے۔ انھیں یہ ضرور لکھنا تھا کہ غالب کی طرف منسوب کرنے کے لیے جو شہادت ہے وہ (نا) کافی ہے۔ دیوان میں یہ غزل دیکھ کر میں نے خود بھی انھیں اس کے بارے میں لکھا تھا حالاں کہ اس وقت مجھے اس کا علم نہ تھا۔ پہلی بار یہ غزل کس طرح شائع ہوئی تھی۔ غالب کا بھوپال جانا ناممکن نہ تھا لیکن قیاس ہرگز اس کے موافق نہ تھا[1]

۷۔ "کوئی صاحب محمد ذاکر ہیں" اس طرح نہ لکھنا تھا[2] یوں لکھنا تھا "محمد ذاکر صاحب لکھتے ہیں"۔ میں نے ان کا مضمون دیکھا ہے اس کی غرض ہرگز یہ نہیں معلوم ہوتی کہ عرشی صاحب کے کام کی تخفیف کی جائے[3]۔ انھوں نے نسخۂ اول اور نسخۂ عرشی کے اختلافات دکھائے

---

[1] "بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو" والی غزل رسالہ "ہمایوں" اپریل ۱۹۳۹ء (جلد ۳۵، ش ۴) نے نقل کی تھی اور اس میں اسی طرح پیش کی گئی تھی۔ "مرزا غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل۔"
فصیح الملک خدائے سخن، نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک غیر مطبوعہ غزل وہ متبرک روحانی تحفہ، جو اب تک مرزا غالب کے کسی دیوان یا ضمیمے میں شائع نہیں ہوا اور جو امیر الامرا نواب یار محمد خاں صاحب مرحوم کے کتب خانہ قدیم سے بذریعہ خاص حاصل کر کے "دین و دنیا" میں شائع کیا جا رہا ہے (جوہر قریشی بھوپال)

بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو
کیا لطف ہو جو ابلق دوراں بھی رام ہو الخ

اس کے آخر میں "ہمایوں" نے حوالہ "دین و دنیا" کا دیا ہے (۲۱۶)۔ میں نے اپنے پچھلے خط میں یہ کہا تھا کہ "ہمایوں" میں غزل مذکور جس طرح پیش کی گئی تھی اس سے کسی کا گمراہ نہ ہونا تعجب خیز ہو سکتا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میری بات کی تصدیق کرتا ہے

[2] میرے یہ الفاظ کالعدم سمجھے جائیں۔

[3] مضمون کی "غرض" نہ ہو لیکن اس سے ان کے کام کی تخفیف ہوتی ہے اختلافات سے قطع نظر میرا مدعا تو یہ ہے کہ محمد ذاکر صاحب کا مضمون خود استنباط و استخراج کی غلطیوں سے مبرا نہیں۔

ہیں۔ ان کی غرض عرشی صاحب پر اعتراض نہیں۔

۸۔ اشعار کی صحیح تعداد کیا ہے اس کے بارے میں آپ کو کچھ کہنے کا حق اسی وقت پہنچ سکتا تھا جب آپ خود اشعار کو گنتے، بخوبی ممکن ہے کہ محمد ذاکر صاحب نے ٹھیک لکھا ہو[1]۔

۹۔ رامپور ضلع سہارن پور لکھنے کے بعد یہ بتانا ضروری نہ تھا کہ مصطفیٰ آباد رامپور[2] سے مختلف ہے۔

۱۰۔ صفحہ ۱۹" مالک رام پر یہاں بھی اعتراض کرتے" عبارت غیر واضح ہے[3]۔

۱۱۔ تلامذۂ غالب کہاں لکھی گئی مجھے اس کا علم نہیں مگر یہ اس وقت چھپی ہے

---

[1] میں اس نسخے کا عکس حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اس موضوع پر اسی وقت کچھ عرض کر سکوں گا۔

[2] "رامپور ضلع سہارنپور" واوین میں لکھنے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مضمون نگار کو شک ہے۔ میرا اعتراض واوین پر ہے۔

[3] اس لیے کہ مالک رام صاحب کو یہ علم نہ ہو سکا کہ بیدل جس رامپور کے رہنے والے تھے وہ مصطفیٰ آباد رامپور سے مختلف ہے۔ مالک رام صاحب نے رسالہ "نور ایمان" سے بیدل کے کچھ اشعار اور اسی رسالے کے دیباچے سے بیدل کے مختصر حالات تلامذہ میں نقل کیے ہیں۔ بیدل کی دوسری تصانیف ان کی دسترس میں نہ تھیں۔ فاروقی صاحب نے بیدل پر مضمون لکھتے ہوئے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ جس غزل کا مآخذ "دیباچہ نور ایمان" بتایا گیا ہے اس میں جناب مالک رام کا منقولہ کلام نہیں، حالاں کہ ترجمہ بیدل کے متن میں مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ رسالہ "نور ایمان" سے اقتباس کر کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں اور ترجمے کے آخر میں جو حوالہ "دیباچہ نور ایمان" کا ہے وہ صرف حالات کے لیے ہے۔ اگر فاروقی صاحب نے رسالہ "نور ایمان" خود دیکھا ہوتا تو انھیں یہ علم ہونا چاہیے۔ جن اشعار کو وہ دیباچے سے غیر حاضر بتلاتے ہیں، وہ متن میں موجود ہیں! علیٰ ہذا، مالک رام نے رامپور کی صراحت نہیں کی تھی کہ یہ "رامپور منیہاران" ہے۔ فاروقی صاحب بھی اس سے بے خبر تھے، اسی لیے انھوں نے نہ خود صراحت کی نہ مالک رام صاحب کی گرفت کر سکے۔

جب مالک رام صاحب ہندوستان میں تھے۔ ان کی طرف سے یہ جواب کہ مصر میں لکھی گئی جہاں کوئی اردو کا بڑا کتب خانہ نہیں، ٹھیک نہیں، اس صورت میں اس طرح کی کتاب لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی [1]

۱۲۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب کی نیت پر اعتراض نہ کرنا تھا۔ بحث یہ ہے کہ اعتراض صحیح ہے یا غلط، نیت کچھ ہی کیوں نہ ہو [2]

---

[1] میری مراد مالک رام کی وکالت نہیں لیکن کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر فاروقی کتاب "میر تقی میر" اس صنعت کے التزام کے ساتھ لکھ سکتے ہیں کہ کوئی صفحہ تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی غلطیوں سے خالی نہ ہو، اور اس عالم میں جب کہ انھیں وسائل میسر تھے اور بقولِ خود انھوں نے "دوسری بار" اسے لکھا تھا اور تیرہ برس اس پر عرق ریزی کی تھی، تو مالک رام کو محض چند غلطیوں پر متہم کرنے کا انھیں حق نہیں پہنچتا۔

[2] یقیناً ہمیں معترض کی نیت سے سروکار نہیں رکھنا چاہیے لیکن فاروقی صاحب نے جو خود اعتراضات کیے ہیں ان میں سے بیشتر بے بنیاد ہیں اور خود ان کے مضامین میں اس نوعیت کی غلطیاں موجود ہیں اور ان کے اعتراضات کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ مالک رام کے کام کی تخفیف کی جائے جو غالباً ۱۹۳۴ء سے غالب اور غالبیات پر کام کر رہے ہیں۔ ان کا کام برا ہے یا بھلا اس سے بحث نہیں، لیکن اسے بہر حال ڈاکٹر فاروقی کے کام پر فوقیت حاصل ہے۔ نیت کا حال یہ ہے کہ فاروقی صاحب ہمیشہ اپنا ماخذ بتانے سے گریز کرتے ہیں۔ جب امداد صابری صاحب کی کتاب "تاریخ صحافت اردو" چھپ کر آئی تو اس میں اخباروں سے جو بعض خبریں نقل کی گئی تھیں انھیں میں دہلی اردو اخبار سے ایک خبر غالب کے ماخوذ ہونے اور ان پر جرمانہ ہونے کے بارے میں تھی۔ (ملاحظہ ہو ص ۱۳۵)۔ جناب امداد صابری کو اس وقت یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ واقعہ غالب کے معلومہ واقعہ اسیری سے مختلف ہے۔ انھوں نے یونہی نقل کر دیا تھا۔ فاروقی صاحب نے وہاں سے اسے "کلاسیکی ادب" کے مقدمے میں نقل کیا (کلاسیکی ادب، جولائی ۱۹۵۳ء میں چھپی ہے اور تاریخ صحافت اردو" جنوری ۱۹۵۳ء میں شائع ہو چکی تھی) مگر حوالہ اس طرح دیا گویا براہِ راست اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ دہلی اردو اخبار مورخہ ۲۲ اگست ۱۸۴۱ء نیشنل آرکائیوز

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۱۹ پر)

۱۳- ڈاکٹر یان ماریک اردو میں مضامین لکھتے ہیں۔ آپ نے یہ کیوں کہا کہ ترجمہ معلوم ہوتا ہے[۱]

۱۴- ڈاکٹر فاروقی کا جو خط ہماری زبان میں تھا اس میں (قاضی عبدالودود صاحب کا) نام تک نہ آیا تھا۔ انھوں نے عام بات کہی تھی، کوئی مثال نہ دی تھی[۲]

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۱۸ سے)

آف انڈیا (کلاسیکی ادب۔ ص ۵)۔ مالک رام صاحب نے امداد صابری کا حوالہ دیا تھا اب وہ فائل دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جس فائل میں دلّی اردو اخبار کا مذکورہ شمارہ ہے اس میں ایک شمارے کے آخری صفحے پر غالب کی گرفتاری کی یہ خبر ہے اور اس کے بعد دوسرا شمارہ شروع ہوجاتا ہے۔ جناب امداد صابری نے سہواً تاریخ دوسرے شمارے کی نقل کرلی۔ اس طرح اصل تاریخ میں ایک کا فرق واقع ہوگیا۔ وہی غلط تاریخ فاروقی صاحب نے نقل کی (کلاسیکی ادب، ص ۵ حوالہ امداد صابری کا نہیں دیا) اسی کو مالک رام نے نقل کیا (مگر بحوالہ امداد صابری) یہی غلطی محمد عتیق صدیقی مصنف "ہندوستانی اخبار نویسی" سے ہوگئی (ص۔ ۴۹)۔ امداد صابری کا حوالہ دینا شاید فاروقی صاحب کسرِ شان سمجھتے ہوں۔ لیکن اس کے عواقب ظاہر ہے اچھے نہ رہے۔ ایسی صورت میں کسی تنقید نگار کو حق حاصل ہے کہ کسی مصنف یا معترض کی نیت سے نظر بہ حالات گزشتہ بحث کرسکے۔ کیوں کہ بے موقع اعتراض کرنا اور کسی غیر متعلق بات کا تذکرہ کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ معترض کی نیت میں فتور ہے۔

[۱] ڈاکٹر یان ماریک کے اردو مضامین میری نظر سے نہیں گزرے۔ مضمون زیرِ بحث کا انداز غمازی کر رہا تھا کہ یہ اصل نہیں، ترجمہ ہے۔ میں نے بعد میں ذاتی طور پر اس کی تصدیق بھی کرلی۔ میرا اعتراض ترجمہ ہونے پر نہیں، اس پر ہے کہ "صحافیانہ انداز" کا ہے اور علمی و تحقیقی رسالے کے لیے موزوں نہیں۔

[۲] مجھے ابھی تک "ہماری زبان" کا وہ شمارہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ مگر اتنا مجھے بھی یاد ہے کہ اس میں قاضی عبدالودود صاحب کا نام نہیں لیا گیا، نہ میں نے ایسا لکھا ہے لیکن بالواسطہ بات تھی اسی Context میں رمز و اشاریت کے پردے میں فاروقی صاحب یہ کہنا چاہتے تھے کہ میری کتاب پر اس نوعیت کے جتنے اعتراضات ہوئے ہیں وہ غیر اہم ہیں ان سے کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوتی بلکہ میں نے میر کو اس کے تاریخی ماحول میں دیکھنے کے لیے جو زاویۂ نظر اختیار کیا ہے وہ قابلِ اعتنا ہے۔ (حالاں کہ پوری کتاب میں مجھے کوئی منفرد "زاویۂ نظر" نہیں ملا۔ جن دو تین باتوں پر انھوں نے زور دیا ہے وہ بھی مستعار خیالات ہیں ان کا اپنا فکر پوری کتاب میں نہیں ملتا۔ رہی "انشا پردازی" وہ ایسی کتابوں کے لیے غیر ضروری ہی نہیں مہلک ہوتی ہے)۔

۱۵۔ ڈاکٹر فاروقی نے اصولی طور پر (بحوالہ شخصے) جو کچھ لکھا تھا اس سے آپ کا اتفاق حیرت انگیز ہے[1] اگر میر ولادت کی تاریخ زیرِ بحث ہے تو اس بحث سے تہذیبی عوامل کا کیا سروکار ہے۔ اگر کوئی شخص خواہ وہ امریکی ہو یا یورپی یا ایشیائی یہ کہے کہ میر کے حالاتِ زندگی پر جو کتاب لکھی جائے اس میں یہ بحث فضول ہے تو میں یہ کہوں گا کہ اسے سیرت نگاری چھوڑ کر کوئی اور کام کرنا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ "ہر شخص (سخن) موقع و ہر نکتہ مقامے دارد" کسی پر اعتراض کرتے وقت سب سے پہلے اس کے مطمحِ نظر اور اس کی تحریر کی علت غائی کو دیکھنا چاہیے[2]

۱۶۔ محمد ذاکر صاحب نے دیوان مرتبہ عرشی کو دیوانِ غالب کا آخری ایڈیشن نہیں بتایا۔ "قابلِ ذکر ایڈیشنوں میں سب سے آخر لیکن سرفہرست" لکھا ہے فرق ظاہر ہے[3]

۱۷۔ ڈاکٹر گیان چند نے ہرگز ڈاکٹر عبدالحق پر الزام نہیں لگایا۔ انھوں نے جو کچھ ان کے علم میں آیا تھا، لکھا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر عبدالحق کا جواب بھی درج کر دیا تھا۔ ان کی روش کسی طرح قابلِ اعتراض نہیں ہے[4]

۱۸۔ (مکتوب دیگر) ...... اردوئے معلّٰی کے تبصرے کے بارے میں جو کچھ

---

[1] اس غلطی کا مجھے افسوس ہے کتابت میں "نہیں" چھوٹ گیا تھا۔ اب جملہ یوں پڑھا جائے "میں ڈاکٹر فاروقی کے اس خیال سے متفق نہیں تھا"

[2] میں نے اسی "مطمح نظر اور علت غائی" کو سامنے رکھ کر پہلے اعتراض کیے تھے اور اسی کی روشنی میں جوابات عرض کر رہا ہوں۔

[3] یہ بھی تو بتانا تھا کہ "قابلِ ذکر" سے ان کی مراد کیا ہے؟ سردار جعفری کا مرتبہ دیوان غالب (۱۹۵۸ء) اس کے بعد چھپا ہے کیا وہ ناقابلِ ذکر ہے؟ الٰہ آباد، لکھنؤ، لاہور، کراچی اور دہلی سے جو ایڈیشن بعد میں چھپے ہیں انھیں کیوں "قابلِ ذکر" نہ سمجھا جائے۔

[4] مجھے ان کی روش یا نیت پر شبہ نہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بے شبہ دیانت داری سے لکھا ہے۔ لیکن واقعات کا تجزیہ خارجی اور داخلی شہادتوں کی بنیاد پر نہیں کیا یہ البتہ قابلِ اعتراض ہے۔

لکھ چکا ہوں اس پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اصل لفظ ہندوستان ہے اور ہندستان اس کا مخفف ہے جیسے اگر کا مخفف گر ہے۔ یہ املا کا سوال نہیں۔ آپ جس طرح چاہیں لکھیں، میں خود ہندوستان لکھتا ہوں لے

لہ میں نے خود یہ لکھا ہے کہ یہ لفظ دونوں شکلوں میں لکھا جاتا ہے۔ کسی ایک کے صحیح یا غلط ہونے سے بحث نہیں، لیکن ایک ہی شکل اختیار کرنی چاہیے۔ اردوے معلی میں کہیں واؤ سے لکھا ہے، کہیں بدونِ واؤ۔ یہ روش قابلِ اعتراض ہے۔

غالب صدی: ایک جائزہ

فروری ۱۹۶۹ء میں مرزا غالب کی وفات کو سو برس پورے ہو چکے تھے اور ان کی صد سالہ برسی منانے کے لیے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی اداروں نے پہلے ہی سے اپنے پروگرام تیار کر رکھے تھے، چنانچہ جیسے ہی ۱۹۶۹ء شروع ہوا، سارے ملک میں ان تقریبات کا آغاز ہو گیا۔ اردو بولنے والے علاقوں میں شاید ہی کوئی قابلِ ذکر شہر ایسا ہو جہاں غالب صدی کے سلسلے کی کوئی تقریب نہ ہوئی ہو۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں نے بھی یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی اعانت سے غالب سینٹنری کمیٹیاں بنائیں۔ یونیورسٹی میگزین کے غالب نمبر شائع ہوئے۔ سیمینار منعقد کیے گئے اور مقالات کو کتابی صورت میں یکجا کر کے شائع کیا گیا۔ اِس سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، الٰہ آباد یونیورسٹی، جموّں یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی اور گورکھپور یونیورسٹی کے مجلّوں نے اپنے اپنے خصوصی نمبر شائع کیے۔

ایک عجیب اتفاق ہے، بلکہ یہ بھی مرزا غالب کی خوش بختی اور اُن کے طالعوں کی یاوری تھی کہ جب صد سالہ برسی منانے کا وقت آیا تو جمہوریۂ ہند کی صدارت پر ڈاکٹر ذاکر حسین زینت افروز تھے جو اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے مرزا غالب کے مداح اور قدرداں رہے تھے۔ چناں چہ جب وہ جرمنی میں زیرِ تعلیم تھے، اُنھوں نے مطبع کاویانی برلن سے

دیوانِ غالب کا ایک بہت خوب صورت ایڈیشن ٹائپ میں چھپوایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کے بیشتر صفحات خود ذاکر صاحب نے کمپوز کیے تھے۔ اب اُنھوں نے غالب صدی تقریبات کے موقعے پر بھی اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود بہت سا وقت صرف کیا اور وہ آل انڈیا غالب سینٹری کمیٹی کے سرپرست بھی رہے۔ اس کمیٹی کی چیئرپرسن ہماری وزیرِ اعظم محترمہ اندرا گاندھی اور سکریٹری جناب فخرالدین علی احمد تھے۔

اس وقت اگر کوئی شخص غالب سے اپنی دُور پرے کی رشتہ داری کا دعوا کرسکتا ہے تو وہ اُن کے منھ بولے فرزند زین العابدین عارف کی پوتی کے بیٹے ہیں جن کا نام فخرالدین علی احمد ہے۔ جو ۱۹۶۹ء میں صنعتی ترقیات کے مرکزی وزیر تھے اور اب صدر جمہوریۂ ہند ہیں۔ غالب کے نام سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قبرستان کے قریب ایک شاندار عمارت اور آڈیٹوریم کی تعمیر اور ثقافتی پروگراموں کی کامیابی میں درپردہ اُن کی دلچسپی اور حسنِ تدبیر کو بڑا دخل ہے۔ جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ ان تمام تقریبات میں سب سے زیادہ مؤثر اور فعال شخصیت بیگم عابدہ احمد کی رہی ہے، جو اردو کے مشہور ادیب سلطان حیدر جوشؔ کی صاحبزادی ہیں اور آج ہندوستان کی خاتونِ اوّل ہیں۔

اردو کے مشہور محقّق اور غالب شناس جناب قاضی عبدالودود زمانۂ طالب علمی میں جناب فخرالدین علی احمد کے ساتھ انگلستان میں رہے تھے۔ ان دوستانہ روابط کا فائدہ بھی غالب کو پہنچا کہ اِن تمام تقریبات میں قاضی صاحب کا مشورہ برابر شامل رہا ورنہ یہ تقریبات اتنے اعلیٰ اور سنجیدہ پیمانے پر منعقد نہیں ہوسکتی تھیں۔ اب ایوانِ غالب کی تعمیر مکمل ہوچکی ہے۔ اُس کے پہلے ڈائرکٹر اردو کے مشہور شاعر جناب حسن نعیم تھے۔ ان کے مستعفی ہونے پر جناب سعید سہروردی کا تقرّر کیا گیا۔ کتب خانہ فراہم ہو رہا ہے اور اُس کا افتتاح بھی چند ماہ قبل جناب فخرالدین علی احمد کے ہاتھوں سے عمل میں آچکا ہے۔ اب ڈاکٹر یوسف حسین خاں اِس ادارے کے سکریٹری ہیں اور ترقی کی رفتار کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایوانِ غالب جلد ہی اردو کے اہم تحقیقاتی اداروں میں اپنا

مقام بنالے گا۔ اس ادارے کی جانب سے سالانہ ادبی انعامات کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔

صد سالہ برسی سے کئی ماہ پہلے سے آل انڈیا ریڈیو نے اپنے پروگراموں میں کسی نہ کسی عنوان سے غالب کو شامل کرنا شروع کر دیا تھا۔ بیگم اختر، سہگل یا ملکہ پکھراج کی گائی ہوئی غزلیں اکثر نشر ہوتی تھیں۔ ریڈیو فیچر، ڈرامے، مباحثے اور تقریریں بھی ریڈیائی تقریبات کا ایک حصہ تھیں۔ اس طرح ریڈیو نے بھی غالب صدی تقریبات کو کامیاب بنانے اور غالب کا نام ہر ہندوستانی کے کانوں تک پہنچانے میں اپنا رول حسن و خوبی کے ساتھ ادا کیا۔

حکومتِ ہند کے محکمہ ڈاک نے اس موقع پر ایک بیس پیسے والا یادگاری ٹکٹ جاری کیا۔ اس میں بائیں طرف مرزا غالب کی ایک قلمی تصویر تھی۔ پس منظر میں غالب ہی کے خط میں ایک عبارت کا عکس تھا، جس میں ڈاک ہرکارہ وغیرہ کا ذکر ہے اور وسط میں غالب کی ۱۲۷۸ھ والی مہر تھی جس میں صرف لفظ "غالب" لکھا ہوا ہے۔ اس ٹکٹ کا ڈیزائن اچھا تھا۔ تصویر کے انتخاب سے مجھے اختلاف ہے۔ غالب کی کیمرے والی تصویر جس کا ایک بہت عمدہ اِنلارجمنٹ تصویروں کی نمائش میں پیش کیا گیا تھا، اس ٹکٹ پر اچھی بھی لگتی اور اس سے غالب کی شکل و صورت کا صحیح اندازہ بھی ہوتا۔ اس قلمی تصویر میں تو وہ شاعر کم اور بوڑھے پہلوان زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔

اِس موقعے پر تصویری نمائش کا تذکرہ بھی ہو جانا چاہیے۔ اس میں غالب اور عہدِ غالب سے متعلق اتنی اچھی تصویریں ایسے سلیقے سے فراہم کی گئی تھیں کہ ایسی اچھی نمائش آج تک اردو کے اور کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔

نیشنل اسٹیڈیم میں ہونے والا کلچرل پروگرام اور لال قلعہ میں پیش کیا ہوا ڈرامہ اور مشاعرہ بھی قابلِ ذکر تقریبات ہیں۔ اس مشاعرے میں حاضرین کی تعداد کسی طرح ۲۵ ہزار سے کم نہیں تھی۔

غالب سینٹری کمیٹی نے اس موقعے پر چند کتابیں بھی شائع کیں۔ دیوانِ غالب

کا نہایت صاف ستھرا ایڈیشن جس کی بنیاد مطبع نظامی کانپور کے متن پر تھی آفسٹ سے چھپا۔ یہ قیمت کے حساب سے بھی نہایت ارزاں تھا۔ دستنبو کا متن بھی چھاپا گیا مگر اس پر کوئی مقدمہ یا تعارف نہیں ہے اور قیمت بھی زیادہ ہے۔

بین الاقوامی سیمینار کا افتتاح قاضی عبدالودود نے کیا تھا۔ اس میں ہندوستانی غالب شناسوں کے علاوہ امریکہ، روس، ایطالیا، برطانیہ، ایران وغیرہ ممالک کے مستشرقین بھی شریک تھے۔ سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات کو ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے ایڈٹ کر کے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ایک جلد میں اردو کے اور دوسری میں انگریزی کے مقالات ہیں۔

فروری ۱۹۶۹ء ہی میں حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی نے ذاتی کوشش اور دلچسپی سے غالب اکیڈمی کا آغاز کیا جس کا خواب وہ ۱۹۳۴ء سے دیکھ رہے تھے اور اس کے لیے زمین خرید کر محفوظ کیے ہوئے تھے۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا تھا۔ مزارِ غالب سے بالکل متصل اکیڈمی کی مختصر مگر خوبصورت عمارت دو حصّوں میں تعمیر کی گئی ہے اور ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی قائم ہو گیا ہے۔ اکیڈمی نے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے چنانچہ اب تک "غالب اور آہنگِ غالب" (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) "نامہ ہائے فارسی غالب" (مرتبہ علی اکبر ترمذی) "نقشِ غالب" (اُسلوب احمد انصاری) "غالب اور ذکا" (ضیاء الدین احمد شکیب) "تلمیحاتِ غالب" (محمود نیازی) وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔

غالب صدی کے موقعے پر سب سے زیادہ حیرت انگیز اور ہنگامہ آفریں واقعہ "دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ" کا ڈرامائی انداز میں پردۂ ظہور پر آنا ہے۔ امروہہ ضلع مراد آباد کے ایک کہنہ فروش توفیق احمد قادری کو دیوانِ غالب کی سب سے پہلی روایت تمام تر غالب ہی کے قلم سے لکھی ہوئی بھوپال کے ایک کتب فروش سے ملی۔ اس نے ۵ اپریل ۱۹۶۹ء کو یہ دُرِّ یتیم صرف گیارہ روپے میں خریدا اور سب سے پہلے اخبار "الجمعیۃ" دہلی میں اُس کی فروخت کا اشتہار دیا۔ ۲۳ اپریل ۱۹۶۹ء کے اخبار "الجمعیۃ"

اور ۲۲ اپریل کے ہفت روزہ "ہماری زبان" میں اس کا تعارف راقم الحروف نے پیش کیا۔ پھر رسالہ "آج کل" دہلی (جون ۱۹۶۹ء) کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس بے بہا دیوان کا مفصل تعارف پہلی بار مع عکس کے شائع کرے۔ اس دن سے آج تک یہ قلمی نسخہ اہلِ ادب کی بحث و نظر کا دلچسپ موضوع بنا ہوا ہے اور اس سے متعلق بلا مبالغہ سیکڑوں صفحات لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ فی الحال یہ نسخہ پھر پردۂ گمنامی میں روپوش ہے۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ اس کے عکس ہندوستان میں چھپے ہیں مگر وہ بازار میں دستیاب نہیں ہیں۔ "نقوش" نے اپنے غالب نمبر حصّہ دوم میں اس نسخے کا پورا متن مع اصل کی تصویروں کے چھاپا تھا جس کا تذکرہ پاکستانی غالبیات کے جائزے میں ہے۔

یونیورسٹی میگزین کے غالب نمبروں کا ذکر ابتدا ہی میں ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ مہارانی کالج میسور کے میگزین "الماس"، گورنمنٹ کالج میسور کے "حیاتِ نو"، دہلی کالج کے "فکرِ نو"، دہلی کالج (ایوننگ) کے "شمعِ حیات"، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ترجمان "جامعہ"، اینگلو عربک اسکول کے "اعتمادیہ" اور امام المدارس امروہہ کے مجلّے نے اپنے خاص نمبر سلیقے سے شائع کیے۔

ہندوستان میں سب سے زیادہ ضخیم اور شاندار غالب نمبر رسالہ "شاعر" بمبئی کا تھا۔ اس کے علاوہ سہ ماہی "اردو ادب" علی گڑھ، سہ ماہی "تحریر" دہلی، رسالہ "فروغِ اردو" لکھنؤ، "نیا دور" لکھنؤ، "سب رس" حیدرآباد، "تحریک" دہلی، "آج کل" دہلی، مجلّہ "سیفیہ" بھوپال، "جاں نثار" امرتسر، "صبا" حیدرآباد، "پونم" حیدرآباد، "شگوفہ" حیدرآباد، "شیرازہ" سری نگر، "ہُما" دہلی، "شبستان" دہلی، "علم و فن" دہلی، "توری چھم" جموں وغیرہ رسالوں نے غالب نمبر بڑے اہتمام سے شائع کیے۔

رسالہ "آج کل" کی یہ روایت رہی ہے کہ ہر سال فروری کا شمارہ غالب نمبر ہوتا ہے۔ اردو کے کسی رسالے میں غالب سے متعلق اتنا مواد شائع نہیں ہوا جتنا اس رسالے کے پُرانے فائلوں سے مل سکتا ہے۔ غالب صدی کے موقع پر ایسے مضامین کا انتخاب

"گنجینۂ غالب" کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا گیا۔ اس سے پہلے بھی ایک انتخاب "آئینۂ غالب" چھپ چکا تھا۔

دہلی سے اس سال عابد رضا بیدار نے "غالب اسٹڈیز جرنل" کا آغاز کیا مگر اس کے مختصر ضخامت کے صرف تین شمارے ہی نکل سکے۔

کتابوں میں "کلیات غالب فارسی" جناب امیر حسن نورانی نے مرتب کیا اور اسے راجہ رام کمار بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔ غالب نے خود اپنے کلام کا انتخاب "گلِ رعنا" کے نام سے کیا تھا۔ یہ نایاب تھا، مگر غالب صدی کے آتے آتے اس کے دو قلمی نسخے دریافت ہو گئے۔ ہندوستان میں اسے جناب مالک رام نے چھاپا۔ پاکستان میں جو نسخہ ملا ہے اُس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تمام تر غالب کے قلم ہی سے لکھا ہوا ہے۔ راقم الحروف کے مضامین کا مجموعہ بھی "تلاشِ غالب" کے نام سے اسی سال چھپا۔ اس میں غالب کے دو اردو خطوط، گیارہ فارسی خطوط اور اردو فارسی کا غیر مطبوعہ کلام پیش کیا گیا ہے اور بعض دوسرے تحقیقی مضامین ہیں۔

"غالب اور حیدر آباد" (ضیاء الدین احمد شکیب) "غالب اور بھوپال" (جناب عبدالقوی دسنوی) بھی اس موقعے پر شائع ہوئیں۔ منظور الحسن برکاتی نے ایک کتاب "غالب اور ٹونک" لکھی جو چھپ گئی تھی، پھر نہ معلوم کیوں چھُپ گئی۔

نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے عبدالقوی دسنوی کی مرتب کردہ غالب ببلیوگرافی "غالبیات" کے نام سے چھاپی اور "غالب سے متعلق چند مباحث" جناب ابو محمد سحر کے مضامین کا مجموعہ غالب صدی کے بعد مرتب ہو کر کتابی صورت میں آیا۔ خاندان لوہارو کے ایک بزرگ نواب خسرو مرزا نے "اصہار الغالب" کے نام سے ایک مختصر کتاب میں غالب کے رشتہ داروں کے بارے میں ضروری معلومات جمع کر دیں۔ محمد عتیق صدیقی نے "غالب اور ابوالکلام" کے زیرِ عنوان غالب سے متعلق مولانا آزاد کی تمام تحریروں کو ضروری وضاحتوں کے ساتھ جمع کیا۔ یہ مکتبہ شاہ راہ کی پیش کش تھی۔

غالب کی تمام تصانیف کے صحیح ترین متون چھاپنے کا بیڑا جناب قاضی عبدالودود

نے اٹھایا تھا۔ مگر اس سلسلے کی صرف ایک کتاب "قاطعِ برہان و رسائلِ متعلّقہ" ہی چھپ سکی ہے۔ اس کے بھی حواشی والی جلد ہنوز باقی ہے۔

غالب کی زندگی پر ڈرامے اور تمثیلیں بھی لکھی گئیں۔ ان میں "کہرے کا چاند" (ڈاکٹر محمد حسن) "تصویرِ خیال" (ابرار الرحمٰن قدوائی) "مرزا غالب" (منجو قمر) "تماشا مرے آگے" (رفعت سروش) "دودِ چراغِ محفل" (رفیعہ سلطانہ) "غالب" (ڈاکٹر اعجاز حسین) اور "غالب کی واپسی" (سلیم تمنائی) قابلِ ذکر ہیں۔

دیوانِ غالب کے انتخابات، دوسری زبانوں میں منتخب تراجم، یا جزوی شرحیں بھی شائع ہوئیں۔ ان میں محمد مجیب کا "انتخابِ کلامِ غالب" کے علاوہ سردار جعفری، قرۃ العین حیدر، اعجاز احمد وغیرہ کے انگریزی تراجم ہیں۔ دانیال لطیفی نے کلامِ غالب کو رومن رسم الخط میں منتقل کیا۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے ایک انتخاب اس دعوے کے ساتھ چھاپا کہ یہ ڈاکٹر ذاکر حسین کا کیا ہوا ہے، مگر اس پر دلیل نہیں دی ہے۔ غالب صدی پر ہونے والے چند اہم کاموں میں سے ایک وہ نظام میموریل لیکچر ہے جو اس سال پروفیسر رشید احمد صدیقی نے "غالب: شخصیت اور شاعری" کے موضوع پر دیا اور اب کتابی صورت میں آگیا ہے۔

"کلامِ غالب کا نفسیاتی مطالعہ" (ڈاکٹر سلام سندیلوی) "غالب کے تخلیقی سرچشمے" (حامدی کاشمیری) "غالب کی جمالیات" (شکیل الرحمٰن) "غالب حقیقت کے آئینے میں" (ہنس راج رہبر) بھی اسی زمانے کی مطبوعات ہیں۔

غالب صدی کے موقعے پر اہلِ علم میں جو ولولہ تھا وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب سرد پڑ گیا ہے۔ ۱۹۶۹ء کے بعد گزشتہ برسوں میں قابلِ ذکر کتابیں سات بھی شائع نہیں ہوئیں۔ البتہ ڈاکٹر گیان چند کی "تفسیرِ غالب" اور تازہ کتاب "رموزِ غالب" یا ڈاکٹر خلیق انجم کی "غالب اور شاہانِ تیموریہ" یقیناً غالبیات میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

غالب کی صد سالہ برسی ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں بھی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ درجے کی بہت سی کتابیں چھپیں، رسالوں کے

خاص نمبر نکالے گئے۔ مذاکرے اور جلسے ہوئے۔ سرکاری اور نیم سرکاری سطح پر تمام بڑے شہروں میں یادگاری جلسے منعقد ہوئے۔ پاکستان میں دو ڈائریاں اس سال بہت خوبصورت چھاپی گئیں۔ ایک یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ نے چھاپی، جس میں غالب کے اشعار صادقین کی تصاویر میں پیش کیے گئے تھے۔ اور دوسری "ادارۂ معاشرتی بہبود" ساہیوال نے مرتب کی تھی۔ حکومت پاکستان کے محکمۂ مواصلات نے ڈاک کے دو یادگاری ٹکٹ جاری کیے، ایک پندرہ پیسے کا جس پر یہ شعر لکھا تھا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اور دوسرا ۵۰ پیسے والا جس پر لکھا تھا:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

پاکستانی یونیورسٹیوں میں سب سے اہم کام پنجاب یونیورسٹی لاہور نے کیا۔ غالب کی خوش بختی سے اُس وقت اِس یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی مشہور غالب شناس پروفیسر حمید احمد خاں تھے۔ ان کی کوشش سے ایک مجلس یادگارِ غالب قائم کی گئی جس میں مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، پروفیسر وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وزیرالحسن عابدی، ڈاکٹر وحید قریشی اور سجاد باقر رضوی جیسے ممتاز حضرات شامل تھے۔ اسی سال پنجاب یونیورسٹی میں ایک "غالب چیئر" قائم ہوئی جس پر پہلے غالب پروفیسر کی حیثیت سے وقار عظیم صاحب کا تقرر ہوا۔ "مجلس یادگارِ غالب" نے یہ فیصلہ کیا کہ غالب کی تمام تصانیفِ نظم ونثر، اردو فارسی کا متن صحت اور حسنِ اہتمام سے چھاپا جائے۔ چنانچہ پورا منصوبہ سترہ جلدوں میں پھیلایا گیا اور حیرت انگیز سرعت کے ساتھ تقریباً کل تصانیف ۱۹۶۹ء میں چھپ کر بازار میں آگئیں۔ ان جلدوں کا مختصر حال یہ ہے:

۱۔ دیوانِ غالب اُردو

اسے حامد علی خاں نے مطبع نظامی کانپور والے ایڈیشن کی بنیاد پر ترتیب دیا تھا۔ یہ دیوانِ غالب کی چند خوبصورت اشاعتوں میں سے ایک ہے۔

۲ و ۳۔ خطوطِ غالب (اُردو)

مولانا غلام رسول مہر نے دو جلدوں میں مرتب کیے۔ ان کے صفحات کی مجموعی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔

۴، ۵ و ۶۔ کُلّیاتِ نظم فارسی

غالب کے کلیات نظم فارسی کو تین جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلا حصّہ غزلیات فارسی پر مشتمل ہے جسے وزیر الحسن صاحب عابدی نے ترتیب دیا ہے۔ دوسرے حصّے میں قصائد و مثنویات فارسی اور تیسرے میں قطعات، رباعیات، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ ہیں۔ دونوں حصّے مولانا غلام رسول مہر نے مرتب کیے۔

۷۔ سبد چین، ۸۔ پنج آہنگ

یہ دونوں جلدیں ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی نے ایڈٹ کیں۔ نویں جلد "مہر نیم روز" اور دسویں جلد "دستنبو" کے مرتب ڈاکٹر عبد الشکور احسن تھے۔ گیارہواں حصہ "درفش کاویانی" ڈاکٹر محمد باقر کے مقدمے کے ساتھ چھپا۔ بارہواں حصہ "افاداتِ غالب" ہے۔ اس میں "لطائف غیبی"، "سوالات عبد الکریم" اور "تیغ تیز" شامل ہیں۔ اسے ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی نے ترتیب دیا۔ تیرہویں جلد کا عنوان ہے "غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں"۔ اُس کے مُرتّب سجّاد باقر رضوی اور عبد الشکور احسن تھے۔ اس میں مختلف اہلِ قلم کے تاثراتی مضامین جمع کیے گئے تھے۔

چودھویں جلد "تنقیدِ غالب کے سو سال"، سید فیاض محمود اور اقبال حسین نے مُرتّب کی۔ اس میں گزشتہ سو سال میں غالب پر لکھے گئے مضامین کا انتخاب ہے۔ پندرہویں جلد "اشاریۂ غالب" مُرتّبہ سیّد معین الرحمٰن، غالب کی وضاحتی ببلیو گرافی ہے جو غالب پر کام کرنے والوں کی ہمیشہ رہنمائی کرے گی۔

سولہویں جلد GHALIB-A CRITICAL INTRODUTION (غالب کا تنقیدی تعارف) مصنفہ جناب سیّد فیاض محمود انگریزی خواں طبقے سے غالب کو روشناس کراتی ہے۔ سترہویں جلد "قادر نامۂ غالب" کو ڈاکٹر محمد باقر نے اپنے مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا تھا۔

ان کتابوں کی اشاعت کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی ریسرچ جنرل نے اپنی ۱۹۶۹ء کی اشاعت کو غالب سے مخصوص کر دیا تھا اور اسی یونیورسٹی کے ادارۂ تحقیقات پاکستان نے ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی کی مرتّب کردہ "گلِ رعنا" کو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔

انجمن ترقی اردو پاکستان نے اپنے پندرہ روزہ "قومی زبان" کے دو غالب نمبر چھاپے اور سہ ماہی "اردو" نے بھی اپنی دو اشاعتیں غالب ہی سے منسوب کر دیں۔ ان کے علاوہ انجمن نے چار کتابیں اور شائع کیں۔ "غالب نام آورم" ان مضامین کا ایک اچھا انتخاب ہے، جو غالب سے متعلق موضوعات پر سہ ماہی "اردو" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔ "فلسفۂ کلامِ غالب" ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں بریلی سے چھپا تھا۔ اب اس میں دو ابواب کا اضافہ بھی ہوا ہے اور سائز بھی بڑا ہو گیا ہے۔ تیسری کتاب "مہرِ نیم روز" کا اردو ترجمہ ہے جو سیّد عبدالرشید نے کیا ہے اور چوتھی "ہنگامۂ دل آشوب" قاطعِ برہان والے معرکے سے تعلق رکھتی ہے۔

مجلس ترقیِ ادب لاہور، غالب سے متعلق بہت سی کتابیں پہلے ہی چھاپ چکی تھی۔ "اردوئے معلیٰ" (تین جلدوں میں) "عودِ ہندی"، "مجموعۂ نثرِ غالب (مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی) وغیرہ۔ لیکن اس صدی تقریبات کے موقعے پر مجلس نے دو نہایت ہی اہم کتابیں بہت حُسن اور سلیقے کے ساتھ شائع کیں۔

دیوانِ غالب کا ایک نہایت اہم قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے ذخیرۂ محمود شیرانی میں تھا اور صرف خواص اُس سے مستفید ہو رہے تھے۔ مجلس نے پوری کتاب کا عکس نہایت

روشن اور واضح انداز میں پیش کر دیا ہے۔ یہی "دیوانِ غالب نسخۂ شیرانی" کہلاتا ہے۔
دوسری قابلِ ستایش پیش کش دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ کی اشاعتِ ثانی ہے۔ پہلے تو یہ نواب بھوپال سے منسوب ہو کر نسخۂ حمیدیہ کہلاتا تھا۔ اب اس کے فاضل مرتب پروفیسر حمید احمد خاں کے نام سے منسوب ہو کر بھی "نسخۂ حمیدیہ" ہی رہے گا۔

کراچی میں ادارۂ یادگارِ غالب قائم ہوا جس کی خوب صورت عمارت ناظم آباد چورنگی پر تعمیر ہو چکی ہے۔ اس کے صدر فیض احمد فیض اور سکریٹری مرزا ظفر الحسن صاحب ہیں جنھوں نے شب و روز کی محنت سے ایک شاندار لائبریری بھی جمع کر لی ہے۔ اس ادارے نے ابھی چند ہی کتابیں شائع کی ہیں مگر وہ ہر طرح معیاری اور قابلِ قدر ہیں۔ سید عبدالرؤف عروج نے "بزمِ غالب" کے نام سے غالب کے احباب، معاصرین اور تلامذہ کا تذکرہ فراہم کیا ہے اور اس طرح جن حضرات کے نام خطوطِ غالب میں ملتے ہیں ان کے بارے میں بہت سی قیمتی معلومات یکجا ہو گئی ہیں۔ اگرچہ اس نوعیت کی کتابوں میں ہر وقت ترمیم و اضافے کا امکان رہتا ہے لیکن اب تک اس طرح کی کوئی کتاب دستیاب نہیں تھی "بزمِ غالب" نے بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اس ادارے نے دوسری کتاب ابنِ حسن قیصر کی "غالب نُما" چھاپی ہے۔ یہ پاکستانی رسائل میں غالب سے متعلق چھپنے والے مضامین کا انڈکس ہے۔ مسلم ضیائی نے "غالب کا منسوخ دیوان" میں ایسے اشعار سے بحث کی ہے۔ جو قطع و برید کے عمل میں دیوان سے خارج ہوتے رہے۔ ادارے کی چوتھی کتاب سید حُسام الدین راشدی کی "دودِ چراغِ محفل" ہے جس میں غالب کے پانچ احباب کا مفصل تذکرہ ہے۔ محمد عمر مہاجر کا ترجمہ "پنج آہنگ" بھی اس ادارے نے چھاپا ہے۔

ان کے علاوہ مختلف پاکستانی اداروں سے شائع ہونے والی کتابوں میں "اطرافِ غالب" (ڈاکٹر سید عبداللہ)، "غالب اور مطالعۂ غالب" (عبادت بریلوی)، "غالب کا فن" (عبادت بریلوی)، "روحِ غالب" (صوفی تبسم)، "باغِ دو در" (مرتبہ وزیر الحسن عابدی)، "دبستانِ غالب" (ناصر الدین ناصر)، "غالب، شاعرِ امروز و فردا"

(فرمان فتح پوری)، "غالب نام آورم" (نادم سیتاپوری)، "محاسنِ الفاظِ غالب" (نذیر احمد)، "تلاشِ غالب" (نثار احمد فاروقی)، "مفہومِ غالب" (احسن علی خاں)، "شش جہات غالب" (نبی احمد باجوہ)، "غالب اور سنہ ستاون" (سید معین الرحمٰن) اور "عرفانِ غالب" (سلطان احمد صدیقی) کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

جن رسالوں اور اخباروں نے اس موقعے پر خصوصی غالب نمبر شائع کیے، پہلے ان کی ایک مکمل فہرست ابجدی ترتیب سے دیکھ لیجیے:

آہنگ (کراچی)، اخبارِ جہاں (کراچی)، ادبِ لطیف (لاہور)، اردو (کراچی)، اردو روز نامہ (کراچی)، افشاں (کراچی)، افکار (کراچی)، اقبال ریویو (لاہور)، الزبیر، العلم، امروز، انجمن اسلامیہ میگزین، اوراق، جامِ نو، جرنل آف ریسرچ، جنگ، حریت، حمایت اسلام، خیاباں، دبستان، راوی، سیارہ، سوویت جائزہ، سیر بین، شاہین، صحیفہ، فاران، فردا، فنون، فیضان، قندیل، قومی زبان، کتاب، کوہستان، گلفشاں لاہور، ماہِ نو، مشرق، منشور، نقوش، نگار پاکستان، نئی قدریں، نوائے وقت، ویمن ڈائجسٹ، ہمدرد صحت وغیرہ تقریباً ۶۵ اخباروں اور رسالوں نے اپنے اپنے غالب نمبر پیش کیے۔ مجموعی طور پر "نقوش" سب رسالوں سے بازی لے گیا۔ جس نے تین ضخیم جلدوں میں غالب نمبر چھاپے ہیں۔ پہلی جلد ۸۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ کا مکمل متن مع عکس اور مقدمہ و تصریحات کے شامل ہے۔ جب تک غالب کے پرستار رہیں گے ان نمبروں کی قدر و قیمت میں کمی نہیں آسکتی۔

مجلس ترقی ادب لاہور کا ترجمان سہ ماہی "صحیفہ" ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں نکلتا ہے۔ اس نے اپنا غالب نمبر چار حصّوں میں پیش کیا۔ ہر حصّے میں عالمانہ تحقیقی و تنقیدی مضامین ہیں۔ چاروں حصّوں کے صفحات مجموعی طور پر ۹۶۸ اور مضامین ۵۷ ہوتے ہیں۔ پاکستانی رسائل میں سب سے زیادہ وقیع غالب نمبر نقوش، صحیفہ اور اردو ہی کے رہے۔

رسالہ "کتاب" لاہور کا "غالبیات نمبر" شیخ محمد اسماعیل پانی پتی مرحوم نے

ترتیب دیا۔ انھوں نے غالب صدی کے موقعے پر ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہونے والے تقریباً تمام رسالوں اور کتابوں پر تعارفی نوٹ لکھ دیے ہیں اور مضامین کی فہرست بھی درج کر دی ہے۔ "ماہِ نو" پاکستان کا سرکاری رسالہ ہے اور ہمارے رسالہ "آج کل" کی طرح یہ بھی ہر سال ماہِ فروری میں کچھ نہ کچھ غالبؔ سے متعلق چھاپتا رہتا ہے۔ لیکن صد سالہ برسی کے موقع پر "ماہِ نو" نے بجائے نیا غالبؔ پیش کرنے کے اپنے ہی پرانے مضامین کا ایک مبسوط انتخاب تیار کر دیا تھا۔ اس میں چند نئے مضامین بھی شامل کیے گئے تھے۔ اس طرح رسالہ "نگار" جو پہلے نیاز فتح پوری کی ادارت میں چھپتا تھا، اب جناب فرمان فتح پوری اسے "نگار پاکستان" کے نام سے نکال رہے ہیں۔ انھوں نے "نگار" کی ماضی کی اشاعتوں میں چھپے ہوئے مضامین کا ایک انتخاب "غالب نمبر" کی صورت میں مرتب کیا تھا۔

یہ ہندوستان اور پاکستان میں غالبیات کے کاموں کا ایک سرسری اور اجمالی جائزہ ہے۔ شاید بعض کتابوں کا نام بھی اس میں درج نہ ہو سکا ہوگا۔ ۱۹۷۰ء کی تعطیلات گرما میں مجھے پاکستان کے ادبی اور تہذیبی حلقوں سے تعارف کا موقع ملا تھا۔ بعض اداروں نے مجھے مدعو کیا تو یہی فرمایش کی کہ ہندوستان میں غالبیات کے کاموں کی تفصیل بیان کروں۔ میں نے پاکستان رائٹرز کلب کے ایک جلسے میں تمام کاموں کا جائزہ لیا بھی تھا۔ اُس وقت حاضرین کے سوالات سے یہ اندازہ ہوا کہ ادبی حلقوں میں عام طور سے یہ جاننے کی خواہش ہے کہ غالب صدی منانے میں کس ملک کا حصّہ زیادہ اہم رہا۔ میرا خیال ہے کہ اپنے اپنے حلقۂ اثر اور وسائل کو دیکھتے ہوئے دونوں ملکوں میں غالب صدی پر اچھے اور بڑے کام سامنے آئے۔ پاکستان میں غالبؔ سے متعلق کتابیں زیادہ چھپیں مگر تحقیقی معیار سے ہندوستان میں بلند پایہ کام ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی نے "غالب چیئر" قائم کر کے اچھی مثال پیش کی اور تصانیفِ غالبؔ کے یونیفارم ایڈیشن مرتّب کرا کر چھاپے۔ لیکن ہمارے کام بھی کسی طرح کم اہم نہیں رہے۔ ہم نے "ایوانِ غالب" اور "غالب اکیڈمی" قائم کی۔ بین الاقوامی سیمنار کیا۔ "غالب اور

آہنگِ غالب"، جیسی کتاب چھاپی اور آخری بات یہ کہ دیوانِ غالب کا نسخہ امروہہ دریافت کیا۔ میں نے وہاں یہی کہا تھا کہ اردو کا گھر بھی ہندوستان میں ہے اور غالب کا بھی۔ اس لیے ہم نے غالب صدی پر جو کچھ بھی کیا وہ ہمیں کرنا ہی چاہیے تھا۔ اس میں ستایش کی تمنا یا صلے کی پروا نہیں ہے۔

ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی غالب صدی کے بعد سناٹا چھا گیا اور گزشتہ سات برسوں میں غالب سے متعلق کتابیں صرف چار چھپی ہیں۔ حالاں کہ غالب صدی کو ایک نقطۂ آغاز ہونا چاہیے تھا نقطۂ اختتام نہیں۔ (مارچ ۱۹۷۶ء)

غالبؔ تاریخ کے دوراہے پر

غالبؔ کا عہد یعنی ۱۷۹۷ء سے ۱۸۶۹ء تک پھیلی ہوئی ۷۲ سال کی مدت جس میں ۱۹ ویں صدی کا نصفِ اوّل گم ہو گیا ہے، اپنے سماجی عوامل اور تاریخی اثرات کے اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ میں بہت ہی اہم زمانہ ہے، اور ہم صرف ہندوستان ہی نہیں سارے کرۂ ارض پر نظر ڈال کر دیکھیں تو یہ بڑا فیصلہ کن عہد نظر آتا ہے۔ یورپ میں صنعتی انقلاب کی تکمیل ہو رہی ہے۔ انسانیت تاریخ کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ جہاں تقلید اور اجتہاد، عقلیت اور عقیدہ، روایت اور تجدّد یا مختصراً کہیے تو قدیم اور جدید کے درمیان ایسا نمایاں فرق اور اتنا شور انگیز معارضہ نظر آتا ہے، جو انسانی تہذیب کی چند ہزار سالہ تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتا۔ یہ وہ دَور ہے جس میں تجدید کو انسانی تہذیب کا تکملہ نہیں بلکہ روایت کے خلاف ایک صف آرائی سمجھا گیا ہے۔

اس زمانے میں یورپ انگڑائی لے رہا ہے اور تاریخ کے جدلیاتی عمل کی نئی تفسیر پیش کرنے والا جرمن نژاد کارل مارکس (۱۸۱۷ء۔۱۸۸۳ء) جسے اقبالؔ نے "نیست پیغمبر ولے دارد کتاب" کہہ کر یاد کیا ہے اور فریڈرک اینگلز (۱۸۲۰۔ ۱۸۹۵ء) اپنی فکر سے وہ چنگاریاں روشن کر رہے ہیں (۱۸۴۸ء) جو ۱۹۱۷ء تک ایک سرخ انقلاب کے شعلوں میں تبدیل ہو کر نئے اشتراکی نظام کی تخلیق کرنے والی ہیں جس کی فکری سیادت کو

بالآخر آدھی دنیا پر چھا جانا ہے۔

جرمنی ہی میں گوئٹے (۱۷۴۹-۱۸۳۲ء) اپنی فاؤسٹ لکھ رہا ہے جس میں نظریۂ خیر و شر کی ایک نئی تعبیر کی جا رہی ہے۔ اسی زمانے میں سگمنڈ فرائڈ (ولادت: ۱۸۵۶ء) عالمِ وجود میں آیا ہے، جسے انسانی شعور کے تہ خانوں میں اتر جانا ہے۔

غرض فلسفہ، سماجیات، تاریخ اور طبیعات کے ایسے عظیم مفکر اس دور میں پیدا ہو رہے ہیں جن کا اثر و نفوذ ہماری صدی میں بھی باقی ہے۔ مشرق نے جو علوم کی قندیل صدیوں تک روشن رکھی تھی، اس کی لَو مدّھم پڑتی جا رہی ہے اور مغرب ساری کائنات پر چھا جانے کے لیے تازہ دم ہو رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام میں "چرچ" کا انسٹی ٹیوشن نہیں ہے، لیکن مذہب نے ہمیشہ اپنے اقتدارِ اعلیٰ کو باقی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ عجیب لطیفہ ہے کہ مسلمان کی تاریخ میں بھی آزاد خیال، سیکولر یا تجدّد پسند انقلابی پیدا ہوئے، مگر وہ اپنی کوئی تنظیم نہیں بنا سکے۔ ہر دور میں متفرق رہے۔ عالمِ اسلام میں صرف انھیں تجدّد پسندوں کو کچھ کامیابی ہوئی ہے، جنھوں نے اپنا دامن مذہب سے باندھے رکھا ہے۔ جمال الدین افغانی (۱۸۳۸-۱۸۹۷ء) عالمِ اسلام میں تحریکِ تجدّد کے بنیاد گزار ہیں، مگر ان کی دعوت بھی وحدت اسلامیہ کی طرف تھی۔ اور وہ ابطال مذہب الدہریین لکھ کر عالمِ عرب میں متعارف ہوئے تھے جس کا عربی ترجمہ محمد عبدہ کا کیا ہوا تھا۔ اسی طرح سر سیّد احمد خاں نے ولیم مور کی لائف آف محمدؐ کا جواب لکھ کر مذہبی حلقوں میں اعتبار حاصل کیا تھا ورنہ ان کی تفسیر انھیں اور زیادہ غیر مقبول بنا سکتی تھی۔

یورپ میں جس وقت عقل اور اجتہاد کی حکمرانی کے علم بلند کیے جا رہے تھے، اسلام کے مرکز نجد و حجاز میں عبدالوہاب نجدی (۱۷۰۳-۱۷۸۷ء) کی تحریک احیا (Islamic Fundamentalism) پیدا ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں احیا کی یہ تحریک اسی شہر کے اسی علاقے سے اٹھی اور مولانا اسماعیل شہید (۱۷۸۱-۱۸۳۱ء) کی شہادت پر اس کا مرحلہ ختم ہو کر دینی تعلیم کے احیا کی شکل میں دوسرا مرحلہ شروع ہوا جو اب ہندوستان

کے ہر شہر اور قصبے میں خاموش تحریک کی جارہی ہے۔

اس سے زیادہ تفصیل ہمیں موضوع سے دور لے جائے گی۔ کہنا یہ ہے کہ عقلیت اور سماجی انقلاب کی جو تحریکیں انیسویں صدی میں اٹھیں وہ سب مغرب کی مادہ پرست اقوام کی طرف سے اٹھیں۔ عالمِ اسلام نے اگر کوئی انقلابی آواز بلند کی تو وہ دین کے احیا کی آواز تھی۔ اگر افغانی اور سر سید کی طرح تعلیمی یا فکری انقلاب کی کوئی دعوت آئی تو وہ بھی مذہب کے ظلِ حمایت میں آئی۔ شاید اسی لیے مولانا شبلی نے ایک خط میں مولانا آزاد کو لکھا تھا کہ اگر اپنی دعوت کو مقبول و موثر بنانا ہو تو مذہب کا لبادہ اوڑھ کر آؤ۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا، اسلامی معاشرے میں عقلیت پسند اور سیکولر گروہ ہمیشہ موجود رہا ہے، مگر منظم کبھی نہیں ہوا۔ اگر ایسی تنظیم کبھی ہوتی تو غالب اس کے ممبر یقیناً ہو گئے ہوتے۔ انھوں نے قدیم و جدید کی کش مکش میں کبھی قدامت کی سرپرستی نہیں کی۔ ان کا مذہب بھی واجبی اور روایتی تھا۔ اہلِ تقلید نے انھیں ایک تو ان کی ذہانت کے سبب سے معاف رکھا۔ دوسرے اس لیے کہ انھیں غالب کے دَور میں سیاسی اقتدار نصیب نہیں تھا۔ ورنہ جو طبقہ ابن المقفع جیسے نابغہ کو ۲۶ سال کی عمر میں یہ شعر کہنے پر اور زندیقوں کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرنے کی پاداش میں:

یا بیتَ عاتکۃ الذی اتعزّل
حذرَ العدی وبکَ الفؤاد موکّل

انی لأمنحک الصدود واننی
قسماً الیک من الصدود لأمیل

زندہ جلا کر ہلاک کر سکتا تھا، وہ غالب کو "دینِ بزرگاں خوش نہ کرد" کہنے پر داد نہیں دے سکتا تھا۔

یہاں ایک سوال خود ہی اٹھا کر بٹھانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ہمیں کسی فن کار کا سیاسی اور سماجی پس منظر جاننے یا اسے بیان کرنے کی ضرورت کیوں ہے؟

اس دنیا کی عمر آپ تھوڑی دیر کے لیے چند ہزار سال سمجھ لیجیے۔ انسان کی جبلت ہزاروں سال سے وہی ہے، بقائے نسل کی خواہش، فنائے ذات کی کشش، خوف، تحفظ کا احساس۔ اسی طرح انسانی نفسیات اور جذبات بھی وہی ہیں۔ کسی حسین منظر یا دل کش صورت کو دیکھ کر زمانہ ماقبل تاریخ کے انسان نے جو گدگدی اپنے قلب و روح میں محسوس کی ہوگی وہی آج کے ایٹمی دَور میں بھی محسوس ہو سکتی ہے۔ اس وقت کے انسان نے وصل ہجراں کی جن کیفیتوں کو جیسا پایا ہوگا، آج بھی وہ اس سے مختلف نہیں ہیں۔ پھول کھلتے ہیں، بادِ نسیم اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ ہم بیزار بیٹھے ہیں، سیاہ بادل اُمڈ کر آ رہے ہیں، آبشاروں کا پانی نغمہ ریزی کر رہا ہے، صبح و شام گلے مل رہے ہیں، شفق پھول رہی ہے، بلبل چہک رہی ہے (یا مذکر ہے تو چہک رہا ہے) ان میں سے کسی منظر میں بھی کوئی ایسا تغیّر ماہ و سال کے ساتھ نہیں ہوتا ہے جس کا نمایاں اثر شاعر کے ذہن یا شعر کی ساخت پر دریافت کیا جا سکے۔ لیکن سیاسی اور تہذیبی انقلاب و حوادث کا اثر ہمارے معاشرے پر ضرور پڑتا ہے۔ اور ادب معاشرت کا آئینہ ہے وہ اسے منعکس کرتا ہے۔ کبھی حکومت کی طرز بدلتی ہے، کبھی امن و انتظام کی نوعیت دگرگوں ہوتی ہے، کبھی خوش حالی اور فارغ البالی کا دَور دورہ ہوتا ہے، کبھی افلاس اور بدحالی کا، کبھی ایک مخصوص نظریہ کی سیادت ہوتی ہے، کبھی کوئی خاص تہذیب پرورش پاتی ہے۔ خارجی مظاہر کی یہ سب کیفیات سوچنے کے انداز اور اظہار کے اسلوب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لیے فن کار جس تاریخی اور سیاسی سیاق و سباق میں زندہ رہا ہے، اسے گہری نظر سے جانچے بغیر اس کے فن کو بھی اچھی طرح پرکھا نہیں جا سکتا۔

غالبؔ کے سیاسی اور سماجی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے میں یہاں سلطنتِ مغلیہ کے زوال کی وہ کہانی نہیں دہراؤں گا جسے ہمارے بیشتر لکھنے والے آنکھیں بند کر کے اورنگ زیب کی وفات سے شروع کرتے ہیں اور اس کے نااہل جانشینوں کو ملاحیاں سناتے ہوئے ۱۸۵۷ء کے غدر میں شریک ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں

یہ نظر میں رکھنا ہوگا کہ غالب نے جب ہوش سنبھالا تو سلطنتِ مغلیہ حواس باختہ ہو چکی تھی اور مرہٹوں، جاٹوں یا سکھوں کی طاقت بھی کوئی ایسی بنیاد نہیں رکھتی تھی جو مغلیہ حکومت کا متبادل فراہم کر سکے۔ ایک نئی غیر ملکی طاقت کمپنی بہادر کی البتہ اپنی جڑیں گہرائی میں جما چکی تھی اور مشرق سے شمال مغرب کی طرف بڑھتی چلی آتی تھی۔ اس نے پہلے مرہٹوں کا شیرازہ بکھیر کر اسے چند ریاستوں میں بانٹ دیا۔ پھر سکھوں کی طاقت توڑنے کے لیے سرحد و پنجاب کو میدانِ جہاد بنا دیا۔ آخر جب مغلیہ سلطنت کی جگہ لینے والی کوئی طاقت باقی نہ رہی تو ایک بہانہ ملتے ہی اسے بھی تاریخ کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

مرزا غالب نے آگرے میں آنکھ کھولی۔ ان کے پڑوس میں فتح پور سیکری کی سنگین اور ویران عمارتیں ایک سطوت و جلال کے رخصت ہونے کی داستان سنا رہی تھیں۔ بچپن ہی میں دہلی آئے تو قلعۂ معلیٰ کے در و دیوار اپنی زبانِ حال سے ایک تہذیب کے سکرات کا حال سنا رہے تھے۔

جب کسی عقیدے یا نصب العین کی روح مر جاتی ہے تو اس کے رسوم و ظواہر کی لکیر پیٹنے میں مبالغہ کیا جاتا ہے، اسی طرح جب سچی طاقت حقیقی سطوت اور واقعی دولت ہاتھوں سے نکل جاتی ہے تو ظاہری القاب و آداب ہی عظمتِ رفتہ کا نشان رہ جاتے ہیں اور انھیں دانتوں سے پکڑا جاتا ہے۔ یہی سب کچھ غالب کے دور میں بھی تھا۔ انھیں دربارِ مغلیہ سے کھوکھلے خطابات پاکر جو طمانیت ہوتی ہے، اپنے قلیل وظیفے کو آثارِ امارت کے طور پر باقی رکھنے کے لیے جو تگ و دو کرتے ہیں، انگریز کے دربار میں کرسی کے نمبر کو جن للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں اور الور، حیدر آباد، اودھ انگریز ریذیڈنٹ یا ملکہ معظمہ کے دربار سے برائے نام وابستگی کو جو اہمیت دیتے ہیں وہ سب دراصل غالب کی اپنی تہذیبی شناخت کا مسئلہ ہے، اس لیے ان کی نگاہ میں سارے مسئلوں سے زیادہ اہم ہے۔

غالب کی زندگی میں جو اہم سیاسی اور تاریخی حوادث رونما ہوئے ان میں

انگریزوں کا لارڈ لیک کی قیادت میں دہلی کو فتح کرنا (۱۸۰۴ء) مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ایک مضبوط سکھ ریاست قائم کرنا اور اس کے حدود کو کشمیر و سرحد تک پھیلا دینا۔ (۱۸۲۳ء تک) پھر سید احمد شہید بریلوی کی تحریک جہاد (۱۸۳۱ء) جسے دراصل احیائے دین کے لیے شروع کیا گیا تھا اور جو بنیادی طور پر فرنگی استعمار کے خلاف تھی۔ لیکن انگریزوں نے اپنی حکمتِ عملی سے اس کا رُخ مقامی باشندوں کی طرف موڑ کر اپنے دونوں دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا اور جس کا انجام ایک بڑی حسرتناک شکست کی صورت میں نکلا۔ پھر پنجاب کا انگریزوں کے چنگل میں آنا، اودھ کی جمی جمائی خوشحال ریاست کا خاتمہ۔ اور پھر "مقطع سلسلۂ مکر و کید" جو فرنگی ظلم و استبداد کا مطلع بھی تھا یعنی ۱۸۵۷ء۔ اس جنگِ آزادی نے انگریزوں کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے یہ محسوس کر لیا کہ ہندوستان کے قومی اتحاد کو پارہ پارہ کر کے ہی وہ اپنے استعمار کو باقی رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ ورنا کیولر ایجوکیشن کا وہ نظام شروع کیا گیا جس نے اردو اور ہندی کو قطبین میں بدلنا شروع کر دیا۔ ترکی حکومت محمد شاہ پر تمام ہو گئی تھی وہ آخری مغل بادشاہ تھا جس کی مادری زبان ترکی تھی۔ فارسی کچی پکی باقی تھی، اسے ایرانیوں کی لن ترانیوں نے قدم جمانے سے روکا۔ عربی مذہبی مدارس میں معتکف ہو گئی۔ سنسکرت کبھی عوامی چلن کی زبان نہیں تھی۔ ہندی ابھی ان گھڑ تھی، اردو کچہری کے مقدمے لڑنے اور رپٹ لکھوانے کے کے کام آسکتی تھی۔ دفتری انتظام اور علمی تصانیف کے لیے انگریزی کو صاف میدان مل گیا۔ مشنریوں کو سرکاری سرپرستی میں جگہ جگہ اسکول کھولنے کی سہولتیں دی گئیں۔ ایک نیا نظامِ تعلیم اور اس کے ساتھ مغرب سے مختلف علوم پر کتابوں کا ایسا سیلاب آگیا کہ ساری مقامی زبانیں منقار زیر پر ہو کر بیٹھ گئیں۔ چنانچہ انگریزی آج بھی راج کر رہی ہے اور اسے اپنی جگہ سے ہلائیے تو ہمیں عالمی برادری سے اپنا رشتہ ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ بلکہ خود اندرونِ ملک مختلف اللسان صوبوں کا شیرازہ اس سے بندھا ہوا ہے۔

مغرب کا یہ سیلاب ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھا۔ بکرمی اور ہجری سنین تقویم پارینہ ہو گئے۔ عیسوی کلنڈر ہمیں رفتارِ زوال بتانے لگا۔ دن جو آٹھ پہروں میں بٹا ہوا تھا جو اب ہمیں صرف دو پہر، سہ پہر اور پچھلے پہر کے محاوروں میں یاد رہ گیا ہے، ۲۴ گھنٹوں میں تقسیم ہو گیا۔ ریگِ ساعت اور آفتابی گھڑیوں کی جگہ گھڑیال آ گئے جو گرین وِچ سے اپنا سلسلۂ نسب ملاتے ہیں۔ میر علی، رشید دیلمی، یاقوت اور پنجہ کش کا مع وصلیوں وصال ہو گیا۔ بپٹسٹ مشن پریس اور کیتھولک پریس، لوہے کے حروف اور لیتھوگراف کے پتھر سوادِ دیدہ کو روشن کرنے لگے۔

اب ہماری زبان کے اصول و قواعد انگریز لکھ رہے تھے۔ اردو ہندی کے لغات وہ مرتب کر رہے تھے۔ ہماری تہذیب اور ہمارے مذہب کی تاریخ بھی ان کی مرہونِ منت تھی۔ ہم صرف غزل میں چونچال کر رہے تھے اور یہ خبر نہیں تھی، وقت تیزی سے ہماری مخالف سمت میں بھاگ رہا تھا۔

ان ۷۰-۷۲ برسوں میں پہلے دلّی شہر کی طرف دیکھیے تو اس شکستہ در و دیوار، امرا کی اجڑی ہوئی ڈیوڑھیاں شوکتِ پارینہ کا پتا دیتی تھیں تو عام لوگوں کے کہگل کیے ہوئے مکان، ان سے کمتر اقتصادی رتبہ والوں کی کھپریلیں اور بالکل نادر محنت کشوں کے چھپّر عوام کی بے بسی اور آنے والے ایک سماجی انقلاب میں ان کی بے چارگی پر تصویرِ یاس بنے ہوئے تھے۔ مغلیہ دور میں تمام صنعتیں دربار کی وابستگی سے فروغ پاتی تھیں۔ جب فرخ سیر کے زمانے سے انگریزوں کو مزید تجارتی سہولتیں حاصل ہو گئیں تو اردو شاعری میں شہر آشوب کی لَے تیز تر ہو گئی۔ رفتہ رفتہ حرفت پیشہ سب سے زیادہ مفلوک الحال ہو گئے، مولانا فضلِ حق خیر آبادی کا ایک غیر مطبوعہ خط جو بہادر شاہ ظفرؔ کے نام لکھا گیا تھا اور جسے میں نے رسالہ "نوائے ادب" بمبئی میں شائع کرا دیا تھا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کا اصل سبب ملکی باشندوں کی اقتصادی اور معاشی نا آسودگی اور غیر طاقت کے ہاتھوں ان کا پیہم استحصال تھا۔

دلّی کا دل قلعۂ معلیٰ تھا۔ سارے شہر کی ہر خوشی اور ہر غم کا سرچشمہ وہی تھا۔ کسی شہزادے کے سہرا بندھ رہا ہے تو شہر والے بدھائیاں گا رہے ہیں، کسی کو قید کر کے الٰہ آباد بھیجا جا رہا

ہے تو برے الاپے جا رہے ہیں۔ غالب نے تین مغل بادشاہوں کا زمانہ پایا۔ جب انھوں نے آنکھ کھولی تھی تو کور چشم شاہ عالم ایک شامیانے کے نیچے فاعتبروا یا اولی الابصار بنے بیٹھے تھے۔ اور انگریزوں کی عطا کردہ ایک لاکھ ماہانہ کی پنشن میں مگن تھے۔ پھر اکبر شاہ ثانی کا دور آیا تو یہ پنشن اور بھی کم ہو گئی اور مراعات میں تخفیف کر دی گئی۔ لیکن وظیفہ کے گھٹنے سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ انگریزوں کی طرف سے آنے والی چٹھیوں میں القاب و آداب گھٹتے جا رہے تھے۔

اکبر شاہ ثانی کے ساتھ (۱۸۳۷ء) بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے بالکل ہی شاہِ شطرنج بنا دیا تھا اور یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ ان کے بعد کوئی بادشاہ کا لقب اختیار کر کے نہیں بیٹھے گا۔ مہرولی میں رہو اور انگریزوں کی پنشن کھا کر سرکار کمپنی بہادر کو جم جم جینے کی دعائیں دو۔

غالب کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ امیر زادے تھے۔ نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب سلجوقی و افراسیابی تھے۔ انھیں معاشرے میں وہی جگہ ملنی چاہیے جو اُن کی تھی۔ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے دربار سے اپنا تعلق قائم کیا۔ اور اس کے لیے کچھ جوڑ توڑ بھی کیے ہوں گے۔ انھیں ۵۰ روپے ماہوار کی خدمت تاریخ نویسی کی مل گئی۔ چھے چھے ماہ تنخواہ نہیں ملتی تھی مگر اس تعلق کے نام پر ان کا اعتبار بنا ہوا تھا:

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اترتا

اس کے نام پر انھیں سودی ادھار ملنے میں بھی یقیناً کچھ سہولت ہوئی ہو گی۔ اتنا تو ضرور تھا کہ سر برآوردہ لوگوں کو عدالت کی ڈگری کے باوجود ان کے گھر سے گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے غالب گھر میں بیٹھے حقّے سے شغل کرتے رہتے تھے اور کبھی محمد حسین تبریزی سے، کبھی رحیم بیگ اور احمد علی سے، کبھی زہرہ و مشتری سے چھیڑ خانی میں اپنا وقت گزارتے تھے۔

غالب عالمِ جوانی میں کلکتے گئے تھے۔ وہاں ایک خاصی مدّت تک مقیم رہے۔ در ایامِ جوانی چنانکہ افتد و دانی۔ انھوں نے لعبتانِ فرنگ کی عشوہ فروشیاں دیکھیں، لیکن وہاں

مغربی تہذیب کا جماؤ دیکھ کر وہ دوسرے سب دلّی والوں سے پہلے اور سب سے زیادہ اس حقیقت کو سمجھ چکے تھے کہ اب یہ سیلِ بے اماں کسی کے روکے نہیں رکے گا۔ ہندوستان کے مشرق سے تہذیبِ مغرب کا نیا سورج طلوع ہوگا اور ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرنے سے کچھ حاصل ہوتا نہیں ہے۔ اس سفر نے ان کے تاریخی شعور کو بھی بیدار کیا۔ اگرچہ وہ مورخ نہیں ہیں اور جب شاہانِ مغلیہ کی تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو روایتی انداز میں اسے ہبوطِ آدم سے شروع کرتے ہیں اور عبارت کے گھٹا ٹوپ پر واقعات کی تفصیل کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ محامد و مناقب میں عبارت آرائی کو تاریخ نگاری سمجھتے ہیں۔ مگر جب سرسید ان سے آئینِ اکبری پر تقریظ لکھوانا چاہتے ہیں تو وہ مغربی تہذیب کا ایک قصیدہ نظم کر کے بھیج دیتے ہیں۔ جس کے بین السطور میں یہ ہے کہ اب گڑے مُردے اُکھاڑنے سے کیا ہوتا ہے۔ اکبر اعظم کا زمانہ واپس آنے والا نہیں، اس قوم کو دیکھو جو :

حرف چوں طائر بپرواز آورند

لیکن ۱۸۵۷ء میں ان سے فہم و تدبر کی ایک غلطی ہوگئی۔ قلعے سے وہ تعلق پیدا کر چکے تھے، بغاوت کا طوفان آیا اور بہادر شاہ کو پھر شہنشاہِ ہند بنا دیا گیا تو اس وقتی جوش و خروش کو دیکھ کر غالب بھی یہ سمجھے کہ شاید یہ اونٹ اسی کروٹ بیٹھ جائے، لیکن سقوطِ دہلی کے بعد انھیں اندازہ ہوگیا کہ جوش پر ہوش کی فتح یقینی ہے۔

سرسید نے تو سارے مسلمانوں کے سر سے بغاوت کا الزام اتارنے کے لیے اسبابِ بغاوتِ ہند لکھی، لیکن غالب نے عالمِ بے شغلی میں یہ شغل کیا کہ ایک طرف فارسی نہ جاننے والوں سے اپنی فارسی دانی کا لوہا منوائیں، دوسری طرف اپنے دامن سے دربارِ مغلیہ سے وفاداری کے داغ دھو دیں :

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

حالانکہ وہ ۱۸۵۷ء کی شورش سے براہِ راست متاثر ہوئے تھے۔ ان کا مال و اسباب لٹا، خلعت و خطاب لٹا، تنخواہ بند ہوئی۔ ایک دیوانے بھائی فوج کی گولی سے ہلاک

ہوئے الزامات لگے، مقہور و معتوب ہوئے، دلّی کی ویرانی، عمارتوں کی شکست، تیشہ و کلند کی طغیانی دیکھی، سب کچھ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا اور پھر غالبؔ کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ایک اور جنم تھا اور اب یہ دوسرا جنم لیا ہے، جس میں کوئی صورت اور کوئی نقشہ اس سے پہلے جنم کا نہیں پایا جاتا ہے اس کے باوجود وہ ہندوستانیوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور فرنگی مقتولوں کا ماتم کرتے ہیں، جن میں کوئی ان کا دوست تھا اور کوئی معشوق۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس رویّے کا تعلق غالبؔ کی خود غرضی سے نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ان کا تاریخی شعور ہے، جسے ۱۸۵۷ء سے ایک نئی مہمیز ملی تھی، یا اسے تاریخی وجدان کہیے جو انھیں یہ بتا رہا ہے کہ محض ہندوستانی باغیوں کی وکالت کرنا یا ان کی مظلومیت کا مرثیہ پڑھنا تاریخی اور تہذیبی قوتوں کے اس تصادم میں پیش آنے والے فیصلے کو بدل نہیں سکتا۔

اس طرح غالبؔ نے تاریخ کے دوراہے پر پہنچ کر وہ راستہ اختیار کیا جس پر وہ اگر اور زندہ رہتے تو چلتے، لیکن سرسیّد اُسی راہ پر چلے اور اب ہمیں بھی یہی ایک گلی دور تک جاتی نظر آتی ہے۔

LIBRARY
IDARE-ADBIYAT-E-URDU
ACC. No ....
Date ....

غالب کا نظریۂ وجود

مذہب کے بارے میں مرزا غالب کا رویّہ تشکیک اور بے یقینی سے زیادہ قلندری و آزادگی کا ہے۔ وہ خدا کے قائل ہیں، رسالت کے معترف ہیں، امامت کے معتقد ہیں، مگر اعمال و عبادات سے انھیں کوئی رغبت نہیں، گو اُن کی افادیت اور ثواب کے منکر نہیں ہیں:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

انھیں جنّت اور دوزخ کے وجود کا بھی یقین ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کے نظریۂ آخرت کو بھی مانتے ہیں۔ اپنی اس بے عملی کے باوجود اُن کی شوخیِ طبع آخرت میں کسی سزا سے پہلے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد طلب کرتی ہے:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب یہ اگر کردہ گناہوں کی سزا ہے

انھیں یہ بھی گمان ہے کہ وہ جنّت میں جائیں گے، اور اُسے کوچۂ محبوب کے مقابلے میں ویران دیکھ کر وہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کریں گے تو رضواں سے خوب جھگڑا ہوگا:

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا

اس دُنیا کے پری زاد جنھوں نے یہاں غالبؔ کو منہ نہیں لگایا، اگر جنّت میں حور بن کر اُنھیں مل گئے تو اُن سے خوب انتقام لینے کا بھی تہیّا کیے ہوئے ہیں :

اِن پری زادوں سے لیں گے خُلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

اُن کے ذوقِ جمال میں جو حرکت، حرارت اور تنوّع پسندی ہے اس سے وہ جنت میں بھی اُوب جائیں گے، اس تصوّر سے وہ زندگی ہی میں نڈھال ہوئے جاتے تھے کہ :

"وہی ایک زمرّدیں کاخ، وہی طوبٰی کی ایک شاخ، چشمِ بد دور
وہی اک حور ..... "

یہ سب تو شاعرانہ شوخیاں ہیں، لیکن ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی عقائد کی بنیادی باتوں پر اُن کا ایمان ہے۔ بس ذرا عمل میں آزادگی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد جب دہلی میں مارشل لا نافذ ہوا، تو غالبؔ بھی ایک دن پکڑے گئے اور فوجی کرنیل برن کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ اُس نے پوچھا: "وَیل ٹم مسلمان؟" اِنھوں نے کہا: "حضور آدھا"۔ کرنل نے پوچھا: "آدھا مسلمان کیا ہوتا ہے؟" انھوں نے کہا: "حضور میں شراب پیتا ہوں اور سُور نہیں کھاتا ہوں، اِس لیے آدھا مسلمان ہوں" اور محذوف شوخی یہ کہ سُور کھالوں تو میں بھی آپ ہی جیسا ہوں!

غالبؔ اپنے صوفی ہونے کا دم بھی بھرتے ہیں۔ وہ حضرت شاہ فخر الدین نظامی محبّ النبی دہلویؒ کے پوتے میاں کالے صاحب سے اپنی عقیدت و ارادت کا اظہار بھی کرتے ہیں، کہیں کہیں اپنی شیعیت کا اعلان بھی کیا ہے، مگر ایک دوسرے سیاق میں یہ بھی کہتے ہیں کہ :

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی
شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

وہ فلسفی تو نہیں ہیں مگر فلسفیانہ مضامین سے اُنھیں دلچسپی ہے، اس لیے اُن کا نظریۂ حیات و کائنات

اُردو کے دوسرے کلاسیکی شاعروں کے مقابلے میں زیادہ واضح ہے، اُنھوں نے فلسفہ و تصوّف کے موضوعات کو مخلوط بھی کیا ہے جس سے اشعار میں گہرائی اور فکر انگیزی پیدا ہوئی ہے :

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مگر اُن کے متداول اُردو دیوان میں ایسے اشعار ساٹھ یا ستّر سے زیادہ نہیں ہیں، جن میں مسائلِ تصوّف بیان کیے گئے ہوں۔ البتہ بعض ایسی علامتیں اور محاکاتی حوالے ضرور آگئے ہیں جنھیں مسائلِ تصوّف پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی تصوّف اور عقائد کے مسئلوں میں توحید ایک ایسا موضوع ہے، جس سے غالبؔ کو فلسفیانہ دلچسپی رہی ہے۔ وہ خود کو موحّد کہتے ہیں :

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

توحید کو صوفیہ نے رأسُ الطّاعات کہا ہے اور رسوم اُس کے ظواہر ہیں، جن سے ملّتوں اور فرقوں کی پہچان ہوتی ہے۔ رسوم و ظواہر کی قید اُٹھ جانے کو اصطلاح میں کفر، یا کفرِ عشق بھی کہا جاتا ہے، جو رسموں سے آزاد ہوا ' اُس کے پاس صرف توحید باقی بچے گی، یعنی ہر اضافت ساقط ہوجائے گی تو ایک بے اضافت حقیقت باقی رہ جائے گی "التّوحیدُ اِسقاطُ الاِضافات" اسی کا نام ہے۔ غالبؔ نے اس نہایت گہرے اور دقیق مسئلے کو نہایت سہل اور پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے :

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

توحید اسلام کی بنیاد ہے، لیکن یہ محض وحدتِ عددی نہیں ہے۔ فلاسفہ، متکلمین، صوفیہ اور اصولِ عقائد سے بحث کرنے والے علماء نے اس پر اتنی دیدہ ریزی سے بحث کی ہے کہ یہ فلسفے کا نہایت دقیق موضوع بن گیا ہے۔ اِس میں ذات و صفات، تشبیہ و تنزیہہ، حُدوث و قِدَم جیسے بہت سے متقاطع مسائل بھی شامل ہوگئے ہیں۔ فلسفہ جب ان اُلجھے ہوئے سوالوں کو حل کرنے سے عاجز ہوا ہے تو ہمارے صوفیہ نے کشفی اور وجدانی طور پر اُسے حل کرنے کا راستہ پایا ہے۔ شیخِ اکبر حضرت محی الدین ابنِ عربیؒ، امام غزالیؒ اور حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الفِ ثانیؒ

کے بہت سے مباحث کی بنیاد کشف و وجدان ہی پر ہے۔ ہمارے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہیں، یا تو ہم کشف و وجدان کو جھٹلائیں یا اُن کی تصدیق کریں۔ پہلی صورت میں ہم صرف فلسفے سے استشہاد کر سکتے ہیں جس سے عقیدے کو کچھ زیادہ سروکار نہیں، دوسری صورت یعنی تصدیق کرنے میں بحث کی گنجائش نہیں رہتی۔ وجدان سے دلیل حاصل کرنا قرآن کریم سے بھی ثابت ہے، حضرت یوسفؑ کے قصے میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا قول موجود ہے: إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ (یوسف: ۹۴) اور خضرؑ و موسیٰؑ کی حکایت میں حضرت خضرؑ کی ساری دلیلیں کشفی اور وجدانی ہیں۔

آدابِ سلوک میں مقامِ توحید کا مکشوف ہو جانا غایتِ کبریٰ سمجھا جاتا ہے۔ ان اسرار کو سمجھنے کے تین ممکنہ وسائل ہیں: بحث و علم کے ذریعے سے، مشاہدہ و عرفان کے وسیلے سے اور کشف و وجدان کے واسطے سے۔ جن حضرات پر توحید مکشوف ہوئی ہے انھیں مرتبۂ حق الیقین کشف ہی سے حاصل ہوا ہے اور پھر وہ عالمِ بے رنگی میں پہنچ گئے ہیں جہاں کلام بھی حرف و صوت کا محتاج نہیں رہتا۔

اے خدا بنما تو جاں را آں مقام
کاندراں بے حرف می روید کلام

غالب کا توحیدی ذوق فلسفہ و تصوف کی کوئی گہری بنیاد نہیں رکھتا، اُن کا تعلق کشف و وجدان یا مشاہدہ و عرفان سے بھی نہیں ہے۔ تصوف کے کچھ روایتی مسائل ہیں جنھیں غالب نے اپنے نظریۂ حیات و کائنات کے دائرے میں دیکھا اور پرکھا ہے۔ اُنھیں مسائل کو شاعرانہ لطافت اور حکیمانہ ذہانت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اُن کے فکر میں ویدانت کا پرتو بھی ہے اور یہ بالواسطہ آیا ہے۔ اُپنشد کہتے ہیں: واجب الوجود ایک حقیقتِ مطلقہ و حقیقتِ مجردہ ہے جس کا کوئی شریک نہیں، اُس کے سوا دوسرا کوئی موجود نہیں، باقی سارے وجود "مایا" ہیں، یعنی محض اعتباری ہیں۔ بقولِ میر:

یہ توہم کا کارخانہ ہے   یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

"ایکم برہم دویتو ناستے"۔ غالب اپنے خطوں میں بار بار لَا مَوْجُودَ إِلَّا اللّٰه، لَا مُؤَثِّرَ فِي الْوُجُوْدِ

اِلاَّ اللہ کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

مسئلہ دراصل یہ ہے کہ فنا و بقا کیا ہے؟ خالق و مخلوق کا رشتہ کیسا ہے؟ صوفیہ ایک حدیثِ قدسی اکثر بیان کرتے ہیں جسے گروہِ محدّثین ضعیف کہتا ہے:

کُنتُ کنزاً مخفیاً فاَحببتُ اَن اُعرَف فخلقتُ الخَلقَ

(میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے خلق کو پیدا کیا)

یہاں جو فلسفیانہ اشکال پیدا ہوتا ہے اُسے غالب نے بڑی خوبی سے بیان کردیا ہے:

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں؟

جب "وجود" یا "شہود" ایک ہی ہے تو جو شاہد ہے وہی مشہود ہے۔ آخر مشاہدہ کون کس کا کر رہا ہے؟ خزانۂ غیبی کی پہچانے جانے کی خواہش تو وجودِ غیر کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسی نے یہ سوال پیدا کیا کہ واجب الوجود ایک ہی ہے تو وہ ازلی اور ابدی بھی ہے، اُس کی صفات کیا اُس کی ذات سے الگ ہیں؟ اگر یہ مان لیں تو "ذاتِ بحت" سے حادث کا پیدا ہونا لازم آتا ہے۔ اُپنشد کہتے ہیں کہ صفاتِ خداوندی بالفعل ظاہر ہیں۔ شیخ اکبر انھیں "تصوراتِ علمیہ" اور "اعیانِ ثابتہ" کا نام دیتے ہیں۔ ویدانت میں اِسی کو "مایا" کہا گیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ (ف ۱۰۳۴ھ) کا فرمانا ہے: "وجود ایک نہیں ہے دیکھنے میں ایک معلوم ہوتا ہے"۔ اسی کو "وحدتِ شہود" کہتے ہیں۔ خدا نے کائنات کو مرتبۂ وہم میں خلق کیا ہے ہم اُسے "موجود" سمجھتے ہیں مگر وہ درحقیقت "موہوم" ہے:

اسرارِ خدا را نہ تو دانی و نہ من
ایں حرفِ معمّا نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوے من و تو
چوں پردہ بیافتد نہ تو مانی و نہ من

(خدا کے بھیدوں کو نہ تو جانتا ہے نہ میں جانتا ہوں، یہ پہیلی نہ تو بوجھ سکتا ہے نہ میں، ساری گفتگو پردے کے پیچھے سے ہو رہی ہے، یہ پردہ اُٹھ جائے تو نہ تُو رہے نہ میں۔)

یہ وہم ہستی اسی لیے ہے کہ اس کی نمود تو ہے، وجود نہیں۔ غالب کہتا ہے :

ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے

اور

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

یہ وہی مرتبۂ وہم میں خلق ہونے کا مسئلہ ہے کہ محبوب کی کمر ہے بھی اور نہیں بھی۔ ہمیں منظور نہیں یعنی ہم نہیں مانتے یا ہمیں نظر نہیں آتی۔

شیخ اکبرؒ نے ایک اور لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ عربی میں آدمی کو "انسان" کہتے ہیں اور انسان آنکھ کی پتلی کو بھی کہا جاتا ہے

یصرعن ذا اللبّ حتیٰ لا حراکَ لہ
وھنّ اضعفُ خلقِ اللّٰہِ انسانا

(وہ بڑے ہوشمندوں کو ایسے پچھاڑ دیتی ہیں کہ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتا، حالانکہ اللہ کی مخلوق میں سب سے کمزور آنکھ کی پتلیاں ہوتی ہیں۔)

ہندی کوی رس کھان نے کیا خوب کہا ہے :

اَمی، ہَلاہل، رَس بھرے، شُویت، شیام، رَتنار
جیئت، مَرت، جُھک جُھک پَرت، جیہ چتوت اِک بار

(چشمانِ محبوب میں امرت بھی ہے زہر بھی ہے، شہد بھی، وہ سفید بھی ہیں، سیاہ بھی، سرخ بھی۔ جس پر پڑ جائیں وہ جیتا بھی ہے، مرتا بھی ہے اور نشے میں لڑکھڑانے بھی لگتا ہے۔)

عجیب اتفاق ہے کہ فارسی میں "مردم" کا بھی یہی حال ہے کہ دونوں معنی رکھتا ہے۔ انسان کے معنوں میں سعدی کا یہ شعر ہے

مردم از دستِ غیر می نالند
سعدی از دستِ خویشتن فریاد

اور آنکھ کی پتلی کے مفہوم میں مثلاً یہ رباعی :

زاں روز کہ بندۂ تو خوانند مرا
بر مردمکِ دیدہ نشانند مرا
لطف عامت عنایتے فرمودست
ورنہ چہ کسم خلق چہ دانند مرا

عجیب تر یہ ہے کہ اردو اور ہندی میں بھی پتلی اور پُتلا یہی دونوں مفہوم رکھتے ہیں۔

شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ خدا حسنِ مطلق اور تجلّی ازلی تھا لیکن اپنے آپ کو دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا۔ اُس نے "انسان" (یعنی اپنی آنکھیں، اپنے ناظر) کو پیدا کیا، جو گویا ذاتِ مطلق کی آنکھ کی پتلی ہے، اور وہ خود اپنا مشاہدہ کر رہا ہے۔ غالبؔ نے یوں کہا ہے:

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

آئینہ وجودِ ازلی ہے اور یہ کائنات اُس آئینے کا زنگار ہے، جوہرِ آئینہ پلکوں کی شکل میں ڈھل گیا ہے جو "تقاضائے دیدار" کا اثر ہے۔

خلق اور خالق کے رشتے کو صوفیہ اور فلاسفہ نے متعدّد تشبیہوں سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے نوفلاطونی فلسفے میں اِسے اِشراق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن میں بھی اللہ کو نورُ السّمٰواتِ وَالارض کہا گیا ہے۔ صوفیہ جب ذاتِ بحت کی تجلّی کا مشاہدہ کرنے کی منزل تک پہنچتے ہیں تو وہاں تاریکی ہی تاریکی بتاتے ہیں۔ جدید سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ جب نور کا وفور اپنی ایک خاص غایت کو پہنچتا ہے تو وہ سیاہی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

کسی نے وجودِ کائنات کو برف سے تشبیہ دی ہے، جس کا وجود پانی کے سوا کچھ اور نہیں، پھر بھی پانی سے الگ اپنی نمود رکھتا ہے، اور تحلیل ہو کر پھر پانی بن جاتا ہے۔ اسی طرح کائنات میں وجودِ غیر محض اعتباری ہے۔ اِسے اصل اور ظلّ کا رشتہ بھی بتایا گیا ہے، سائے کا اپنا مستقل وجود نہیں، وہ اصل سے الگ بھی نہیں اور خود اصل بھی نہیں، وہ فنا بھی ہو جاتا ہے، اصل اور ظلّ پر دوئی کا شبہ بھی ہوتا ہے، مگر یہ "دوئی" محض وہمی و اعتباری ہے۔

بعض شعراء نے ہستیِ ممکن کو ہستیِ واجب الوجود کا خواب کہہ دیا ہے:

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

یعنی ایک نظریہ تو یہ کہ ہم عالمِ خواب میں ہیں اور سارے کارخانۂ عالم کو اُس کی ہماہمی کے ساتھ چلتا ہوا دیکھ رہے ہیں، موت ہماری بیداری ہوگی اور یہ خواب ٹوٹ کر معدوم ہو جائے گا۔ حضرت علیؓ سے یہ قول منسوب ہے کہ "النَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوا اِنْتَبَهُوا" (لوگ سو رہے ہیں، جب مریں گے تو گویا بیدار ہو جائیں گے)۔

دوسرا نظریہ یہ کہ ہستیِ واجب الوجود خواب دیکھ رہی ہے، یا حقیقتِ مطلقہ عالمِ خواب میں ہے، ہم سب اُس خواب کے کردار ہیں، جب وہ ہستی بیدار ہوگی تو ہم ناپید ہوں گے۔ مگر یہ فلسفیانہ تاویل ہے۔ تصوّف اسلامی سے اس کا کچھ واسطہ نہیں، واجب الوجود کے لیے قرآن تو واضح لفظوں میں کہتا ہے: لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (البقرہ: ۲۵۵) اُسے نہ اُونگھ آتی ہے نہ وہ سوتا ہے، وہ علیم و خبیر ہے وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا (الانعام ۵۹)۔

زندگی اور اُس میں مظاہر کی کثرت اور گوناگوں کیفیّت کو سمندر سے بھی تشبیہ دی گئی ہے:

ہے مشتمل نمودِ صوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

سمندر ایک وسیع اور گہری حقیقت ہے، اُس میں لہریں بھی اُٹھ رہی ہیں، حباب بھی پیدا ہو رہے ہیں، قطرہ بھی اُسی سمندر سے نکلتا ہے اور پھر اپنی نمود کھو کر سمندر کا حصّہ بن جاتا ہے، لیکن ان سب اشکال و صُوَر کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ علامت غالب کا پسندیدہ موضوع ہے:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

دوسری جگہ یوں کہتے ہیں:

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا

اور
شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

اور
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غالبؔ نے شبنم و خورشید کی علامتوں میں بھی فنا اور بقا کے اس رشتے کو بیان کیا ہے :

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

شبنم کا وجود بھی حادث اور وہمی ہے۔ اس کا اشتیاق بھی ایک بڑی ہستی میں ضم ہونے کے لیے ہے۔ جب تک وہ مہرِ حقیقت طلوع نہیں ہوتا شبنم "موجود" ہے، لیکن خورشید کی نظرِ عنایت اُسے مقصدِ اعلیٰ سے ہمکنار کر دیتی ہے۔

کائنات کی کثرت اور ذاتِ مطلق کی احدیت کو ذرہ و خورشید کی تمثیل میں بھی بیان کیا جاتا ہے۔ سورج کی روشنی کہیں سے چھن کر آتی ہے تو چھوٹے چھوٹے ذرّے وجد و کیف کے سے عالم میں رقص کرتے ہوئے اور کرنوں کے سہارے خورشید کی طرف صعود کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لبعض صوفیہ نے کائنات کی قوتِ محرکہ "عشق" کو قرار دیا ہے۔ زمین کی گردش، لیل و نہار کا انقلاب، ستاروں کا طلوع و اُفول، یہ سب عشق ہی کے مظاہر ہیں۔ اس کیفیت کو ذرہ و خورشید کی علامتوں سے بہت سے شاعروں نے بیان کیا ہے، مگر غالبؔ نے اس میں فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ شاعرانہ نفاست بھی پیدا کر دی ہے :

ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
ہے تجلّی تری سامانِ وجود

جہاں روشنی ہوگی وہیں ذرّے نظر آئیں گے، یہ نہ ہو تو وہ بھی نہ ہوں گے۔

ہوئے اُس مہر وش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پَر افشاں جوہر آئینے میں، مثلِ ذرہ روزن میں

اور

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

ایک اور استعارہ رشتہ و گرہ کا ہے۔ کسی ڈورے میں گرہ ڈال دیجیے تو اُس کی اپنی نمود ہو گی مگر وجود کچھ نہیں ہے، گرہ کھول دیں تو وہ دھاگا ہی باقی بچے گا۔

صُوَرِ علمیہ کا شیخ اکبرکا نظریہ یہ ہے کہ لکڑی سے ہزاروں چیزیں بنتی ہیں، میز، کرسی، کواڑ، الماری وغیرہ۔ ان سب کے وجود کی اصل لکڑی ہے۔ مگر یہ نمود ہے وجود نہیں۔ اگر کوئی چاہے کہ کرسی کی شکل کو لکڑی سے جدا کر کے دیکھ سکے تو وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

وجود کی ایک اور تشبیہ لوہے اور آگ سے بھی دی گئی ہے۔ لوہا آگ میں رہ کر خود بھی سُرخ ہو جاتا ہے، اُس میں آگ کی صفات بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ اپنی اصلی حالت میں واپس بھی آ جاتا ہے اور وہ کیفیات زائل بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ تشبیہ وحدت الشہود کے نظریے کی ترجمان ہے۔

غالب کا پسندیدہ استعارہ عکس اور آئینے کا ہے۔ یہ بھی شہود کی وحدت یا ظلیت کو بتاتا ہے۔ غالب کا رجحان وحدت الوجود کی طرف ہے مگر اس میں اُن کا ذہن بہت زیادہ واضح نہیں ہے، نہ وہ اس فلسفے کی باریکیوں میں جاتے ہیں۔ کبھی وہ ویدانتی نظریے کے ترجمان ہیں، کہیں فلسفے سے اخذ کرتے ہیں، کبھی وحدت الشہود کی قائل نظر آتے ہیں، مگر اُنھوں نے ان مضامین کو شاعرانہ آب و رنگ دے کر بہت دل نشیں ضرور بنا دیا ہے۔ حقیقتِ مطلقہ عیاں بھی ہے اور مستور بھی:

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اٹھائے نہ بنے

سارے مظاہرِ کائنات اُسی کی صفات کی تجلیاں ہیں:

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریِ یک جلوۂ حیراں مجھ سے

ہر شے میں اُسی کا جلوہ ہے پھر بھی وہ سب سے جدا سب سے الگ ہے:

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے

پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

پردہ عالم بے رنگی کی سرحد تک پہنچ کر پکار اُٹھتے ہیں:

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب

آخر تو کیا ہے اے "نہیں ہے"

ویدانتی اثر سے وہ دنیا کو "مایا جال" اور لیلا بھی سمجھنے لگتے ہیں:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک

اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور

جز وہم نہیں ہستیِ اشیاء مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے

گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

کہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں کثرتِ جلوہ حجاب ہوگئی ہے اِس لیے کوئی اُسے دیکھ نہیں سکتا:

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز

آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منھ چھپائے کیوں

نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز — تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

رؤیتِ باری کا مسئلہ بھی فلسفہ و کلام کے الجھے ہوئے مباحث میں سے ایک ہے۔ انسان کی آنکھ خدا کو دیکھ سکتی ہے یا نہیں دیکھ سکتی، دونوں کے بارے میں شواہد دیے گئے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے جب خواہشِ دیدار کی تو اُنھیں جواب ملا: لن ترانی (۷: ۱۴۳) تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے۔ پھر قرآن شریف میں ہے: لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ (۶: ۱۰۳)۔

اُس نورِ مطلق کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں مگر وہ آنکھوں کو دیکھ سکتا ہے۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ رؤیت کے لیے مکان، جہت اور لون کی شرائط لازمی ہیں، یعنی جسے دیکھیں وہ شے کسی جگہ ہوگی کسی سمت میں ہوگی، اُس کا کوئی رنگ یا جسم ہوگا، خدا کے دیدار سے اُس کا محدود ہونا لازم آتا ہے مگر قرآن کریم ہی کا یہ بھی ارشاد ہے کہ وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ (۷۵ : ۲۲) قیامت کے دن خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے خدا کو دیکھتے ہوں گے۔ متکلمین کہتے ہیں کہ آخرت کی رؤیت کو ہم دنیا کی رؤیت پر قیاس نہ کریں خدا ہی جانتا ہے کہ وہاں دیدار کس شکل میں ہوگا۔ نورِ حقیقت کا ذرا سا پرتو ان مجازی مظاہر میں نظر آتا ہے مجرّد کیفیت میں اُسے کہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی — قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

مظاہر کی یہ رنگا رنگی حیرت کے سبب سے ہے کہ اُس تجلّی کا تحمّل دشوار ہے۔

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

لاکھ پردوں میں چھپنے کی کوشش کے باوجود وہ ہر طرف عیاں ہے، اُس کی مستوری میں بھی ایک لُبھانے والی ادا ہے:

منھ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منھ پر کھلا

ان پردوں سے بھی ایسی مسحور کُن پُر اسرار آوازیں سُنی جا سکتی ہیں جو حقیقتِ مطلقہ کا پتا دیتی ہیں:

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

اُسے دیکھنا اس لیے ممکن نہیں کہ اُس کے سوا غیر کا وجود ہے ہی نہیں۔

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ کائنات اور اس میں جو کچھ ہے دائمی تگ و دَو میں لگے ہیں اور حقیقت مستورہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل
غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گُلِ جیبِ قبائے گُل

غالب جانتے ہیں کہ وہ حسنِ ازلی، وہ حقیقتِ مطلقہ وراءُ الورا، ثم وراءُ الورا، ہے، احاطۂ ادراک میں نہیں آسکتا، لیکن یہ سب مظاہرِ کائنات اُسی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ حسنِ کائنات ہی میں حسنِ ازلی کو تلاش کیا جاسکتا ہے، رسوم وظواہر مقصود بالذات نہیں ہیں۔

ہے پَرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہمارے اور حسنِ مطلق کے درمیان ایک حجاب تو خود ہماری ہستی ہی ہے۔ بہ قولِ میر:

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

دوسرا حجاب "وہمِ غیر" ہے یہ عرفانِ نفس میں مانع ہوتا ہے اور مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ وتاب میں

اُس کے اسرار بھی عجیب ہیں۔ الآنَ کما کانَ اور کُلَّ یومٍ ھُوَ فی شانٍ دونوں باتیں بیک وقت صادق آتی ہیں حالانکہ اِن میں منطقی تضاد موجود ہے۔ کائنات میں جو تغیر ہے، زوال اور فنا کے جو مناظر ہم دیکھ رہے ہیں، غالب اُن کی ایک اور توجیہ کرتا ہے۔ جیسے حسنِ مطلق اپنی آرائش میں مصروف ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ تمنائے دیدار سے سرشار ہے۔ جب

وہ اپنی نقاب اُلٹے گا تو اُس کی ذات کے سوا یہاں کچھ بھی نہ ہوگا:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

وہ ذات واجب الوجود جو ستّر ہزار پردوں میں چھپ کر بھی ہر شے میں آشکار ہے، ہر شے کا مطلوب و مقصود بھی ہے، اُسے پالینا اِسی لیے دشوار ہے کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے: نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (۵۰ : ۱۶) غالب نے اس نکتے کو سہلِ ممتنع میں بیان کیا ہے:

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

پھر وہ ایک دل چسپ مضمون عاشقانہ رنگ میں سنوارتا ہے، آخر یہ معما ہے کیا؟ بہ قولِ شاعر:

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عینِ اوست
امّا نمی تواں کہ اشارت بدو کنند

بے حجاب اتنا کہ جلوہ اُس کا ہر ذرّے میں ہے
اور حجاب اتنا کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

جب وہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور ہمارا نفس بھی اُسی کا جلوہ گاہ ہے فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱ : ۲۱) روح بھی اُسی کی صدا پر وجد کر رہی ہے تو درمیان میں یہ پردہ آخر کیوں ہے؟

یہ کہہ سکتے ہو: "ہم دل میں نہیں"، پر یہ تو بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟

جواب ملا کہ تمھارے جذبے میں اخلاص کی کمی ہے، سچے دل سے لگن کے ساتھ ہمیں ڈھونڈو گے تو پاجاؤ گے۔ غالبؔ جیسا شوخ طبع شاعر اِن طفل تسلیوں سے بہلنے والا کہاں! کہتا ہے:

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

وحدت الوجود کا فلسفہ تمام تر ذوقی اور کشفی مسئلہ ہے، عام آدمی تو اِسے کبھی بھی نہیں سمجھ سکتا، خواص میں علمائے ظاہر منطقی تضاد اور تناقص کے خارزار میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ علمائے باطن یعنی صوفیہ پر یہ بہ قدرِ ظرف مکشوف ہوتا ہے۔ اگر گوشۂ نقاب ذرا سا زیادہ سرک جائے تو وہ عالم ہوتا ہے جسے عبدالرحیم خان خاناں نے یوں کہا ہے:

رحیمن بات آگم کی کہن سُنن کی ناہیں
جانت ہیں سو کہت نہیں کہت جو جانت ناہیں

ساری پہنائیوں کے ہوتے ہمارا خیال بہرحال محدود ہے اُس میں وہ جو لامحدود ہے کیسے سما سکتا ہے؟ جب ہم قیدِ وجود سے آزاد ہوں گے تو خیال کا تنگ دائرہ بھی ٹوٹ جائے گا اور اُس کا ادراک کسی قدر آسان ہو گا۔ اس نہایت لطیف اور دقیق مضمون کو مولانا روم نے ایسی خوبی سے بیان کر دیا ہے کہ الفاظ معدوم اور معانی مجسم ہو گئے ہیں:

من ز تن عریاں شدم اُو از خیال
می خرامم در نہایات الوصال

غالب بھی عجزِ ادراک کے معترف ہیں:

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

لیکن طالب کی نظر اپنے مطلوب پر رہنی چاہیے۔ پریشاں نظری سے پراگندہ دلی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہاں کثرت میں وحدت ہے، کیفیات میں تضاد اور تخالف ہے، تجلیِ اسماء کی ہر آن نرالی شان ہے اِس میں سررشتۂ مقصود کا ہاتھ آجانا ہی کمال ہے، وہی دلیلِ وحدت بن جاتا ہے۔

ہے رنگِ لالہ و گُل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی
رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

غالبؔ کے کلام میں حیرت، استعجاب، تشکیک اور استفہام کا مصدر و منبع دراصل یہی مسئلۂ وجود ہے اور اسی عینک سے وہ اپنے گرد و پیش کی کائنات کو دیکھتے ہیں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

یہ سوالات سیدھے سادے ہیں، مگر ان کے جوابات بہت الجھے ہوئے ملتے ہیں۔ غالبؔ مایوس نہیں ہوتے، نہ طلب سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اُسے کوئی نہ پا سکا:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں!

لیکن طلب کی لذت ہی مقصود ہے اُس میں اپنے آپ سے گزر جانا اِس سے اچھا ہے کہ تھک کر بیٹھ جائیں:

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اِسی کشاکش طلب و نایافت سے یہ کارخانۂ ہستی رونق پذیر ہے۔ فنا کی جبلّت ہی نے بقا کی صلاحیت پیدا کی ہے:

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

یہی طلب ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے اور یہی ہمارا سامانِ مرگ بھی ہے :

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں اُنھوں نے مسئلہ وجود کو غیر معمولی حسنِ بیان سے منظوم کیا ہے :

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں	ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق	بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم	لغو ہے آئینہ فرقِ جنون و تمکیں
نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت	سخنِ حق، ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم	دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں
مثلِ مضمونِ وفا، باد بہ دستِ تسلیم	صورتِ نقشِ قدم، خاک نہ فرقِ تمکیں
عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس	وصل، زنگارِ رخِ آئینہ حسنِ یقیں
کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب	بیستوں، آئینہ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

آخر یہ توحید اُنھیں مرتبۂ تسلیم تک پہنچا دیتی ہے

اسد سودائے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر
کہ کشتِ خشک اُس کا، ابرِ بے پروا خرام اُس کا
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

اور

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

اسی پر اُن کے نظریۂ حیات و کائنات کی اساس ہے۔ وحدت میں کثرت آرائی اُن کی آنکھیں کھولتی ہے اور اُنھیں وہ نگاہ عطا کرتی ہے جو کُل کا جلوہ جُزو میں دیکھ سکے۔

اسدؔ بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلادوں کہ اک عالم گلستاں ہے

یہی وہ موضوع ہے جو اُن کی فلسفیانہ فکر کو مہمیز کرتا ہے، لطیف ترین شاعرانہ احساسات کو بیدار کرتا ہے، ذوق تماشا کو اُبھارتا ہے، تمنائے چیدن پیدا کرتا ہے، یہی اُن کے حکیمانہ افکار کا منبع ہے۔ اسی میں وہ کرب پوشیدہ ہے جس کی زیریں لہریں ہمیں اُن کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ اسی نے اُنھیں فکر کا وہ گداز بخشا ہے کہ: آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

اور

ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزاں ہے
کہ شیشہ نازک و صہبا ہے آبگینہ گداز

انھیں مضامین کے سہارے وہ آکاش سے پاتال تک سیر کرتے ہیں۔ یہی اردو کے تمام شاعروں کے مقابلے میں اُن کے علیٰ کُلِّ غالب ہونے کا راز اور اُن کے گنجِ معانی کا طلسم ہے۔

افکارِ غالب کا ایک شارح

انڈین کونسل فار فلاسوفیکل ریسرچ اور شعبۂ فلسفہ راجستھان یونیورسٹی جے پور کے اشتراک سے گذشتہ سال ایک سمینار جے پور میں ہوا تھا جس میں راقم الحروف نے بھی شرکت کی تھی اُس کا موضوع یہ تھا کہ "مُتون کے لیے شرحوں کی ضرورت ہے یا نہیں، اور کیا یہ شرحیں واقعیت کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہیں یا وہ شارح کے عواطف اور میلانات کی ترجمان ہوتی ہیں۔" خالص فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اگر تجزیہ کیا جائے تو شرحیں عموماً گمراہ کُن ہوتی ہیں اور یہ ان شرحوں کا ہی نتیجہ ہے کہ ایک ہی مذہب میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے ہیں۔ سب اپنی دلیلیں مذہبی نصوص کی شرحوں سے ہی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بات ملحوظ رکھنی ہو گی کہ شرح و تفسیر ترجمے سے الگ چیز ہے ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ہوتا ہے۔ مگر شرح و تفسیر خود متن کی زبان میں بھی ہو سکتی ہے اور اس کے دواعی کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔

(۱) شرح کبھی اس لیے کی جاتی ہے کہ عبارت میں ایجاز تھا، اُسے وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ یا اُس کے ساتھ کوئی تلمیح وابستہ ہے، یا اُس متن سے اصول و قوانین کا استخراج منظور ہے۔

(۲) کبھی نصوص کی عبارت میں اغلاق اور پیچیدگی ہوتی ہے، اشعار میں تعقید ایسی واقع ہو جاتی ہے کہ وہ شرح کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا جس کی مثال عرفی کا یہ شعر ہے:

من کہ باشم عقلِ کُل رانا دک اندازِ ادب
مرغِ اوصاف تو از اُوجِ بیاں انداختہ

(۳) کبھی اشعار و عبارت میں ایسے صنائع لفظی و معنوی استعمال ہوتے ہیں جن کی طرف پہلی نظر میں دھیان نہیں جاتا اور اُن کو سمجھے بغیر نصوص کی خوبی اور گہرائی کو پانا دشوار ہوتا ہے۔

(۴) شرحوں کا رواج زیادہ تر درسی ضرورتوں سے ہوا، لیکن مذہبی عقائد کے اختلافات نے بھی بہت سی شرحوں کو پیدا کیا ہے۔ پہلے زمانے کے مصنّف کتاب اس طرح لکھتے تھے کہ کوزے میں دریا بند ہو جائے، کیونکہ اُنھیں ایک طویل موضوع کو سمیٹ کر درسی مقاصد کے لیے ایک ہی کتاب میں سمونا ہوتا تھا اور وہ جانتے تھے کہ اس کی شرحیں لکھنے والے بستار کر لیں گے۔

(۵) رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ اجتہادی رُوح تو ختم ہو گئی اور شرحوں پر دارومدار رہ گیا، پھر ان شرحوں کی شرحیں در شرحیں اور اُن پر حواشی در حواشی لکھے جانے لگے۔ ہندوستان میں عربی زبان کے مختلف علوم و فنون میں پچھلے ہزار برسوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ جن کا حال ڈاکٹر زُبید احمد کی تاریخ "عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ" یا مولانا عبدالحی رائے بریلوی کی تصنیف "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" جیسی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے اور ایک ہی نظر میں یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے کہ ۹۵ فی صدی کام شرح و حواشی کی شکل میں ہوا ہے۔

(۶) شرح کی ضرورت ہے یا نہیں، اس کی حمایت اور مخالفت میں یکساں طور پر قوی دلیلیں دی جا سکتی ہیں۔ شرح کی ضرورت اس لیے ہے کہ ہر قاری کی سطحِ ادراک مصنّف کے برابر نہیں ہو سکتی اور اُسے وضاحت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہر شخص کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے طور پر کسی متن کو پڑھ کر مقصودِ مصنّف کو پالے۔

لیکن جس قاری میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ کسی متن کو اپنے طور پر آزادانہ مطالعہ کر کے سمجھ سکے اُس کے لیے شرحیں گمراہ کُن بھی ہو جاتی ہیں۔ مذہبی نصوص میں تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ شارح اپنے عقائد سے دامن چھڑا کر تشریح کر سکے۔

(۷) پچھلی صدیوں میں مذہبی کتابیں زیادہ تر عربی میں لکھی گئیں، تو غیر عربی داں لوگوں کے لیے اُن کی شرحیں لکھنا ضروری ہوا۔ فارسی عام تصنیف و تالیف کی اور سرکاری کاروبار کی زبان تھی۔ اس لیے مدارس میں فارسی کی نصابی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اُن میں بعض کتابوں

کے متون دقیق بھی تھے۔ خاقانی، انوری، عرفی جیسے شعرا کے کلام کی شرحیں مدارس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے لکھی گئیں۔

(۸) شیخ سعدی کی گلستاں، بوستاں سیکڑوں برس تک نصاب میں شامل رہی ہیں۔ یہ بہت دقیق اور مشکل کتابیں نہیں ہیں۔ مگر اُن کی بھی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ اور بعض ایسے نکتے سامنے آتے ہیں کہ واقعی اُن کی طرف ہر شخص کا دھیان نہیں جا سکتا۔ مثلاً گلستاں میں ایک موقع پر یہ شعر آتا ہے:

قرصِ خورشید در سیاہی شد یونس اندر دہانِ ماہی شد

الفاظ کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ سورج غروب ہو گیا اور رات چھا گئی سورج کو یونس پیغمبر علیہ السلام سے تشبیہ دی اور رات کو دہانِ ماہی سے۔ قصص انبیا میں یہ روایت آتی ہے کہ حضرت یونسؑ کو ایک مچھلی نے نگل لیا تھا اور وہ کئی دن تک شکم ماہی میں رہنے کے بعد خدا کے فضل سے صحیح سالم نکل آئے تھے۔ لیکن ایک شارح کہتا ہے کہ یونس ایک ستارے کا بھی نام ہے جس کے بارے میں جیوتشیوں کا کہنا ہے کہ جب وہ برجِ حُوت میں جاتا ہے تو وہ وقت چوروں کے لیے بہت منحوس ہوتا ہے، اور یہ شعر ایسے ہی سیاق میں پیش کیا گیا ہے جس میں کچھ چوروں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔

اس مثال سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ایسی باتیں شارح کی مدد کے بغیر قاری کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

(۹) مرزا غالب نے اپنے اردو کلام میں ایک ایسا اسلوب استعمال کیا جسے مشکل تو نہیں کہہ سکتے مگر وہ اردو شاعری کے روایتی اسلوب سے ہٹا ہوا تھا۔ اس اُسلوب کی طرف انھیں بیدل کی تقلید لے گئی۔ اُنھوں نے تشبیہ و استعارے میں کچھ ایسے کمالات دکھائے اور ایسی مضمون آفرینی کے نمونے پیش کیے کہ اُس کی شرح کا احساس خود غالب کے زمانے میں ہونے لگا تھا۔ اپنے خطوط میں غالب نے خود اپنے ہی بعض اشعار کی وضاحت لکھی ہے۔ پھر مولانا الطاف حسین حالی نے اشعارِ غالب کے لفظی و معنوی محاسن ظاہر کرنے کے لیے بعض اشعار کی تشریح یادگارِ غالب میں پیش کی۔ مثلاً یہ شعر:

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

حالیؔ کی تشریح سے ہی یہ اندازہ ہوا کہ شعر میں لفظِ مکرّر بڑا پہلودار واقع ہوا ہے۔

(۱۰) عہدِ غالبؔ سے اب تک کلامِ غالبؔ کی شرح وتفسیر کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ شرحیں چند خانوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ کچھ ضمنی ہیں، بعض مستقل ہیں۔ کسی نے صرف منتخب اشعار کی شرح لکھی ہے (جیسے نیاز فتحپوری کی مشکلاتِ غالبؔ) اور کسی شارح نے دوسروں کی شرحوں کو سامنے رکھ کر اختلافاتِ شارحین کا بیان بھی کیا ہے (جیسے آغا محمد باقر کی بیان غالب)۔ ان شرحوں کا احاطہ عبدالقادر سروری مرحوم اور پروفیسر گیان چند جین نے اپنے مضامین میں کیا ہے۔ اور جہاں تک یاد آتا ہے اُنھوں نے ۳۶ یا ۳۷ شرحوں کا جائزہ لیا ہے۔ مگر یہ تعداد اس سے زیادہ ہے اور اس میں برابر اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ خود گیان چند جین کی شرح متروک کلام غالب کی ہے اور شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے انداز سے کلامِ غالبؔ کی تفہیم کی ہے۔

(۱۱) ان شرحوں میں بڑی بوالعجبیاں بھی ملتی ہیں اور بعض شرحیں مضحکہ خیز ہوگئی ہیں۔ کسی شارح نے جب خود کو مقصودِ غالبؔ کے پانے میں ناکام دیکھا تو شعر کو ہی ناقص یا مہمل قرار دے دیا ہے۔ یا اپنی جانب سے حکم لگا دیا ہے کہ یہاں فلاں لفظ کی ضرورت تھی۔ مثلاً :

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنّا مت پوچھ
عیدِ نظّارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

طباطبائی کہتے ہیں کہ اس شعر میں "لفظ ہلال تنگیِ وزن سے نہ آسکا اور شعر کا مطلب ناتمام رہا۔ مطلب یہ ہے کہ عشّاق کو شمشیرِ عریاں دیکھ کر ایسی مسرّت حاصل ہوئی کہ ہلالِ عید کا نظّارہ دکھائی دیا۔"

یہاں شارح کا ذہن لفظِ عید سے ہلال کی طرف منتقل ہوا اور اس کو تقویت اس سے ملی کہ شمشیر اپنی صورت میں ہلال سے مشابہت بھی ہے۔

لیکن نظّارہ فارسی میں ناظرہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی دیکھنے کی قوت وصلاحیت جیسے سامعہ، باصرہ وغیرہ۔ فارسی کا مشہور مصرع ہے :

نظّارہ ز جنبیدنِ مژگان گلہ دارد

مفہوم یہ ہے کہ دیکھنے کے وقت پلک کا جھپکنا بھی قوتِ ناظرہ کو گراں گزرتا ہے، اب غالبؔ کے

مصرع کا مفہوم صاف ہے کہ شمشیرِ عریاں ہوئی تو گویا آنکھوں کی عید ہو گئی۔ قتل گہ (قتل گاہ کا مخفف) میں گاہ زمان کے لیے ہے، مکان کے لیے نہیں، یعنی اہلِ تمنا کی قتل ہونے کے وقت خوشی کیا تھی مت پوچھ"۔ یہاں ہلال کی ضرورت ہی کیا ہے؟

غالباً حضرت شمس الدین یحییٰ کا قول ہے کہ متن میں اصل اہمیت الفاظ کی ہوتی ہے اور لفظ سے ہٹ کر سوچنا گمراہی کا سبب بنتا ہے۔ شاعر یا مصنف نے اپنی بات جتنے لفظوں میں کہی ہے انھیں کے دائرے میں محصور رہ کر اُس کی مراد کو پانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۱۲) میں نے ابھی یہ عرض کیا ہے کہ اکثر شارحین اپنی طرف سے حکم لگا دیتے ہیں اور شعر کو کھینچ تان کر اپنے معہودِ ذہنی کی طرف لے آتے ہیں، غالب کے افکار کی شرح کا حق ابھی تک کوئی ادا نہیں کر سکا۔ البتہ ایک شارح ایسا ہے جس نے مدرسہ کے انداز میں تو شرح نہیں لکھی مگر غالب کے اردو اور فارسی کے منتخب اشعار کی تشریح ایسے دلچسپ انداز اور پُر مغز عالمانہ اُسلوب میں کی ہے کہ ہم غالب کی ذہنی فضا میں پہنچ جاتے ہیں اور اس جزوی شرح کی مدد سے غالب کے نظریۂ حیات و کائنات کو اُس کے فلسفۂ زندگی کو اور طرزِ فکر کو سمجھ سکتے ہیں، میری مراد ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور اُن کی کتاب "افکارِ غالب" سے ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ غالب کے افکار کی شرح مرحوم خلیفہ عبدالحکیم سے بہتر کسی دوسرے مصنف نے نہیں کی۔

(۱۳) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا مضمون فلسفہ تھا۔ مغرب و مشرق کے فلسفیانہ افکار پر اُن کی گہری نظر تھی اور وہ اُن فلسفیوں میں نہیں تھے جن کا ذہن گنجلک ہوتا ہے کہ بقول اکبر:

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں　　　ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

اُنھوں نے اسلامیات کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ فارسی ادبیات سے بھی عالمانہ شناسائی تھی۔ زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت کے ساتھ اُن کے اسلوب میں ایسی متانت، شگفتگی اور وضاحت ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نسلاً کشمیری تھے۔ اُن کی ولادت جولائی ۱۸۹۳ء میں لاہور میں ہوئی۔ جہاں اُنھوں نے دسویں جماعت تک پڑھا۔ ایف اے کے لیے وہ علی گڑھ آ گئے اور پھر سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی سے بی اے کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کیا

اور قانون میں بھی ایل ایل بی کی سند حاصل کی۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو انھیں ۱۹۱۹ء میں فلسفہ کے لیکچرار کی جگہ مل گئی۔ ۱۹۲۱ء میں ریاست کی طرف سے اعلیٰ تعلیم کا وظیفہ ملا تو وہ چار سال کے لیے جرمنی چلے گئے، وہاں سے ڈاکٹریٹ کر کے ۱۹۲۵ء میں واپس آئے اور فلسفہ کے پروفیسر و صدر شعبہ ہو گئے۔

حیدر آباد میں اُن کا قیام ۳۰ سال تک رہا۔ ۱۹۴۳ء میں وہ طویل رخصت لے کر مہاراجہ کالج سری نگر کے پرنسپل اور پھر ڈائرکٹر آف ایجوکیشن بھی رہے۔ ۱۹۴۶ء میں پھر حیدر آباد آ گئے۔ ۱۹۴۹ء میں ریٹائرڈ ہوئے تو پاکستان چلے گئے جہاں اُنھوں نے ۱۹۵۰ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ قائم کیا۔

اس ادارے نے اسلامی علوم کے مختلف موضوعات پر اب تک درجنوں کتابیں شائع کی ہیں۔ ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو خلیفہ عبدالحکیم نے انتقال فرمایا۔

اُن کی تصانیف میں ویبر کی ہسٹری آف فلاسفی کا اردو ترجمہ تاریخ فلسفہ ہیرالڈ ہوفڈنگ کی ہسٹری آف ماڈرن فلاسفی کا ترجمہ تاریخ فلسفہ جدید، ایڈورڈ زیلر کی آؤٹ لائن آف گریک فلاسفی کا ترجمہ مختصر تاریخ فلسفہ یونان، ولیم جیمز کی کتاب کا ترجمہ نفسیات وارداتِ روحانی اور بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہیں۔ اور بحیثیت تصانیف میں اُنھوں نے داستانِ دانش، تشبیہاتِ رومی، حکمتِ رومی، افکارِ غالب اور فکرِ اقبال جیسی کتابیں لکھیں۔

خلیفہ صاحب کی انگریزی تصانیف میں اسلامک آئیڈیالوجی، اسلام اینڈ کمیونزم، میٹافزکس آف رومی جیسی کتابیں شامل ہیں۔ اُن کے مضامین بھی مقالاتِ حکیم کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

فلسفیانہ موضوعات میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے بہتر انشا پرداز اردو کو آج تک نہیں مل سکا اور اب اردو کا جو حال ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اُس سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید آیندہ بھی نہ مل سکے گا۔

(۱۴) دراصل غالب کو ایسی شرحوں کی ضرورت نہیں ہے جن میں مشکل لفظوں کے معنی بتا کر شعر کے مفہوم کو نثر میں منتقل کر دیا جائے۔ جس چیز نے غالب کو علیٰ کُلِّ غالب بنایا

ہے وہ اس کی فلسفیانہ فکر ہے۔ وہ اصطلاحی معنوں میں فلسفی نہ سہی، فلسفہ کے موضوعات پر اس کے خیالات مستعار سہی، یہ بھی تسلیم کہ اُس کی فلسفیانہ فکر مربوط نہیں ہے اور اسے ہم کسی مدرسۂ فکر سے نہیں جوڑ سکتے، مگر بہر حال غالب کے کلام میں فلسفیانہ عناصر موجود ہیں، اس کا ذہن متشکک ہے، وہ کثرت سے سوال کرتا ہے، اپنے چاروں طرف اشتیاق اور حیرت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اسرارِ فطرت کے پردے اُٹھانا چاہتا ہے۔ اسے ایسا ہی شارح درکار ہے جو فلسفہ کے سیاق و سباق میں غالب کے ذہن کو پڑھ سکے اور اس کا حق خلیفہ عبدالحکیم نے ادا کیا ہے۔

(۱۵) خلیفہ صاحب کا اندازِ تشریح و تفسیر کیا ہے اس کی وضاحت کے لیے میں یہاں صرف تین اشعار کی شرح نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یہ شعر عام نسخوں میں درج نہیں۔ معلوم نہیں کہ غالب کے اردو دیوان کا انتخاب کرنے والے احباب نے اسے قلمزد کیا یا خود غالب نے۔ نسخۂ حمیدیہ میں غالب کا اردو کلام سارا بے انتخاب جوں کا توں موجود ہے۔ سیکڑوں اشعار اُس میں ایسے ہیں جو تصورات اور اسلوبِ بیان کی پیچیدگی اور معانی کی بے حقیقتی یا دور افتادگی کی وجہ سے خود غالب کے ذوقِ سخن کی پختگی نے کاٹ ڈالے اور بجا طور پر کاٹے کیونکہ اُن میں اکثر مہملات کی حد تک پہنچے ہوئے تھے اور شباب کی بے راہ روی اور جرأت آموزی کا نتیجہ تھے لیکن حیرت کا مقام ہے کہ یہ بلیغ شعر بھی جس میں پروازِ فکر غایت درجے کی حکیمانہ ہے کیوں گردن زدنی قرار دیا گیا۔ معلوم نہیں خود غالب نے خیال کیا کہ اسے کوئی نہ سمجھے گا یا اس کے نقّاد احباب نے اسے مہمل سمجھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اردو اور فارسی کی ساری شاعری میں اس کا ہم قیمت شعر مشکل سے ملے گا۔ خود غالب کی حکیمانہ شاعری میں کوئی دوسرا شعر اس کا ہم پلہ دکھائی نہیں دیتا۔ غالب نے جا بجا شوق یا تمنّا کا لفظ نہایت بلند، وسیع اور گہرے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جس طرح عشق کی اصطلاح مولانا روم اور اقبال کے ہاں ہستی کے دقیق ترین حقائق کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ اس شعر میں تمنّا کا لفظ معمولی خواہش کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے جس کی بدولت کائنات وجود پذیر ہوتی ہے۔ عام فلسفی اور طبیعی اور اکثر اہلِ دین بھی اس محسوس اور مدرک کائنات کو ایک ہمہ گیر وجودِ کلی سمجھتے ہیں۔ ارض و سماوات

اور اس کے مابین جو کچھ ہے اُسی کو کل مخلوقات تصوّر کرتے ہیں۔ ہژدہ ہزار عالم کا تصوّر اگرچہ سارے صوفیہ اور حکما کے ہاں ملتا ہے لیکن محسوسات اور معقولات سے ماوراء عالموں کی بابت بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ ظہور میں آئے۔ خالق کا سارا عملِ تکوین ایک حرف کُن سے وجود پذیر ہو گیا۔ ذات بحت سے عالم صفات اور عالم محسوسات کیوں ظہور میں آیا، اس کی کئی توجیہات ملتی ہیں۔ خدائے خالق اور عالمِ امکاں کا کیا تعلق ہے اس کے متعلق غالبؔ کا نظریہ جو اس شعر میں بیان ہوا ہے یہ ہے کہ خالق کی صنعتِ خلاّقی ایک تمنائے تخلیق و تکوین ہے۔ ذاتِ احد کا ایک سرمدی پہلو ہے۔ ایک ازلی اور ابدی حقیقت ایسی ہے جو غیر متغیّر اور لازوال ہے۔ یہ الآن کما کانَ تمام حوادث سے ماوراء الوراء اپنی ماہیت پر قائم ہے لیکن خالق کی دوسری شان یہ ہے کہ کُلَّ یومٍ ہُوَ فی شانٍ۔ ہر وقت اُس کی کیفیت اور شان نرالی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی تکرار نہیں۔ کوئی مظہر بعینہٖ کسی دوسرے مظہر کی طرح ظہور میں نہیں آتا۔ اس پہلو میں خلاّقی ایک مسلسل تمنائے تخلیق ہے۔ اسی سے عالم وجود پذیر ہوتے ہیں۔ کوئی عالم دوسرے عالم کی طرح کا نہیں ہوتا کیونکہ مظاہر میں تکرار نہیں اگرچہ ہر عالم کا آئین الگ الگ ہے لیکن کسی ایک ہی عالم کے اندر ایک اساسی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مادی عالم کو دیکھیے اکثر قدما کا خیال تھا کہ زمین کے مادّے اور اجرام فلکیہ کے مادّے میں کوئی جوہری فرق ہے لیکن ترقی یافتہ طبیعیات اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ زمین، سورج، چاند اور لاتعداد ستاروں کا مادّہ ایک ہی ہے۔ اگرچہ اضافیت کے لحاظ سے اس مادے کی صفات میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح نباتات کے عالم میں گوناگونی کے باوجود آئینی یکسانی موجود ہے جو اس عالم کو جمادات کے عالم سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی طرح حیوانات کا عالم اپنے لامتناہی تنوع کے باوجود ایک اساسی وحدتِ آئین میں منسلک ہے۔ اسی طرح محسوسات کے تمام عالم مل کر ایک یک رنگی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس شعر میں غالبؔ نے خالق کے جذبۂ تخلیق کو ارتقائی قرار دیا ہے۔ تمنائے سرمدی ہمیشہ آگے کی طرف قدم بڑھاتی رہتی ہے۔ اُس کا ایک قدم ایک عالم کی آفرینش کا باعث ہوتا ہے۔ وہاں اپنا نقشِ قدم چھوڑ کر تمنائے تخلیق آگے بڑھتی اور دوسرا قدم اُٹھاتی ہے۔ ایک نقشِ قدم ایک عالم کا اساسی قانون بن جاتا ہے اور اُس عالم کے تمام مظاہر کی کثرت میں ایک مخصوص وحدت پیدا ہوتی ہے جو دوسرے عوالم کی دوسری قسم کی کثرتوں سے ایک الگ

۳۳۵۷۵
۸ / جولائی ۲۰۰۵ء

قسم کی ہوتی ہے۔ جمادات کا اساسی قانون نباتات سے الگ، نباتات کا حیوانات سے الگ اور انسانی زندگی کا بنیادی آئین ان دونوں سے جدا۔ اس امتیاز کے باوجود بھی یہ تمام عوالم مجموعی طور پر عالمِ امکان کہلاتے ہیں۔ اس کے محسوسات و مُدرکات و معقولات سب زمان و مکان یا علّت و معلول کے سانچوں سے باہر نکلتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔ غالب اس سارے عالمِ امکان کو لامحدود تمنائے خلّاقی کا ایک نقش قدم قرار دیتا ہے۔ طبیعی سائنس بھی اب اسے ایک نقشِ قدم ہی سمجھتی ہے۔ خاک اور فلک الافلاک سب کا اساسی سانچا ایک ہی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ لامتناہی تمنائے تخلیق نے کوئی دوسرا قدم بھی ضرور اٹھایا ہوگا جس نے ایک ایسا عالم پیدا کیا ہو جو عالمِ امکاں کی طرح زمان و مکان کے سانچوں میں ڈھلا ہوا نہ ہو۔ صوفیہ اپنی روحانی واردات کی بنا پر ایسے عالموں کے ادراک کا دعویٰ کرتے ہیں اور اسپنوزا کی طرح کے بعض فلاسفہ بھی اس کے قائل نظر آتے ہیں کہ عالمِ شعور اور مادّی عالمِ محسوس کے علاوہ لاتعداد عوالم اور ہوسکتے ہیں کیونکہ خدا کی صفات اور وجود کے انداز لامحدود ہیں لیکن ہم موجودہ منزلِ ارتقا میں اُن کا تجربہ نہیں کر سکتے۔ اسی خیال کو غالب نے اس حکیمانہ شعر میں بیان کیا ہے کہ دنیا و مافیہا کے دشتِ امکاں پر ایک نقش قدم نظر آتا ہے ضروری ہے کہ دوسرا قدم کسی دوسرے عالم کے لیے باعثِ آفرینش ہوا ہو، لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں پڑا۔ اس دوسرے عالم کے وجدان کی تمنا موجود ہے لیکن عالم امکان کے اندر گھری ہوئی ہستی کو اس کا ادراک کیوں کر ہو" ؟

(۱۶) غالب کا ایک اور مشہور شعر ہے :

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اس حکیمانہ شعر کی تشریح ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں سنیے :

" یہ شعر غالب کے نہایت درجہ حکیمانہ اشعار میں سے ہے۔ یہ عالم عالمِ کون و فساد ہے اس میں وجود مسلسل بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ تعمیر کے ساتھ تخریب اور زندگی کے ساتھ موت لگی ہوئی ہے۔ ہستیاں پیدا ہوتی پھلتی پھولتی اور پھیلتی ہیں لیکن نشو و نما کے کمال کے ساتھ اُن کا زوال شروع ہو جاتا ہے یہ زندگی کا عام تجربہ ہے اور اس کا مشاہدہ اس قدر عام ہے کہ اس کے لیے کسی گہری بصیرت کی ضرورت نہیں۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ کسی چیز کی تعمیر اور تخریب بیک

وقت اور بیک جا نہیں ہوتی۔ تعمیر کے کچھ عرصہ بعد تخریب ہوتی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ یوں نہیں بلکہ تعمیر کے دوران میں بھی تخریب کے عناصر اُس کے اندر کارفرما ہوتے ہیں۔ حکیمانہ نکتہ یہ ہے کہ یہ تخریبی عناصر کہیں خارج سے نہیں آتے بلکہ وہی تعمیری عناصر ہی اپنے اندر یہ پہلو بھی رکھتے ہیں۔ جو عنصر کسی چیز کی تعمیر یا نشوونما کا باعث ہوتا ہے وہی عنصر ایک خاص حد تک پہنچ کر اس کی تخریب کا موجب بن جاتا ہے۔ ہر زندہ چیز ایک لحاظ سے اُسی وقت مرنا بھی شروع ہو جاتی ہے، جس وقت اُس کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ انسانی عمر کو بھی دو طرح دیکھ سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ ہر سال گرہ پر خوشی منائی جائے کہ عمر میں ایک سال کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ہر سال گرہ پر افسوس کیا جائے کہ انسان موت سے قریب تر ہو گیا ہے۔ بچپن کے نشوونما میں طفولیت کی موت شباب کے آغاز کا ایک پہلو ہے۔

مغرب کے اساطین حکما میں ہیگل کا تمام تر فلسفہ اسی ایک خیال کی ہمہ گیر تعبیر ہے۔ ہیگل نے تاریخ، تہذیب و تمدن، مذہب، علوم و فنون سب پر اس اصول کا اطلاق کیا ہے اور ہر جگہ یہ استدلال کیا ہے کہ وجود کے ہر اثبات کے اندر سے اُس کی نفی صادر ہوتی ہے۔ ہر وجود اپنے اندر اپنے تناقض کے عناصر بھی رکھتا ہے۔ وجود کے تخریبی پہلو اُس کے تعمیری پہلوؤں ہی سے صادر ہوتے ہیں کائنات کے ہر شعبے کا ارتقا اسی اصول نفی و اثبات کی بدولت ہوتا ہے۔

ہیگل کہتا ہے کہ اثباتِ محض یعنی وجود کی کسی ایک حیثیت کو برقرار رکھنے سے تغیر اور حرکت ناممکن ہو جائے گی اور زندگی آگے کی طرف نہ بڑھ سکے گی۔ ہیگل کا فلسفہ حرکت اور ارتقا کا فلسفہ ہے اور اُس کے نزدیک یہ اسی طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ہر تعمیر یا ترکیب اپنے داخلی اور منطقی ارتقا ہی سے اپنی پہلی حیثیت کی نفی کے عناصر پیدا کرلے۔ فنا و بقا دو الگ الگ اور متضاد حقائق کا نام نہیں۔ فنا اور بقا ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں فنا کے بغیر بقا نہیں ہو سکتی اور بقا کے بغیر فنا کا تصور بے معنی ہے۔ وجود کے متعلق قرآن حکیم کا بھی بنیادی تصور یہی ہے۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ (الروم)

خدا موت میں سے زندگی اور زندگی میں سے موت نکالتا ہے۔ خدا کی ربوبیت اسی اصول پر کام کرتی ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں پرورش، نشوونما اور ارتقا کے اسباب مہیا کرنا۔ ایک

طرف خدا کو ربّ قرار دیا گیا ہے اور دوسری طرف یہ بتایا گیا ہے کہ ربوبیت کا عمل کس طرح فنا و بقا کے ذریعہ ظہور میں آتا ہے۔ اس زاویۂ نگاہ سے موت کوئی ڈراونی اور حیات کُش چیز نہیں۔ دریائے حیات کی موجیں اٹھتی اور گرتی رہتی ہیں، اسی عروج و زوال کا نام روانی ہے۔ انسان بھی جب چلتا ہے تو ایک قدم اٹھتا ہے اور دوسرا گرتا ہے۔ جب تک ایک قدم گرتا نہیں دوسرا قدم نہیں اُٹھ سکتا ہیگل کے ماہیتِ وجود کا جو وجدان ایک ہمہ گیر فلسفہ کی آفرینش کا باعث ہوا۔ وہی وجدان غالب کے اس شعر میں موجود ہے۔ شاعر منطقی مقدّمات قائم نہیں کرتا اور نہ منطقی استدلال کے ساتھ نتائج اخذ کرتا ہے۔ وہ اپنے وجدان کو بے استدلال محض ایک مؤثر تشبیہ یا تمثیل سے ادا کرتا ہے۔ حقیقت حکمت و شعر دونوں میں یکساں ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ایک کو عقلِ خنک فطرت نے بے سوز کر دیا ہے اور دوسرے کے طرزِ بیان میں سوز، تاثّر اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔

دوسرے مصرعے میں غالب کو جو مثال سوجھی وہ بھی انوکھی اور قابلِ داد ہے۔ دہقان کے خونِ گرم سے بجلی کا پیدا ہونا بظاہر ایک شاعرانہ بات معلوم ہوتی ہے لیکن طبیعیات کے علم نے صدیوں کی تحقیقات کے بعد زمانۂ حال میں یہ بصیرت مشاہدہ اور تجربے سے حاصل کی کہ نور و نار اور برق و حرارت سب کی ماہیّت ایک ہی ہے۔ حرارت سے ہر طبیعی عمل پیدا ہوتا ہے پھر ہر طبیعی عمل حرارت میں متبدل ہو جاتا ہے۔ عمل سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور حرارت سے عمل۔ اسی طرح حرارت سے برق اور برق سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور یہ بھی بنیادی حقیقت کی دو متبادل شکلیں ہیں۔ غالب کے وجدان نے عمل سے حرارت اور حرارت سے برق کی آفرینش کا مشاہدہ کر لیا۔ قبل اس کے کہ طبیعیات اپنی طویل تحقیقات سے اسے پایۂ ثبوت تک پہنچائے۔ انسان کا تخیل ہمیشہ استدلال اور مادّی ثبوت سے بہت آگے چلتا ہے۔ وجدان اور تخیّل عقل منطقی اور ثبوت تجربی کے مقابلے میں بہت زیادہ تیز رَو ہیں۔ پانو کے مقابلے میں نگاہ بہت زیادہ سریع السَّیر ہے۔ نگاہ ایک لمحے میں جہاں جا پہنچتی ہے پانو کو وہاں پہنچتے ہوئے بڑا طویل عرصہ چاہیے۔ اسی نگاہ سے انسان کروڑوں میل دور ستاروں کو بھی دیکھتا ہے۔ نگاہ سے زیادہ تیز رَو عقل اور خیال ہے۔ پھر عقل اور خیال سے زیادہ دور رس اور تیز رَو تخیّل اور وجدان ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں وہ شاعروں، عارفوں اور حکیموں کے وجدان کے متعلق ہمیشہ بدگمان رہتے ہیں۔ یہ ان کی

سمجھ میں نہیں آسکتا کہ کس طرح کوئی شخص استدلال اور طبیعی تجربے سے قبل زندگی کی بنیادی حقیقتوں کے متعلق بصیرت کا اظہار کر سکتا ہے۔ مولانا روم دینی وجدان اور منطقی استدلال کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں، "پائے استدلالیاں چوبین بود" منطقیوں کی ٹانگیں لکڑی کی ہوتی ہیں۔ لکڑی کی ٹانگ سے بھی انسان تھوڑا بہت چل لیتا ہے لیکن ڈگمگاتا ہوا اور نہایت سست رفتاری سے۔ اور ہر وقت ٹھوکر کھا کر گرنے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں انسان میں دوسرے ملکات موجود ہیں جو منطقی استدلال اور طبیعی مشاہدے سے بے نیاز معلوم ہوتے ہیں اور ان دونوں کے مقابلے میں زیادہ یقین آور ہوتے ہیں۔

غالب اور ہیگل کا یہ وجدان کہ ہر تعمیر میں ایک خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے کارل مارکس کو بھی ایک حقیقت معلوم ہوا لیکن اُس کی نظر مادّی اور معاشی دنیا تک محدود رہی۔ کارل مارکس کے تمام سوانح نگار لکھتے ہیں کہ وہ ایک عرصے تک ہیگل کے فلسفے سے بے حد متاثر رہا اور آخر میں جب اُس نے ساری توجہ معاشیات کی طرف منعطف کر دی تو بھی وہ مادّیت اور معاشیات کے دائرے میں اُسی اصول کو صحیح سمجھتا رہا۔ اُس نے کہا کہ اسباب حیات کی آفرینش اور سامان زندگی کی تقسیم کئی منازل اور مدارج سے گزری ہے۔ ہر درجے میں، جب ایک انداز نشو و نما پا رہا تھا تو اس کے اندر ہی سے ایسے عناصر پیدا ہو رہے تھے جو اُس انداز کو فنا کر کے اُسے لابدی طور پر ایک دوسرے انداز میں لا رہے تھے۔ جاگیر داری نے خود ایسے عناصر پیدا کر دیے جو اُسے فنا کر کے سرمایہ داری کی طرف لے آئیں۔ پھر گذشتہ دو صدیوں میں سرمایہ داری روز بروز زور پکڑتی گئی۔ لیکن اُس کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تخریب کے سامان بھی پیدا کرتی گئی، پہلے سرمایہ دار کثیر تعداد میں پیدا ہوئے۔ پھر سرمایہ داری کے اُصولوں ہی نے اُن کی تعداد میں کمی کرنا شروع کی۔ بڑے بڑے گھڑیال اور مگرمچھ پیدا ہونے شروع ہوئے، جنھوں نے نہ صرف عام مزدوروں کو نادار اور بے بس کر دیا بلکہ وہ چھوٹے سرمایہ داروں کو بھی ہڑپ کر گئے۔ نادار مزدور کثیر تعداد میں کارخانوں میں جمع ہو گئے۔ اس اجتماع نے اُن میں اتحاد کی قوّت پیدا کر دی اور مزدوروں میں اپنی بے پناہ قوت کا شعور پیدا ہو گیا۔ یہ شعور بڑھتے بڑھتے اس حد تک جا پہنچے گا کہ جس سرمایہ داری نے اُسے پیدا کیا ہے وہ اُسے فنا کر دے گی۔ اگر سرمایہ داری کی ایسی شاندار تعمیر نہ ہوتی تو اُس کی تخریب کے

سامان بھی پیدا نہ ہوتے ہر چیز کا کمال ہی اُس کے زوال کا باعث ہوتا ہے۔ سرمایہ داری کی تعمیر ہی میں اس کی خرابی کی صورت میں مضمر تھی جو آخر میں پوری طرح ظاہر ہو گئی۔ اُدھر دہقان کا خون گرم بجلیاں پیدا کر رہا ہے جو خرمن گندم کو تو نہیں لیکن ظالمانہ زمینداری اور جاگیرداری کے خرمن کو جلا دیں گی۔ دوسری طرف کاری گروں اور مزدوروں کا خونِ گرم سرمایہ داری کے لیے برق افگن ہو رہا ہے۔ غالب اور ہیگل کا وجدان معاشی دنیا میں خوفناک ثبوت مہیا کر رہا ہے لیکن یہ فلسفہ صرف معاشیات ہی تک صحیح نہیں بلکہ نفسیات، روحانیات، تہذیب و تمدن اور وجود کے ہر شعبے پر قابلِ اطلاق معلوم ہوتا ہے۔ دیکھیے دلّی کی زوال پذیر تہذیب میں پیدا ہونے والا شاعر حکیم کیسی دور رس بصیرت اور کیسا حقیقت رس وجدان پیش کر گیا ہے۔"

(۱۷) ان دو مثالوں سے واضح ہو گیا ہو گا کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے کس اعلیٰ و ارفع فلسفیانہ سطح سے افکارِ غالب کی ترجمانی کی ہے اور میرا خیال ہے کہ دیوانِ غالب کی صحیح شرح و ترجمانی کا حق ایسا ہی قلم ادا کر سکتا ہے جو حکیمانہ بھی ہو اور شعر و ادب کی لطافتوں کا حامل۔

مطالعۂ غالب کے نئے امکانات

مرزا غالب کی زندگی اور ان کے فن پر پچھلی ایک صدی میں خاصی تحقیق اور تنقید ہو چکی ہے۔ یہ مرزا غالب کی خوش بختی ہے کہ انھیں ہر دور میں اچھے، ذہین اور ذی علم لکھنے والے میسّر آتے رہے اور امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا کیوں کہ غالب شناسی ہمارے ادب کا ممتاز اور پسندیدہ موضوع بن چکا ہے۔ غالب کے نام سے ہر عالم و عامی، وضیع و شریف اور اپنا اور بیگانہ آشنا ہو چکا ہے۔ اس کے متداول دیوان کی اشاعت اتنی کثرت سے ہوئی ہے کہ اب اگر دیوانِ غالب کے کل مطبوعہ اور قلمی نسخے ضائع ہو جائیں تو اردو والے مل کر اس کا پورا دیوان حافظے سے دوبارہ لکھوا سکتے ہیں۔ غالب کے نام پر ہندوستان کے دل میں دو ایوان بن گئے ہیں، یہاں ریسرچ کی سہولتیں فراہم ہوں گی تو آنے والی نسلیں مختلف موضوعات پر اچھے اور سنجیدہ تحقیقی کام کریں گی۔ اس طرح غالب فہمی کی راہیں زیادہ روشن ہوتی جائیں گی۔ اور اس خوش نصیب شاعر کی زندگی کے معمولی سے معمولی گوشے بھی اجاگر ہو جائیں گے۔ تب ہم پورے غالب کو دیکھ سکیں گے اور اسی وقت یہ سمجھ میں آئے گا کہ وہ کس عہد کا شاعر تھا، اس کا تخیّل کتنا رسا تھا، اس نے اردو شاعری کو بالکل نئی مگر حد درجہ مانوس آواز کس طرح دی۔ وہ کیوں اپنے اسلوب کا خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھا؟ غالب اردو سے نکل کر ہندوستان کا بڑا شاعر بن چکا ہے۔ عالمی ادب کی

محفل میں جہاں ہم کالی داس اور ٹیگور کو نمایندگی کے لیے بھیجتے تھے وہاں رفتہ رفتہ غالب بھی اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ آنے والے زمانے میں جب اس کی تصانیف کے مکمل اور اچھے تراجم دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں ہو جائیں گے تو اسے یقیناً اس سے برتر مقام حاصل ہوگا، جس پر وہ آج نظر آتا ہے۔ جس طرح فارسی میں سعدی و حافظ، عربی میں المتنبی، انگریزی میں شیکسپیر اور سنسکرت میں کالی داس حیاتِ جاوداں حاصل کر چکے ہیں کہ اب خواہ یہ زبانیں فنا ہو جائیں، ان کے نام نہیں مٹ سکتے، اسی طرح غالب ہر قید و اضافت سے ماورا ہو گیا ہے۔ اس کی مقبولیت کا دائرہ ابھی اور وسیع ہوگا۔ یہاں تک کہ آنے والی نسلیں اُسے ہم سے زیادہ عزیز رکھیں گی۔ اس لیے ہمیں یہ سوچنا ہے کہ غالب کے فکر و فن پر تحقیق و تنقید کے کون سے پہلو ابھی تشنہ ہیں، غالب شناسوں کو ابھی کیا اور کرنا ہے، اور کون سے گوشے ناپیمودہ رہ گئے ہیں۔

ابھی غالب پر جتنے کام ہوئے ہیں سب انفرادی ذوق اور کوشش کا نتیجہ ہیں ہر شخص کے وسائل محدود ہوتے ہیں۔ قوتِ کار، استعداد اور مقتضیات انفرادی کام کو ایک حد میں ہی رکھتے ہیں۔ لیکن اب وقت آ رہا ہے کہ غالب شناسی، اجتماعی کوششوں کا موضوع بنے۔ آیندہ غالب کے سلسلے میں بہتر اور برتر کام اجتماعی شکل ہی میں ہو بھی سکتے ہیں۔ ابھی تک غالب کو پھیلانے کا کام ہوا ہے۔ اب اسے سمیٹنے (Accumulation) کی ضرورت ہے۔ یہاں ایسے کاموں کا ایک اشاریہ پیش کیا جاتا ہے جنھیں ہم کسی ادارے کے وسائل اور اجتماعی کوششوں کو بروے کار لا کر انجام دے سکتے ہیں۔

۱۔ مستند متن: دیوانِ غالب کے سوا غالب کی دوسری تصانیف کے مستند اور محشّی متن موجود نہیں ہیں۔ یہ کام بہت ضروری ہے کہ غالب کی کل تصانیف نظم و نثر کو جو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں، نئے سرے سے ایڈٹ کیا جائے۔ پہلے ہمیں کچھ اصول و ضوابط وضع کرنے ہوں گے کہ ان تصانیف کی تدوین کن خطوط پر ہو۔ کون سے متن کو اساس بنایا جائے۔ اختلافات روایت کو کس طرح درج کیا جائے، املا کون سا ہو۔ یعنی جو غالب کا اختیار کردہ تھا، یا جو آج رائج ہے یا جو ازروے لغت و

قواعد درست ہے۔ اس طرح کے جتنے مسائل سامنے آئیں ان پر غور و فکر کے بعد جو طریقِ اوسط اختیار کیا جائے گا اُس کی روشنی میں ہم تصانیفِ غالب کے مکمل، مستند اور خوب صورت یونیفارم ایڈیشن تیار کر سکتے ہیں۔ انگریزی میں بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے (Uniform) چھپے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر یہ خاکہ بنایا جا سکتا ہے۔ غالب کی تصانیف کے یونیفارم ایڈیشن چھاپنے کے لیے (Henry Irwing) کے مرتب کردہ شیکسپیئر کے (Works) بھی ایک نمونہ بن سکتے ہیں۔ سرسری طور پر اس کا خاکہ یوں ہوگا:

پہلی جلد: اس کے دو حصّے ہوں:

حصّہ اوّل: متداول دیوان۔

حصّہ دوم: منسوخ کیا ہوا اور متفرق کلام۔

دوسری جلد: اس کے تین حصّے ہوں:

پہلے حصّے میں: اردو خطوط جو عودِ ہندی اور اردوے معلّیٰ میں موجود ہیں، تاریخی ترتیب کے ساتھ۔

دوسرے حصّے میں: وہ خطوط جو متفرق مآخذ میں ہیں اور پچھلی ایک صدی میں وقتاً فوقتاً دریافت ہوتے رہے ہیں۔

تیسرے حصّے میں: غالب کی متفرق اردو تحریریں، تقریظیں، نوٹس وغیرہ۔

تیسری جلد: اس کے تین حصّے ہوں:

پہلا حصّہ: غزلیات فارسی۔

دوسرا حصّہ: قصائد فارسی۔

تیسرا حصّہ: مثنویات اور دوسری اصنافِ سخن۔

سبد چیں اور سبد باغ دو در کا کلام بھی انھیں حصوں میں اپنے اپنے محل پر شامل ہو جائے گا اور اسے گوارا نہ کیا جائے تو کلیات نظم فارسی سے خارج جتنا متفرق کلام ہے وہ علاحدہ ایک حصّے میں فراہم کیا جا سکتا ہے۔

چوتھی جلد: یہ تصانیف نثر کی ہوگی، اس کے چار حصّے کیے جائیں گے:

پہلا حصّہ : مہرِ نیمروز

دوسرا حصّہ : دستنبو

تیسرا حصّہ : فارسی خطوط جو پنج آہنگ، میں شامل ہیں۔ اور جو باغ دودر، متفرقاتِ غالب، نامہ ہائے فارسی غالب، تلاشِ غالب وغیرہ میں ملتے ہیں۔ دیہ تاریخی ترتیب سے یک جا ہوں گے۔

چوتھا حصّہ : قاطع برہان و رسائل متعلقہ۔

پانچواں حصّہ : غالبؔ کی متفرق فارسی تحریریں۔ اسی میں پنج آہنگ کے نثری حصّے جو خطوط کے ماسوا ہیں، شامل ہو سکتے ہیں۔

اگر یہ ترتیب متفق علیہ نہ ہو تو اور صورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان میں ایک سامنے کی صورت یہی ہے کہ غالبؔ کی زندگی میں اُن کی جتنی تصانیف جن ناموں سے چھپیں وہ اسی طرح چھاپی جائیں اور متفرق کلام نظم و نثر جو اہلِ تحقیق کھوجتے رہے ہیں وہ علاحدہ جلد میں آجائے۔ اس میں یہی خرابی رہے گی کہ بعد میں دریافت ہونے والی تحریریں اپنی صحیح جگہ پر نہیں پہنچ سکیں گی۔ مثلاً غالبؔ کا ایک اردو خط بنام ہرگوپال تفتہ میں نے دریافت کیا تھا جو "تلاشِ غالب" میں موجود ہے، اس کا زمانہ جون ۱۸۵۴ء متعین ہوتا ہے۔

خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد میں یہ خط نمبر ۲۵ اور ۲۶ کے درمیان آنا چاہیے۔ اگر اسے علاحدہ جلد میں ڈال دیا تو پھر پورا سیاق و سباق ہر شخص کے سامنے نہیں آسکتا جب تک وہ اصل کتاب کے ساتھ متفرقات کی جلد کا بھی مطالعہ نہ کرے۔ لیکن ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ غالبؔ کی تصانیف نظم و نثر کا متن ہم اپنی سہولت اور ضرورت کے لحاظ سے اور وضع کردہ اصولوں ہی کی روشنی میں ترتیب دیں اور یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ غالبؔ کی زندگی میں "پنج آہنگ" ایک کتاب کی صورت میں چھپی تھی، ہم نے پانچواں آہنگ کسی جلد میں رکھ دیا اور چار آہنگ کہیں اور متن کو اپنے اصولوں پر ترتیب دے کر ہم ریسرچ کی جدید ضرورتوں اور تقاضوں کا خیال کریں اور تصانیفِ غالبؔ یا غالبؔ سے متعلق اہم کتابوں کے نئے ایڈیشن علاحدہ

چھاپے جائیں۔ مثلاً دیوانِ غالب کے پانچوں ایڈیشن جو غالب کی زندگی میں چھپے، فوٹو آفسٹ کے ذریعے دوبارہ جوں کے جوں چھاپے جائیں۔ اسی طرح کلیاتِ نظم غالب کے ایڈیشن پھر نسخۂ امروہہ، نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ شیرانی، گلِ رعنا، دستنبو، پنج آہنگ، مہر نیمروز، درفشِ کاویانی، یہ سب عکسی طباعت میں آسکتے ہیں۔ غالبیات کے سلسلے کی بعض اہم کتابیں مثلاً 'انتخابِ غالب' اور 'مکاتیبِ غالب' کے ڈی لکس ایڈیشن بھی اس منصوبے میں شامل ہوسکتے ہیں۔

۲۔ تصانیفِ غالب کے تراجم

دوسرا اہم اور ضروری کام ترجمے کا ہے۔ اس منصوبے کو بھی بڑے پیمانے پر پھیلایا جاسکتا ہے۔ ترجمے کا کام تین حصّوں میں تقسیم ہوگا۔

۲:۱۔ غالب کی فارسی تصانیف کا ترجمہ اردو زبان میں، اس میں کلیاتِ نظم فارسی کی مکمل شرح بھی شامل ہے۔

۲:۲۔ غالب کی تصانیف کے وہ حصّے جن سے ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں کو بھی دل چسپی ہوسکتی ہے۔ دیوان کا ترجمہ اور شرح تو ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں میں ہو، البتہ خطوطِ اردو و فارسی کے ضروری انتخابات اسی مقصد سے کرائے جائیں۔

۲:۳۔ غیر ملکی زبانوں میں دیوانِ غالب، خطوطِ غالب اور دوسری تصانیف کے منتخب حصّوں کا ترجمہ۔ ان میں فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، جرمن، چینی، فرنچ، روسی، اطالوی اور ازبک زبانوں کو ترجیح حاصل ہوگی۔

غالب کے افکار کا ایک ایسا نمائندہ انتخاب بھی تیار کیا جائے جس میں نئی نسل کے لیے غور و فکر اور پسندیدگی کا سرمایہ ہو اور وہ انتخاب دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ کرایا جائے۔

ہم نے غیر اردو داں دنیا کے سامنے ابھی تک غالب کا نام ہی پیش کیا ہے، اس کے فن کی نمائندگی نہیں ہوسکی ہے۔ ایسے انتخابات اور ان کے تراجم میں اسی بات پر زیادہ زور دینا ہوگا۔

۳۔ فرہنگ اور اشاریہ

تیسرا بڑا اور جماعتی کام غالب کی فرہنگ اور اشاریہ بنانے کا ہے۔ یہ فرہنگ دو جلدوں میں ہو۔ پہلی جلد لغات فارسی اور دوسری لغات اردو۔ اس میں وہ کل الفاظ آجائیں جو غالب کی جملہ معلوم تحریروں میں استعمال ہوئے ہیں، اُن کا مکمل حوالہ ہو۔ بلکہ وہ جملہ یا مصرع ہی درج کر دیا جائے جس میں لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسے حسب ضرورت وسیع بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ کی مثالوں میں متقدمین شعرا کی سند بھی درج ہو، کچھ اور ضروری تشریح یا دوسری لغات کے حوالے وغیرہ۔

اشاریۂ غالب میں ایسے تمام اسماء و اعلام جمع کیے جائیں جن کا غالب کی تحریروں میں تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً ہمیں یہ معلوم کرنا ہو کہ دہلی کے محلّہ چاندنی چوک کا حوالہ غالب کی تحریروں میں کہاں کہاں ملتا ہے تو یہ اشاریہ ہماری رہ نمائی کرے۔ یا ہر گوپال تفتہ کا ذکر کہاں کہاں ملے گا، یہ اشاریہ بتائے۔

۴۔ کتابیات

چوتھا منصوبہ کتابیاتِ غالب (Ghalib Bibliography) کا ہے۔ چھوٹے پیمانے پر کچھ حضرات نے بشمول راقم الحروف یہ کام کیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی مکمل نہیں ہے۔ ببلیوگرافی کبھی مکمل ہو بھی نہیں سکتی۔ اس کے لیے بہترین طریق یہ ہوگا کہ ایوانِ غالب میں اس کا ایک شعبہ علاحدہ قائم کیا جائے جسے (Documentation) برانچ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک ریسرچ اسکالر یا (Documentation Officer) ایک دو اس کے معاون اور (Typist) وغیرہ ہوں۔ کیٹلاگ (Cabinet) بنوالی جائیں اور پر تمام کتابوں، مضامین اور متقاطع حوالوں کے اندراج ہوں، جنھیں ۱۰ یا ۱۵ ہزار حوالوں کی ایک جلد میں چھاپ دیا جائے۔ اسی طرح جب مزید دس ہزار حوالے فراہم ہو جائیں تو انھیں دوسری جلد میں جگہ دی جائے۔ اس میں ہر مضمون کا خلاصہ لازماً دینا ضروری نہیں۔ البتہ جہاں عنوان سے ظاہر نہ ہوتا ہو کہ مندرجات کیا ہیں وہاں کم سے کم لفظوں میں اس کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی مضمون کا عنوان ہے: "مرزا غالب کے دربار اودھ سے تعلقات"۔ اس سے ظاہر ہے کہ مضمون میں کیا ہوگا۔ لیکن اگر عنوان ہو: "غالب کا ایک فارسی قصیدہ" تو یہاں ظاہر کرنا چاہیے کہ کون سے قصیدے کے متعلق کیا کہا گیا

ہے۔ غالب پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب ببلیوگرافی نہ ہونے کی صورت میں غلط فہمی پیدا ہونے یا تکرار ہو جانے کا شدید اندیشہ رہتا ہے، اس لیے اگر دوسرے منصوبوں پر اسے ترجیح دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

۵۔ جہانِ غالب

پانچواں بڑا منصوبہ جہانِ غالب کا ہے۔ اسے آپ "غالب انسائیکلوپیڈیا" کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اس میں اسماء الرجال کے علاوہ ہر چیز جس کا غالب کی تحریروں میں حوالہ ملتا ہے، آ جائے گی۔ غالب کے رشتہ دار، احباب، تلامذہ، ممدوحین، معاصرین، یا جن کتابوں میں غالب کا حوالہ ملتا ہے، جن شہروں اور محلّوں کا تذکرہ اُن کے خطوط میں ہے یا جو تلمیحات ان کے کلام اردو و فارسی میں استعمال ہوئی ہیں، اُن سب کا ذکر 'جہانِ غالب' میں شامل ہوگا۔ مثلاً صدرالدین آزردہ عنوان ہے، تو اس میں آزردہ کے مختصر اور جامع حالات، غالب سے ان کے تعلقات، غالب کی جن تحریروں میں آزردہ کا ذکر ہے، ان کے حوالے، اور پھر حالاتِ آزردہ کے مآخذ۔ اسی طرح سلطان جی کی باولی، قاری کا کنواں، مرزا گوہر کا باغیچہ وغیرہ دہلی کے محلّوں کا ذکر ہے۔ 'جہانِ غالب' میں قطعیت کے ساتھ ان کا محلِ وقوع بتایا جائے گا۔ کتابوں میں آمد نامہ، نل دمن، بوستانِ خیال یا سنبلستان کا غالب نے حوالہ دیا ہے، اُن کی تفصیل 'جہانِ غالب' کا موضوع ہوگی۔

بہت سی شخصیات کا تذکرہ غالب کی تحریروں میں ملتا ہے مگر ان کا حال معلوم نہیں مثلاً بدرالدین کاشف کے نام غالب کے پانچ اردو خطوط ملتے ہیں۔ غلام رسول مہر نے خطوطِ غالب میں یہ اہتمام کیا ہے کہ مکتوب الیہم کے ضروری اور مختصر حالات درج کریں مگر بدرالدین کاشف کا انھیں کچھ حال معلوم نہ ہوا۔ مالک رام صاحب نے انھیں 'تلامذۂ غالب' میں شمار کیا ہے مگر صرف نام درج ہوا ہے حالات یا کلام میں ایک سطر بھی نہیں۔ عبدالرؤف عروج نے 'بزمِ غالب' میں اتنا ہی لکھا ہے جو مہر نے 'خطوطِ غالب' میں لکھا تھا۔ حالات معلوم نہ ہونے سے قباحت یہ ہے کہ بدرالدین کاشف کے نام جو خطوط ہیں اُن کے مشمولات اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتے۔ مثلاً ان میں نواب محمد میر خاں کا حوالہ

ہے سید محمد صاحب اور اُن کے دونوں بھائیوں کا ذکر ہے، نواب محی الدین خاں عرف بڈھے صاحب کا تذکرہ ہے۔ جب تک کاشف کے حالات منکشف نہ ہوں، یہ سب پردۂ خفا میں رہتے ہیں۔ بدرالدین کاشف دراصل سید وحیدالدین بیخود دہلوی کے دادا اور شاہ نظام الدین احمد صوبیدار دہلی کے نواسے تھے۔ سید علی غمگین دہلوی ثم گوالیاری اُن کے چچا تھے۔ ان کے خاندان کے حالات 'سیرت الصالحین' میں ملتے ہیں۔

اسی طرح مجھے حال ہی میں ایک "تذکرۂ بحرِ ذخار" ملا جس کا مصنف صادق حسین وصفی ہے۔ یہ کدورہ کالپی کا رہنے والا اور نادر حسین خاں ہاشمی کا پوتا ہے۔ انھیں نادر حسین خاں کا حوالہ انورالدولہ شفق کے موسومہ خطوط میں متعدد بار آیا ہے۔ ایسی شخصیات یا اسماء و اعلام جن کا خطوطِ غالب میں حوالہ ہے، اگر مبہم نہ رہیں اور ہم ان کے بارے میں ضروری باتیں جانتے ہوں تو اس سے غالب کی تحریروں کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات حیرت انگیز باتیں معلوم ہوتی ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ تل اوٹ پہاڑ چھپا ہوا تھا اس لیے 'جہانِ غالب' کی تکمیل بھی ضروری ہے۔ اس کام کا آغاز قاضی عبدالودود صاحب عرصہ ہوا کر چکے ہیں اُنھیں خطوط پر اس منصوبے کو مکمل کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ اصل تحریریں

چھٹا منصوبہ یہ ہے کہ غالب کی جتنی تحریریں اب تک دستیاب ہوئی ہیں، انھیں یک جا کیا جائے۔ اب تو پوری پوری دو کتابیں غالب کے خط میں لکھی ہوئی دستیاب ہیں ایک " دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ" دوسرے "گل رعنا کا نسخۂ لاہور"۔ ان کے علاوہ غالب کے اصل خطوط ان کے قلم سے لکھی ہوئی بعض غزلیں یا کتابوں پر ان کے حواشی۔ یہ سب ابھی تک بکھرے پڑے ہیں۔ انھیں یا تو اس طرح (Catalogue) کیا جائے کہ ان کی تاریخی ترتیب ہو جائے۔ یا نظم و نثر اردو و فارسی کی ترتیب ہو۔ سب سے بہتر شکل یہ ہوگی غالب کی تصانیف کے یونیفارم ایڈیشن جس کا تذکرہ میں نے منصوبہ نمبر ا کے تحت کیا ہے۔ اُس میں ہر تحریر اُسی موقع پر کتاب میں بصورت عکس آجائے۔ اصل کی تصویر دینے سے تین فائدے ہوں گے: ایک تو وہ اپنی صحیح جگہ پہنچ کر محفوظ ہو جائے گی، دوسرے جتنی عبارت کا عکس شاملِ کتاب ہوگا کم سے کم اتنا حصہ متن کا شک و شبہ سے بالاتر رہے گا۔

تیسرے غالبؔ کی تحریروں کا مطالعہ اور ان کے املا کی تحقیق کرنے میں سہولت حاصل رہے گی۔

۷۔ غالبؔ کا تفصیلی مطالعہ

ہمارے غالب شناسوں میں قاضی عبدالودود، شیخ محمد اکرام، غلام رسول مہر، مالک رام اور مولانا عرشی نے غالبؔ کی زندگی کا بڑی کاوش سے مطالعہ کیا ہے۔ ان حضرات نے اپنی سالہا سال کی محنت اور تلاش و تحقیق سے غالبیات کے ایسے ماخذ نکال لیے ہیں کہ اگر وہ ان کی کوشش سے دریافت نہ ہوئے ہوتے تو اب تک ضائع ہو جاتے۔ مگر یادگارِ غالب، غالب نامہ، ذکرِ غالب، غالب از مہر وغیرہ ان سب کتابوں کے مصنفین کا اندازِ تحقیق اور طرزِ استنباط جداگانہ ہے۔ ان میں سے کوئی کتاب نہیں دوسری کتاب سے بے نیاز نہیں کرتی۔ یہ ان تصانیف کی خوبی ہے لیکن اب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یک جلدی سوانح عمریوں سے آگے بڑھ کر غالبؔ پر ایسا کام سامنے آئے جو کئی جلدوں پر پھیلا ہوا ہو اور غالبؔ سے متعلق سارے مباحث کو پوری تفصیلات اور حوالوں کے ساتھ اس میں یکجا کر دیا گیا ہو۔ ایسی جامع کتاب کا ایک خاکہ کچھ اس طرح کا ہو سکتا ہے کہ:

پہلی جلد۔ ۱۷۹۷۔ ۱۸۱۵۔ خاندان، آبا و اجداد، ابتدائی تعلیم و تربیت اور غالبؔ کی آگرے کی زندگی سے متعلق کل مباحث۔ یہ تقریباً ۱۸۱۵ء تک کے واقعات کو محیط ہو۔

دوسری جلد۔ ۱۸۱۵۔ ۱۸۵۰۔ دہلی میں مستقل قیام سے ۱۸۵۰ء تک۔ جس میں مقدمہ پنشن، حادثۂ اسیری وغیرہ سب آجاتے ہیں۔

تیسری جلد۔ ۱۸۵۰۔ ۱۸۵۸۔ اس میں قلعے کی ملازمت، دہلی کی ادبی اور سماجی زندگی اور دوسری جزوی تفصیلات ہوں۔ ان کے علاوہ "غدر" کا حال اور اس کے اثراتِ مابعد۔

چوتھی جلد۔ ۱۸۵۸۔ ۱۸۶۹ء۔ دہلی بعد غدر، معرکہ قاطع برہان، دربار رام پور سے تعلقات وغیرہ۔

پانچویں جلد۔ غالبؔ کی کل تصانیف نظم و نثر فارسی و اردو کا تفصیلی تذکرہ، تنقید

اور حوالے۔

چھٹی جلد۔ غالب کی شاعری کا عہد بہ عہد مطالعہ، اردو شاعری پر اُن کے اثرات وغیرہ۔

ساتویں جلد۔ غالبیات کے تمام لٹریچر کا تنقیدی جائزہ۔

آٹھویں جلد۔ غالب کے اسماء الرجال اور ان کے مصادر نیز ضمیمے کے طور پر جو امور درج کرنا ہوں۔

آج ہمیں یہ منصوبے شیخ چلّی کا پلاؤ معلوم ہوں تو عجب نہیں۔ لیکن اس پر خندہ زنی سے پہلے چند باتیں ذہن میں رکھنا چاہییں۔ ایک تو یہ کہ ابھی تک کوئی ادارہ غالب کے متعلّق تحقیق و تصنیف کا نہیں تھا۔ افراد کی کوششیں وہ نتائج پیش نہیں کر سکتیں جو ایک ادارے سے ممکن ہیں۔ اب جو ایسے ادارے وجود میں آئے ہیں جہاں یہ ساری سہولتیں فراہم ہو سکتی ہیں اور مالیات کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے تو ہمیں عالمی معیار نقد و تحقیق کو نظر میں رکھ کر ایسے ہی کام کرنے چاہییں جو عمومی حالات میں انفرادی طور پر نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم محض دیوانِ غالب کے سستے یا مہنگے ایڈیشن چھاپتے رہے، کتابچے، پمفلٹ یا سوونیر نکالتے رہے، جلسے، مشاعرے، سیمنار اور شامِ غالب وغیرہ کے پروگرام ہی کرتے رہے تو ہم اپنے مقصد سے دور ہوتے جائیں گے۔

دوسری بات یہ کہ آیندہ نسلیں ہماری بہ نسبت عالمی معیارِ تحقیق سے زیادہ مانوس ہوں گی اور اُن کی تشفی ایسے بے ربط اور تشنہ کاموں سے نہیں ہو سکتی، جن سے ہم اب تک سرخرو ہوتے رہے ہیں۔ اور اس معیار پر کام کرنے کے لیے ہمیں زیادہ سائنٹفک ہونا پڑے گا۔ اب (Universal Methods) سامنے رکھ کر ہی ہم بڑے اور اچھے کام کر سکیں گے۔

تیسری بات یہ کہ غالب کہنے کو ایک شاعر ہے مگر اُس کا گہرا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنے والے کا چند صفات سے متّصف ہونا ضروری ہے یعنی اُسے تاریخ کا شعور ہو، فارسی زبان سے عالمانہ واقفیت ہو، اردو شاعری کی روایات اور عہد بہ عہد ارتقا پر نظر ہو، وہ علوم مغربی جن کا نفوذ عہدِ غالب سے شروع ہو چکا تھا ان سے باخبر ہو، لغات پر گہری نظر رکھتا

ہو اور ہند ایرانی شایستگی کے رموز کا شناسا ہو۔ آیندہ نسلوں میں اتنی صفات کے جامع افراد کم ہوں گے اس لیے کہ اُن کا ذہن و مزاج، ضرورتیں اور تقاضے ہم سے مختلف ہوں گے لہٰذا ان امور میں وہ نسل ہمارے عہد کے علما، اور محققین پر انحصار کرے گی یا ان سے روشنی حاصل کرے گی۔ مجھے اُمید نہیں کہ اکیسویں صدی میں قاضی عبدالودود، غلام رسول مہر اور شیخ اکرام جیسے غالب شناس ہوں گے۔ اس کا یہ سبب نہیں کہ میں آیندہ نسلوں سے مایوس ہوں بلکہ ایک تو ان کے پاس غالب کے سوا بھی بہت سے غم ہوں گے۔ دوسرے ان کے اپنے معیار اور اپنی اقدار ہوں گی۔ غالب کو وہ پڑھ تو لیں گے مگر انھیں عربی، فارسی، اردو وغیرہ سے اتنی گہری وابستگی یا مناسبت نہیں ہو گی جو اُس نسل کو ہے جس نے اپنی تعلیم آزادیِ ہند سے پہلے مکمل کر لی تھی اور جس نے اپنے بزرگوں سے انیسویں اور بیسویں صدی کی روایات بھی ورثے میں پائی ہیں، جو غالب کا عہد تھا۔ اس لیے ہمیں اپنی ذمہ داریوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ آج قاضی عبدالودود صاحب کہتے ہیں کہ مولانا حالی اگر ادنیٰ سا اہتمام بھی کرتے تو انھیں سوانحِ غالب کے بہت سے پہلوؤں پر زندہ اشخاص یا دستاویزوں سے استفادہ کرنے کے ہم سے بہتر مواقع حاصل تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ کیا آنے والی نسلیں ہم سے ایسا ہی مطالبہ نہیں کر سکتیں، اگر ہم اپنے وسائل سے کام لینے میں کوتاہی کریں؟

('ایوانِ غالب' نئی دہلی کے پہلے سمینار میں پڑھا گیا)

میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں